ہدیہ بہ بارگاہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

للہ یَرفَعُ بِھٰذَا الکِتَابِ اَقوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ آخَرِینَ (مسلم شریف)

تفسیر ایوبی

جلد سوم

سورۂ بقرہ کے چند رکوعات کی جامع تفسیر

از

رت امام المتکلمین ومحققین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب

دہلوی قدس اللہ سرہٗ

مکتبہ رازی

۱۵۔ شہاب مینشن

محمد بن قاسم روڈ کراچی ۱

(آئیڈیل پیکجر کراچی ۱)

ڈاکٹر منظور احمد
چیئرمین شعبۂ فلسفہ
یونیورسٹی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علّامہ حافظ محمد ایوب متاخرین علماء میں ان چند گنے چنے لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی عظیم عقلی روایت کے امین ہیں۔ اب اس قسم کے لوگ دنیائے اسلام سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی جگہ ایک نئی عقلیت پسندی لے رہی ہے جو اگرچہ بعض جہتوں سے اسلامی فکر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن عام طور پر عصر حاضر کے افادیتی فلسفہ سے متاثر ہے جس کی وجہ سے وہ عقل کے ان معیارات پر پوری نہیں اترتی جو متقدمین نے قائم کئے تھے۔

علّامہ ایوب صاحب صرف متقدمین کے فن کے امین ہی نہ تھے بلکہ اس بارے میں انہوں نے نئی راہیں تلاش کی ہیں اور اکثر جگہ متکلمین سابقہ کے دلائل سے اختلاف کیا ہے۔ تفہیم قرآن میں ان کا یہ رویہ، قرآن کو ایک منظم، مربوط اور کلّی نظام کی حیثیت سے سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فلسفیانہ باریکیوں اور مشکل مضامین کے باوصف حضرت علّامہ میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ اپنے انداز بیان سے اس مشکل کو آسان کر دیا کرتے تھے اور مختلف مضامین ایسی مثالوں سے سمجھاتے تھے جو ہمارے ماحول میں ملتی ہیں اور جن کو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں عقلی طور پر تشفی بخش سمجھتے ہیں یہ کام بڑے جگر کا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ بیان کرنے والے کو نفس مضمون پر کلی عبور حاصل ہو۔

علّامہ کی قرآن کی تفہیم، عالمگیر منطقی کلیات پر مبنی ہے لیکن اپنے دلائل اور طرز تشریح میں وہ کسی مدرسۂ فکر کے پابند نہیں ہیں۔ اکثر مسائل پر نئی دلیلیں نکالی ہیں جن کا پتہ حکمائے متقدمین میں نہیں ملتا۔ بعض مقامات پر منطق کے اصولوں کی گرفت بھی کی ہے اس لئے کہ منطق کے اصول ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے۔ ایسے مواقع پر علّامہ

نے قرآن کی روشنی سے استفادہ کیا ہے اور قرآن کے بیان کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔
اس لئے یہ سمجھنا کہ یہ تفسیریں صرف قرآن کی فلسفیانہ اور منطقی تشریحیں ہیں غلط ہوگا۔
یہ قرآن فہمی کے لئے وہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں جن کے بعد قرآن کے اسرار و رموز نفس
انسانی پر آشکارا ہوتے ہیں۔ میری دانست میں یہ تفسیریں وقت کی اہم ضرورت کو پورا
کرتی ہیں اور بعض افکار باطلہ کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ یہ صرف فلسفیانہ مزاج والوں کیلئے
ہی نہیں بلکہ ہر پڑھے لکھے قاری کے لئے مفید ہیں۔ خصوصًا مجتہدین کے لئے انشراح
کا باعث ہوں گی۔

ڈاکٹر منظور احمد۔
چیرمین شعبہ فلسفہ
یونیورسٹی کراچی

نوٹ

قارئین کرام! یہ تقاریر ٹیپ ریکارڈ سے نقل کی گئی ہیں، ہمیں افسوس
ہے ان میں تسلسل قائم نہ رہ سکا۔ آئندہ کے لئے کوشش کی جارہی ہے۔

والسّلام

ادارہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ
لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ
النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ
هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ
بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (بقرہ۔ ۸ تا ۱۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قولہ جل جلالہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲ : ۸)

ترجمہ۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور روزجزا پر ایمان لے آئے اور فی الحقیقت وہ ایمان نہیں لائے۔

مفسرین کا اجماع ہے کہ اس آیت میں منافقوں کا بیان ہے۔ جس طرح پچھلی آیتوں میں مومنوں اور کافروں کا بیان تھا۔ منافق اس کو کہتے ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ایمان لائے اور دل سے ایمان نہ لائے۔ اب یہاں یہ مضمون سمجھنا چاہیئے کہ دل کی چار حالتیں ہیں۔

(۱) دل کا وہ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق ہے اور دلیل سے حاصل ہوا ہے اس اعتقاد کو علم اور یقین کہتے ہیں۔ (۲) دل کا وہ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق ہو اور دلیل سے حاصل نہ ہو۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔ (۳) دل کا وہ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں۔ (۴) دل کا وہ حال جو ان تینوں قسموں سے خالی ہو اور یہ حالت ظن شک وہم تخیل سب کو شامل ہے۔ اس طرح زبان کی تین حالتیں ہیں۔ اقرار انکار سکوت اور ان تینوں کو پہلے چاروں میں ضرب دیں تو بارہ قسمیں ہو جاتی ہیں۔ یعنی (۱) اقرار اور یقین (۲) اقرار اور تقلید (۳) اقرار اور جہل مرکب (۴) اقرار اور ان تینوں سے خالی (۵) انکار اور یقین (۶) انکار اور تقلید (۷) انکار اور جہل مرکب (۸) انکار اور تینوں سے خالی (۹) سکوت اور یقین (۱۰) سکوت اور تقلید (۱۱) سکوت اور جہل مرکب (۱۲) سکوت اور ان تینوں سے خالی۔ بس یہ بارہ قسمیں ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن وہ ہے جس نے دل سے تصدیق کی اور تصدیق یقین اور تقلید دونوں کو شامل ہے اور اس تصدیق کے ساتھ بے وجہ زبان سے انکار نہیں کیا۔ اور ظاہر میں مومن وہ ہے جس نے زبان سے اقرار کیا اور منافق وہ ہے جس نے دل سے انکار کیا اور زبان سے اقرار کیا باقی

ہر صورت میں کافر ہے۔ جس شخص نے دل سے اقرار کیا اور زبان سے انکار کیا اور زبان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو یہ شخص بھی کافر ہے اور تقلیدی ایمان معتبر ہے۔ اسی طرح جس طرح دلیل سے ایمان لایا ہو۔ اب یہ بحث ہے کہ کافر کا کفر زیادہ قبیح ہے یا منافق کا کفر زیادہ قبیح ہے۔

ایک جماعت نے یہ کہا کہ کافر کا کفر زیادہ قبیح ہے کیونکہ کافر دل اور زبان دونوں سے انکار کرتا ہے اور منافق صرف دل سے انکار کرتا ہے اور زبان سے اقرار کرتا ہے دوسری جماعت نے یہ کہا ہے کہ منافق کی زبان بھی جھوٹی ہے کیونکہ وہ اعتقاد کے خلاف خبر دیتا ہے میں کہتا ہوں کہ اعتقاد کے خلاف خبر دینا واقعہ کے خلاف خبر دینے کی مثل نہیں ہے۔ واقعہ کے تو مطابق خبر دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ہم شہادت دیتے ہیں کہ بیشک تو اللہ کا رسولؐ ہے اور یہ واقعہ کے مطابق ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی کہ یہ جھوٹے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون-۱) اور اللہ شاہد ہے کہ بیشک منافق جھوٹے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعتقاد کے مخالف خبر جھوٹ ہے یعنی کذب خلاف اعتقاد کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ ان کے صدق کو کذب کہدے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی شہادت کو تسلیم نہیں کرتا جس طرح فرعون کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا اور جس طرح رویت عذاب کے وقت کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا اور جس طرح روز جزا صدق المرسلون کہنے والوں کی تصدیق کو تسلیم نہیں کیا بالکل اسی طرح منافقوں کی شہادت کو یہاں تسلیم نہیں کیا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اعتقاد کے خلاف شہادت کذب ہے کیونکہ اگر خلاف اعتقاد کا نام کذب ہوگا تو مطابق اعتقاد کا نام صدق ہوگا۔ اور جس وقت اصلی کافر اپنے اعتقاد سے حکایت کریگا اور یہ کہے گا کہ تو اللہ کا رسول نہیں ہے اور یہی اصلی کافر کا عقیدہ ہے تو اس وقت ہر کافر صادق ہو جائے گا کیونکہ وہ اس وقت اپنے اعتقاد کے مطابق خبر دے رہا ہے۔ نیز اعتقاد

کی مطابقت اور عدم مطابقت صدق اور کذب اس وقت ہوگی کہ جب اعتقاد محکی عنہ ہو اور اعتقاد مرتبہ اعتقاد میں محکی عنہ نہیں ہے، بلکہ مرتبہ اعتقاد میں حکایت ذہنی ہے اگرچہ حکایت لسانی نہیں ہے۔ لہذا اعتقاد بحیثیت اعتقاد محکی عنہ اور واقع نہیں ہے بلکہ حکایت ذہنی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اعتقاد کی مطابقت اور عدم مطابقت کا نام صدق وکذب نہیں ہے۔ جیسا کہ روسائے اعتزال کا عقیدہ ہے بلکہ واقع کی مطابقت اور عدم مطابقت کا نام صدق وکذب ہے اور جس جگہ اعتقاد کی مطابقت اور عدم مطابقت صدق وکذب ہوتی ہے اس جگہ وہ اعتقاد ہی واقع کہلاتا ہے اور مخبر عنہ اور محکی عنہ کہلاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ زید میرے خیال اور میرے گمان میں کھڑا ہوا ہے اور واقع میں زید بیٹھا ہوا ہے تو جب قائل نے میرے گمان کا لفظ کہا تو اس وقت یہ گمان جو درحقیقت اس کا باطل عقیدہ ہے۔ اس گمان سے حکایت اس قائل نے کی ہے تو اس وقت یہ گمان جو درحقیقت ایک باطل عقیدہ ہے، یہ عقیدہ اور یہ اعتقاد مخبر عنہ محکی عنہ اور واقع بن گیا لہذا یہ اپنے گمان میں تو جھوٹا ہے لیکن اس جھوٹے گمان سے حکایت کرنے میں سچا ہے تو درحقیقت یہ اعتقاد و گمان خیال واقع کے اعتبار سے اعتقاد ہے اور لسانی خبر کے اعتبار سے محکی عنہ اور واقع ہے غور کر غور کا مقام ہے اب اگر تو کہے کہ اللہ عزوجل کے قول ان المنافقین لکاذبون یعنی منافق جھوٹے ہیں اس قول کے کیا معنی ہیں جبکہ اعتقاد کے خلاف انك لرسول اللہ یعنی بے شک تو اللہ کا رسول ہے یہ انہوں نے کہا اور ظاہر ہے کہ یہ ان کے اعتقاد کے خلاف ہے تو اللہ تعالٰی کے قول سے جھوٹ کے معنی اعتقاد کے خلاف ہی کے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور تم نے اوپر بیان کیا کہ جھوٹ اعتقاد کے خلاف کا نام نہیں بلکہ واقع کے خلاف کا نام ہے تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالٰی نے جو منافقوں کو کاذب کہا ہے یہ کذب منافقوں کا وہ اعتقاد ہے جو واقع کے خلاف ہے۔ یعنی منافق کا یہ اعتقاد ہے کہ تو اللہ کا رسول نہیں ہے تو منافق

کے اس اعتقاد کو اللہ تعالیٰ نے جھوٹا بتایا ہے اب اگر تو یہ کہے کہ مشتق پر مشتق کا صادق ہونا
مبدہ پر مبدہ کے صادق ہونے کو مستلزم ہے یعنی کاذب کا منافق پر صادق ہونا کذب کے
نفاق پر صادق ہونے کو مستلزم ہے اور نفاق نام ہی خلاف اعتقاد کا ہے تو اس وقت
قطعاً کذب خلاف اعتقاد ہی کا نام ہوا میں کہوں گا اس کا حل یہ ہے کہ مشتق مشتق پر
صادق نہیں ہے یعنی کاذب منافق پر صادق نہیں ہے بلکہ منافق کے مصداق پر صادق
ہے یعنی جو لوگ نفاق کے مشتق یعنی منافق کے ساتھ موصوف ہیں وہ کاذب ہیں یعنی ایک
ذات کی دو صفتیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک شے دو متغائر صفتوں کے ساتھ موصوف ہو
کیا تو نہیں جانتا کہ رحمان قہار ہے لیکن رحمت قہر نہیں ہے۔ نافع ضار ہے لیکن نفع ضرر
نہیں ہے۔ رزاق جبار ہے لیکن رزق جبر نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مختلف صفات کے
ساتھ موصوف ہے۔ تو جس طرح ایک صفت یہاں دوسری صفت پر صادق ہے لیکن اس
صفت کا مصدر اور مبدہ دوسری صفت کے مصدر اور مبدہ پر صادق نہیں ہے۔ اسی
طرح ذات منافق، منافق اور کاذب کے ساتھ موصوف ہے اور ایک صفت پر دوسری
صفت صادق ہے لیکن اس صفت کا مصدر یعنی کذب دوسری صفت کے مصدر یعنی نفاق
پر صادق نہیں ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ مختلف آثار مختلف اشیاء کے ہوتے ہیں جیسے ٹھنڈک
برف کا اثر ہے گرمی آگ کا اثر ہے تو بحکم عکس نقیض واحد شے کا واحد اثر ہو تو پھر کیونکر
اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک سے مختلف آثار صادر ہو سکتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ یہ فلسفی نظر
ہے کہ واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے اور یہ نظر یہ یہاں بالکل غلط ہے۔ اس لئے
واحد سے واحد کا صدور موثر اضطراری میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن فاعل بالاختیار اور خاص
قادر مطلق میں یہ متصوّر نہیں ہے کیونکہ قدرت و اختیار کو فعل اور ترک فعل دونوں طرف
نسبت برابر ہوتی ہے۔ اس لئے با اختیار قوت کے افعال کو تعدد اور اختلاف لازم ہے
اختیار اضطرار سے بدل جائے گا۔ لہذا اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور فاعل بالاختیار ہونے

وجہ سے متحد اور مختلف اشیاء میں تاثیر کرتا ہے۔ غور کرو۔

اب یہاں یہ بات غور کرلی چاہیئے کہ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ صدق وکذب مطابقت اعتقاد اور عدم مطابقت اعتقاد کا نام ہے یا مطابقت واقع اور عدم مطابقت واقع کا نام ہے۔ جمہور علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ مطابقت واقع اور عدم مطابقت واقع کا نام ہے اوپر ہم نے یہ ثابت کردیا کہ صدق وکذب مطابقت واقع اور عدم مطابقت واقع کا نام ہے۔ کیونکہ عدم مطابقت اعتقاد کا نام اگر کذب ہوگا تو اعتقاد کبھی واقع کے خلاف ہوتا ہے۔ اب اگر واقع کے خلاف سے عدم مطابقت ہوگی تو گویا واقع سے مطابقت ہوگی کیونکہ خلاف کا خلاف مطابق ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ کذب واقع میں گویا صدق ہوجائے گا۔ لہذا کذب عدم مطابقت واقع ہی کا نام ہے اور اس پر اجماع عالم ہے لیکن اللہ تعالےٰ کو حق ہے کہ وہ مطابقت واقع کا نام کذب رکھدے جیسا کہ فرمایا لولا جاؤ علیہ باربعۃ شہداء فاذلم یاتوبالشہداء فاؤلئك عنداللہ ھم الکاذبون وہ کیوں نہیں چار گواہ لائے پھر جبکہ وہ چار گواہ نہ لاسکے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کاذب اور جھوٹے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے زنا کے تین شاہدوں کو کاذب فرمایا اور ممکن ہے کہ یہ تینوں واقع میں صادق ہوں کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ چار صادق ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ تین صادق ہوں اور چار کاذب ہوں لہذا اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ کسی کا نام کاذب رکھدے بغیر اس کے کہ اس کی حکایت خلاف واقع ہو بالکل اسی طرح اس نے منافق کا نام کاذب رکھدیا۔ غور کرنا۔

منافق کے کافر سے بدتر ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ منافق دھوکا دینے کا قصد کرتا ہے اور کافر دھوکا دینے کا قصد نہیں کرتا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ منافق مثل ہیجڑے کے ہے اور کافر مثل مرد کے ہے اور ہیجڑا مرد سے بدتر ہے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ کافر کذب کو پسند نہیں کرتا اور منافق کذب کو پسند کرتا ہے۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ منافق استہزا کرتا اور کافر استہزا نہیں کرتا۔ چھٹی دلیل یہ ہے کہ کافر کا ذکر کئی روایتوں میں ہے اور منافق کا

ذکر ۱۳ آیتوں میں ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ منافق کافر سے زیادہ مجرم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ منافق ایمان میں دھوکا دیتا ہے۔ کافر دوسرے امور میں دھوکا دیتا ہے اور جس طرح منافق کذب کو پسند کرتا ہے۔ مشرک کافر بھی کذب کو پسند کرتا ہے۔ انظر کیف کذبوا علیٰ انفسہم (الانعام - ۲۴) دیکھ تو سہی کیا اپنی جانوں پر جھوٹ ڈھا رہے ہیں۔ جس طرح منافق استہزا کرتا ہے کافر بھی استہزا کرتا ہے۔ فالیوم الذین امنوا من الکفار یضحکون (مطففین - ۳۴)۔ آج مومن بھی کافروں سے ٹھٹھا کریں گے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کافر دنیا میں مومنوں سے ٹھٹھا کرتے تھے انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ (نساء - ۱۵۷) عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو ہم نے قتل کر دیا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ٹھٹھے سے اور استہزا سے کہا ہے اور منافق بظاہر مومن ہے۔ وہ قتل نہیں کیا جاسکتا اور کثرت آیات جرم کی زیادتی کی دلیل نہیں ہے جس طرح کثرت آیات فضیلت کی زیادتی کی دلیل نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے زیادہ آیات میں آیا ہے اور کافر کو مرد سے اور منافق کو ہیجڑے سے تشبیہ دینی صحیح نہیں کیونکہ اس وقت مومن کو عورت سے تشبیہ دی جائے گی۔ الغرض یہ دلائل لچر ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ ابوجہل اور ابولہب اور تمام موذیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً کافر تھے منافق نہ تھے اور ان منافقوں سے قطعی بدتر تھے۔ فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا او قال اوحی الی (انعام - ۹۳) سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا گھڑے اور جھوٹی نبوۃ کا دعویٰ کرے اور ظاہر ہے کہ جھوٹا مدعی نبوۃ اور مدعی الوہیت کافر ہے۔ منافق نہیں ہے۔ اسی طرح لعین اول کافر ہے منافق نہیں۔ منافق تھوڑا سا تو اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ لا یذکرون اللہ الا قلیلا (نساء - ۱۴۲)۔ اور کافر تھوڑا سا بھی ذکر نہیں کرتا۔ اب اگر تو یہ کہے کہ لا الیٰ ھؤلاء ولا الیٰ ھؤلاء (نساء - ۱۴۳) یعنی منافق نہ ادھر ہیں نہ ادھر۔ وکلا نمد ھؤلاء وھؤلاء (اسراء - ۲۰) اور ہم ادھر اور ادھر دونوں طرف مدد کرتے ہیں تو منافق امداد الٰہی سے محروم ہو گیا اور کافر سے بدتر ہو گیا۔ تو میں کہوں گا جب کفر قلبی اور لسانی

دونوں مل کر مانع امداد الٰہی نہیں ہیں تو تنہا کفر قلبی کیونکر مانع ہوسکتا ہے۔ لہٰذا منافق کفر قلبی کی وجہ سے ایک ھٰؤلاء اور ایمان لسانی کی وجہ سے دوسرے ھٰؤلاء میں شامل ہوکر مستحق امداد الٰہی ہو گئے۔ جاننا چاہیئے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے کفر پر نفاق کو زیادت حاصل نہیں ہے۔ جن کفار نے الوہیت کا دعویٰ کیا، نبوۃ کا دعویٰ کیا انبیاء کو شہید کیا انبیاء کو ایذا دی انبیاء کی بے ادبی کی بظاہر یہ منافق سے بدتر ہیں لیکن یہ آیت ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النّار بے شک منافق جہنم کے نیچے کے درجے میں ہو گئے (نساء۔ ۱۴۵) یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ منافق کافر سے بدتر ہے واللہ اعلم مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا اور زبان سے اقرار کر رہا ہے وہ مومن نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وماھم بمومنین اور وہ مومن نہیں ہیں" (بقرہ ۸) میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز جزا پر اور وہ مومن نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جن لوگوں کو اللہ کی معرفت نہیں ہے اور وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ وہ مومن نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل سے ایمان نہیں لائے اور زبان سے لائے وہ مومن نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں جو لوگ دل سے تکذیب کرتے ہیں اور زبان سے تصدیق کرتے ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ لیکن جو لوگ نہ دل سے تکذیب کرتے ہیں اور نہ تصدیق کرتے ہیں اور زبان سے اقرار کرتے ہیں ان کی بابت اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں بلکہ ان کا مومن ہونا اور نہ ہونا محل غور ہے اور منافق وہ ہے جو دل سے تکذیب کرے اور زبان سے تصدیق کرے۔ منافق جب کفار سے ملتے ہیں تو ان سے علیحدگی میں کہتے ہیں اِنَّا مَعَکُمْ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جن کے ساتھ یہ منافق ہیں وہ دل سے تکذیب کرتے ہیں۔ تو دل سے تکذیب اور زبان سے تصدیق کرنے والے کی بابت فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں خالی الذہن اور مصدق اللسان کی بابت نہیں

فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بہت سے لوگوں کو دعوت اور تبلیغ نہیں پہنچی اور وہ اللہ تعالیٰ کو جانتے ہی نہیں۔ اس کے باوجود وہ معذب نہیں ہیں۔ وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا یعنی بعثت رسول سے قبل ہم عذاب نہیں کرتے اور جبکہ (اسراء - ۱۵) یہ معذب نہیں ہیں اور کافر معذب ہیں تو یہ کافر نہ ہوئے اور اس مقام پر جن کو کہا گیا ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں وہ قطعی کافر ہیں لہذا جن لوگوں نے دل سے تصدیق نہیں کی اور تکذیب بھی نہیں کی اس کی بابت اس آیت کی رو سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کافر ہیں۔ ہاں بیشک ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار منافق جہنم کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے اس منافق کا کفر اصل کافر کے کفر سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

جاننا چاہیئے کہ متکلمین میں سے بعض نے کہا ہے کہ سب مکلف اور مامور اللہ کو جانتے ہیں اور جو اللہ کو نہیں جانتا وہ مکلف نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مکلف اللہ کو جان لے تو تکلیف دینے سے پھر کیا فائدہ کیونکہ اصل مقصود تکلیف سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی معرفت ہے اگر تو کہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہی نہیں اسے کیسے اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے مطلع کیا جا سکتا ہے۔ لہذا معرفت تکلیف سے مقدم ہے میں کہتا ہوں کہ عبادات اور معاملات میں امر و نہی بیشک بغیر معرفت الٰہی نہیں ہو سکتی لیکن معرفت کی تکلیف بغیر معرفت کے ہو گی ورنہ حاصل کی تحصیل لازم آئے گی یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا پہلے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کرائی جائے گی پھر اعمال کی اس کو تکلیف دی جائے گی۔ اب اگر تو یہ کہے کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور کسی کے لئے نہ جاننے میں کوئی عذر نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اہم ترین مقصد ہے اور اوامر و نواہی کی معرفت اتنی اہم نہیں ہے اور اس صورت میں مقصد بعثت کمزور ہو جائے گی۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰہِ شَكٌّ ان کے (ابراہیم - ۱۰) رسولوں نے کہا کہ کیا اللہ بھی ایسی چیز ہے کہ اس کے بارے میں شک ہو۔ اس آیت سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود میں کسی کو شک نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر شخص یقیناً جانتا ہے تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حق ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کا وجود ناقابل شک ہے اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے پاس ہی اس نے ناقابل شک ہونے کی دلیل فرمائی اور وہ فاطر السمٰوات وَالارض ہے یعنی اللہ میں کیسے شک ہو سکتا ہے جبکہ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور آسمان اور زمین کا مخلوق ہونا دلیل ظاہر ہے خالق ارض وسمار پر اور یہ دلیل اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے بیان کی حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود میں اس وقت تک شک نہیں ہو سکتا کہ جب اس کے وجود پر اللہ تعالیٰ کے رسول دلیل لے آئیں اور رسول کے دلیل بیان کرنے سے قبل قطعی ان لوگوں کو شک تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود نہ تو بداھتًا معلوم ہے اور نہ تنہا انسانی نظر کا نتیجہ ہے بلکہ رسل اللہ کے اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلیل لائیں گے اس کے بعد کوئی شک نہیں رہے گا یعنی دلیل تو عقلی ہوگی مگر نقل رسول پر موقوف ہوگی محض عقل سے بغیر رسول کے بتائے اللہ کو نہیں جان سکتا۔ اور ممکن ہے کہ آیت شریفہ کے معنی یہ ہوں کہ واقع میں شک نہیں ہے نہ یہ کہ کسی شک کرنے والے کو شک نہیں ہے اس کے علاوہ اگر ہر مکلف کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوگی تو منافق کو بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوگی اور اس معرفت قلبی کے ساتھ جب وہ اقرار کرے گا تو یہ معرفت قلبی اور اقرار مل کر قطعی ایمان ہو جائے گا اور منافق مومن ہو جائے گا حالانکہ وماھم بمومنین اور وہ مومن نہیں ہیں اور جب وہ مومن نہیں ہیں تو قطعی ان کو معرفت نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ مکلف کو معرفت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قول من الناس میں الناس کی اصل اناس ہے ہمزہ حذف کر دی گئی ہے۔ اور لام تعریف داخل کر دیا گیا ہے اور یہ اسم جمع ہے۔ انسانوں کی جماعت کا نام ہے۔ انسان کے اشتقاق میں علماء نے کئی وجہیں بیان کی ہیں پہلی وجہ

یہ ہے کہ انسان کو انسان اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے عہد کیا گیا اور وہ بھول گیا دوسری وجہ یہ بیان کی ہے انسان کو اپنے جیسے سے انس ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ انسان کو انسان اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دکھائی دیتا ہے جاننا چاہیئے کہ اگر بھولنا انسانیت کا سبب ہوگا تو جو نہیں بھولے گا وہ انسان نہیں ہوگا اور اگر انسان کا اپنے ہم جنسوں سے انس کرنا سبب انسانیت ہوگا تو ہر نوع کے جملہ افراد انسان ہو جائینگے کیونکہ ہر نوع کا ہر فرد دوسرے فرد سے انس کرتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بکری بکری کے ریوڑ میں شامل ہونا پسند کرتی ہے بھیڑ کے ریوڑ میں نہیں شامل ہوتی اور دکھائی دینا انسانیت ہے تو جملہ حیوانات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مانا کہ جن نہیں دکھائی دیتا لیکن جن کے علاوہ کثیر مخلوقات دکھائی دیتی ہیں۔ الغرض ان وجوہ کی بنا پر انسان کو انسان کہنا متصوّر نہیں ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ ہر لفظ کے لئے مشتق ہونا ضروری نہیں ہے ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔ نیز مصدر اور جامد کوئی لفظ نہیں رہے گا۔ غور کر مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے منافقوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جاننا چاہیئے کہ لفظ من واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے۔ کیونکہ لفظ من لفظ واحد ہے اور معنی جمع ہے۔ اگر واحد کی ضمیر لائی جائے تو لفظ کی طرف پھرتی ہے اور جمع کی ضمیر لائی جائے تو معنی کی طرف پھرتی ہے۔ اور اس آیت میں دونوں باتیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول یقول واحد ہے اور آمنا جمع ہے اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے منافقوں کا اللہ تعالیٰ پر اور پچھلے دن پر ایمان تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیوں کہا کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب اکابر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہود چونکہ اللہ تعالیٰ کو جسم کہتے ہیں اور عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر مومن قرار دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر یہودی اللہ تعالیٰ کو جسم نہیں کہتا اور نہ ہر یہودی عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتا ہے اور نہ ہر عیسائی مسیح علیہ السلام

کو معبود کہتا ہے اور نہ یہودی اور عیسائی دونوں روز جزا کے منکر ہیں۔ لہذا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ حق جواب یہ ہے کہ وہ اللہ پر اور روز جزا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے ایمان نہیں لائے بلکہ اپنے پرانے عقیدے کی بناء پر ایمان لائے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں کیونکہ دل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ پر اور روز جزاء پر ایمان نہیں لائے اور اصل ایمان یہ تھا کہ وہ ایمان اس طرح لاتے جس طرح ہم ایمان لائے ہیں جیسا کہ فرمایا فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا پھر اگر وہ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو ہدایت یافتہ ہو گئے (بقرۃ-۱۳۷)۔ مطلب یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے اگر ایمان اللہ پر اور روز جزاء پر لائے گا تب تو مومن کہلانے کا مستحق ہوگا ورنہ نہیں۔ فرمایا فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ خدا شاہد ہے کہ یہ سب بے ایمان ہیں جب تک تجھکو حکم نہ بنالیں۔ (نساء-۶۵) اور ان منافقوں نے دل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم نہیں بنایا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بے ایمان قرار دیا۔

سوال پچھلے دن اور یوم آخر سے کیا مراد ہے مفسرین نے فرمایا کہ پچھلے دن سے ابد الاباد بھی مراد ہے اور وہ دن بھی مراد ہے جس دن قبروں میں سے مردے اٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ وقت کی دو قسمیں ہیں ایک وقت عمل اور دوسرا وقت جزائے عمل اور عمل جزا پر حسًا مقدم ہے اور جزا حسًا موخر ہے اس لئے جزا عمل کی علت غایۃ ہے اور علت غائیہ کا تحقق عمل کے بعد ہوتا ہے اور اگر مقدم ہو جائے تو پھر عمل کی ضرورت نہیں رہتی لہذا وقت جزا مؤخر اور وقت عمل مقدم ہے لہذا یوم حیات یوم عمل ہے جو پہلا یوم ہے اور یوم جزا یوم آخر ہے اس لئے یوم آخر سے مراد یوم جزا ہے۔ اللہ پاک کا فرمان ہے

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ

اللہ تعالیٰ اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ (درحقیقت) اپنے ہی تئیں دھوکہ دیتے ہیں اور انہیں اس بات کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دِلوں میں روگ ہے اور اللہ نے ان کے روگ کو اور بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یخادعون مُخادعت سے ہے اور مخادعت کے معنی دھوکہ دینا۔ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کے کیا معنی ہیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں ہے پھر اس کو کس طرح دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کو دھوکہ دینا محال ہے اور ناممکن ہے پھر اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے کیا معنی ہیں۔ نیز منافقوں کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس رسول بھیجا ہے تو نفاق سے ان کی یہ غرض نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا محال ہے پھر آیت کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دیتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دینا اللہ تعالیٰ ہی کو دھوکا دینا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنا اللہ تعالیٰ ہی سے بیعت کرنا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کرنا ہے اب اگر تو کہے کہ جب رسولؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو پھر کیا وجہ ہے جو رسولؐ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں رسولؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اگر اللہ تعالیٰ نہ کہتا تو رسولؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ ہوتی اسی طرح اگر رسولؐ کی عبادت کو اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کہدیتا تو رسولؐ کی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا اس لئے رسولؐ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ کہدیا کہ

کعبہ کی طرف سجدہ کرنا میری ہی طرف سجدہ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ یہ کہہ دیتا کہ نبیؐ کی طرف سجدہ کرنا میری ہی طرف سجدہ کرنا ہے تو بیشک نبیؐ کی عبادت خدا تعالیٰ کی عبادت ہو جاتی لیکن نہیں کہا اس لئے نبی کی عبادت خدا کی عبادت نہیں ہے جاننا چاہیئے کہ نبیؐ کے بعض افعال کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا لیکن ہر فعل کو اپنا فعل قرار نہیں دیا جیسے کھانا پینا سونا جاگنا۔ نبیؐ کے ان افعال کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل نہیں کہا اور جن افعال کو اپنا فعل کہا جیسے مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (انفال۔۱۷) یہاں نبیؐ کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا اور دیگر تمام معجزات میں نبیؐ کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا اسی طرح نبیؐ کے کہنے کو اپنا کہنا قرار دیا اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبیؐ کا ہر فعل خدا تعالیٰ کا فعل ہے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ نبیؐ کے لئے کوئی فعل کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرنا ہے تاکہ نبیؐ کے لئے عبادت کرنا اور نبیؐ کو سجدہ کرنا اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنا ہو جائے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی فعل کسی کے لئے کیا جائے تو یہ فعل دوسرے کے لئے اس وقت ہو سکتا ہے (کہ جب دوسرا پہلے کے لئے پسند کرے یا ناپسند کرے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کے بیٹے کے لئے کوئی ایسا فعل کرے کہ جس سے اس کا بیٹا خوش ہو تو یہ فعل باپ کے لئے ہو سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیٹے کی خوشی باپ کی خوشی ہے اور بیٹے کی تکلیف باپ کی تکلیف ہے۔)

کہ جب یہ فعل دوسرے کے لئے مختص نہ ہو اور اگر یہ فعل دوسرے کے ساتھ مختص ہو تو یہ فعل پہلے کے لئے روا نہیں ہوگا اور چونکہ عبادت باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اس لئے دوسرے کے لئے وہ ہو ہی نہیں سکتی۔ جاننا چاہیئے کہ منافقوں کی اس دھوکہ سے غرض یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین منافقوں کی بھی اسی طرح تعظیم اور تکریم کریں جس طرح اور مسلمانوں کی کی جاتی ہے اور نیز مسلمانوں کا راز معلوم کر کے کفار کو مطلع کر دیں اور نیز اپنے اوپر سے قتل وغیرہ کو دفع کریں اور نیز لوٹ کے مال میں سے اپنے لئے حصہ بٹوائیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دھوکا دینے کو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں مطلع کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا وہاں مطلع کر دیا نبأنا اللہ من اخبارکم تمہارے حالات پر اللہ تعالیٰ نے ہم کو مطلع کر دیا (توبہ ۔ ع ۹) میں کہتا ہوں کہ اگر ہر حال کو مطلع کر دیتا تو ہر شخص ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا، مختار نہ رہتا اور تکلیف ساقط ہو جاتی اب اگر یہ کہا جائے کہ یخادعون باب مفاعلۃ سے ہے اور باب مفاعلۃ مشارکت کے لئے ہے یعنی منافق اللہ اور مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں اور اللہ اور مومن منافقوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ دھوکا صرف ایک ہی طرف سے ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یخادعون چونکہ مشارکت کے لئے ہے اور مشارکت میں مبالغہ ہے اس لئے یخادعون کے معنی یخدعون کے ہیں مع مبالغہ کے یعنی منافق اللہ اور مومنوں کو خوب دھوکا دیتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر یخادعون مشارکت ہی کے لئے ہے تب تو معنی یہ ہونگے کہ وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے جیسا کہ فرمایا ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم بے شک منافق اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے (پ ۵ ۔ ع ۱۲) اور اگر یخادعون کو مشارکت لازم نہیں ہے بلکہ اکثری ہے تو یخادعون یخدعون کے معنی میں ہے ۔ وما یخدعون الا انفسھم اور وہ اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے دھوکا دینے کی سزا دے گا یا ان کے دھوکے کا ضرر ان ہی کی طرف پھیر دیگا اپنے نفس کو اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کے یہ معنی ہیں جاننا چاہیئے کہ نفس شے کی ذات اور اس کی حقیقت کو کہتے ہیں یعنی وہ اپنے نفسوں یعنی اپنی ذاتوں کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کا دھوکا دینا ان کی ذاتوں سے متجاوز نہیں ہے۔ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اور ان کو شعور نہیں ہے جس سے جو علم حاصل ہو وہ شعور کہلاتا ہے یعنی منافقوں کو ان کی اس دھوکا دہی کے ضرر کا لاحق ہونا محسوس کی مثل ہے لیکن منافق اپنی غفلت کی وجہ سے اس

چیز کے مثل ہو گئے جو کسی محسوس کا احساس نہیں کر سکتی۔ فی قلوبہم مرض ان کے دلوں میں بیماری اور روگ ہے۔ مرض اس صفت کا نام ہے کہ جس کی وجہ سے موصوف کے فعل اور اثر میں خرابی آجائے اور دل کے افعال اللہ تعالیٰ کی طاعت اور معرفت اور عبودیت ہیں تو دل میں مرض ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور طاعت اور عبودیت میں خلل اور خرابی آجائے۔ فزادھم اللہ مرضا اللہ تعالیٰ نے انکے روگ اور بیماری کو بڑھا دیا۔ اہلِ سنت اور اہلِ جبر نے کہا ہے کہ زیادت اور مزید علیہ یعنی جن پر زیادتی کی گئی ہے دونوں ایک جنس کے ہوتے ہیں اور یہاں مرض سے مراد کفر ہے یعنی ان کے دلوں میں کفر ہے تو کفر پر کفر ہی بڑھے گا اور یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کفر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے معتزلہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہ نہیں مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کفر پیدا کر دیا کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی تو کافر کہتے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی نے کفر پیدا کر دیا تو ایمان لانے کی تکلیف تم کیوں ہم کو دیتے ہو اور نیز ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی مذمّت بیان کی ہے اگر خود ہی کفر ان میں پیدا کرتا تو پھر مذمّت کے کیا معنی تھے اور نیز جس طرح ان میں لمبائی چوڑائی پیدا کر دی اسی طرح اگر کفر پیدا کر دیا ہوتا تو پھر ان کا کیا قصور تھا جو ان کو دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا اور نیز دردناک عذاب کی وجہ بیان فرمائی بما کانوا یکذبون ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے یعنی کذب ونفاق کو ان کی طرف منسوب کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کفر نہیں پیدا کیا معتزلہ نے کہا کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو انہوں نے بڑھتے ہوئے دیکھا تو جل گئے اور غم میں مبتلا ہو گئے کیونکہ مرض کے معنی غم کے آتے ہیں۔ دوسری تاویل معتزلہ نے یہ کی ہے کہ امر ونہی کے زیادہ ہونے سے منافقوں کا کفر زیادہ ہوتا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فزادھم اللہ مرضا اللہ تعالیٰ نے انکی

بیماری بڑھادی جیساکہ فرمایا فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ (توبہ - ۱۲۵) اس سورت نے انکی
نجاست پر اور نجاست بڑھادی حالانکہ اس سورت نے ان کی نجاست نہیں بڑھائی
بلکہ سورت کے نازل ہونے کے وقت انہوں نے کفر کیا اس وجہ سے سورت کی طرف
نجاست منسوب کردی اسی طرح امر ونہی کے زیادہ ہونے کے وقت انہوں نے کفر کیا
اسی طرح یہ آیت ہے فلم یزدھم دعائی (نوح - ۶) الا فرارا میرے بلانے نے انکی نفرت
بڑھادی حالانکہ حضرت نوح کے بلانے نے ان کی نفرت نہیں بڑھائی بلکہ بلانے کے وقت
خود انہوں نے اپنی نفرت بڑھائی اس لئے اس وقت نفرت بلانے کی طرف منسوب کی گئی
اور اس قسم کی متعدد تاویلیں معتزلہ نے کی ہیں اور یہ سب رکیک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے قول عَذَابٌ اَلِیْمٌ کے معنی دردمند کے ہیں یعنی جس کو درد ہو اسکو
الیم کہتے ہیں اور عذاب ایسی چیز نہیں ہے کہ عذاب کو درد ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مبالغہ کے
لئے مجازاً عذاب کو الیم کہا یعنی ان کے لئے دردناک عذاب ہے اللہ تعالیٰ کا قول بما کانوا
یَکْذِبُوْنَ یعنی ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔ اس سے
صاف ظاہر ہے کہ منافقوں کے عذاب کا سبب جھوٹ اور کذب ہے اس سے یہ لازم
آیا کہ ہر جھوٹ حرام ہے اور حدیث شریف میں جو یہ آیا ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ نے تین
جھوٹ بولے اس کا جواب اہل علم نے یہ دیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ تعریض ہے
تعریض کے یہ معنی ہیں کہ متکلم لفظ کے بعید معنی مراد لے اور مخاطب اس کے قریب
معنی سمجھے چونکہ تعریض کی صورت کذب اور جھوٹ کی سی ہے اس سبب سے اسے جھوٹ
اور کذب کہدیا۔ میں کہتا ہوں کہ جھوٹ مذموم وہ ہے کہ جس کی خدا تعالیٰ مذمت کرے
جھوٹ حرام وہ ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ حرام قرار دے اسی طرح سچ اور صدق وہ ہے
کہ جس کو اللہ تعالیٰ سچ اور صدق قرار دے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ کافر جب اپنی خواب گاہ
سے روز جزا اٹھیں گے تو کہیں گے هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (یس - ۵۲) یہ

دن ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسول سچ کہتے تھے یہ بات کافروں کی روز جزا ر قطعی صحیح ہے اور صادق ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ آج سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا حالانکہ یہ سچے سب کے سب جہنم میں داخل ہونگے (مائدہ = ۱۱۹) اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ سچ وہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ سچ کہدے اور جھوٹ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ جھوٹ کہدے حاصل یہ ہے کہ جھوٹ برا اس وقت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو برا کہدے اگر جھوٹ کو اللہ تعالیٰ برا نہ کہے تو وہ برا نہیں ہے۔ مثلاً نبی کی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنا۔ فرض ہے اور حسن ہے اور اس وقت سچ بولنا حرام اور کفر اور قبیح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ وہ جھوٹ برے تھے اللہ تبارک تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ (یوسف ۷۰) اپنے بھائی کے کجاوہ میں پانی کا برتن رکھدیا یہ فعل بظاہر جھوٹ سے بھی زیادہ قبیح ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو برا نہیں کہا بلکہ اس کو سراہا اور فرمایا کذالك کدنا لیوسف یوسفؑ کو یہ حیلہ ہم نے سکھایا تھا (یوسف ۷۶) اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جھوٹ حرام اور قبیح اور برا جب ہی ہے جب اللہ تعالیٰ اس کو برا کہے واللہ اعلم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں بد امنی اور فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرتے ہیں خوب سمجھ لو کہ یہی مفسد ہیں ولیکن انکو پتہ نہیں ہے۔ جاننا چاہیئے کہ کہنے والا یا اللہ تعالیٰ ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا وہ مومن ہیں جو منافقوں سے بالمشافہ گفتگو کرتے ہیں۔ کسی چیز کے بگڑ جانے اور نکمے اور بیکار ہو جانے کو فساد کہتے ہیں زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔

علماء کے تین قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ فساد سے مراد اللہ تعالیٰ کی معصیت

اور نافرمانی ہے اور اس کی تقریر یہ بیان کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور شرائع کی پابندی کی جائے گی تو سرکشی اور ظلم و تعدی جاتی رہے گی اور ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول اور مصروف ہو جائے گا اور خون ریزی بند ہو جائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فساد سے مراد منافقوں کا کافروں سے میل جول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ فساد سے مراد یہ ہے کہ منافق کئی لوگوں کو خفیہ طور پر شبہوں میں مبتلا کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے منافق کو مفسد کہا اور جب منافق مفسد ہوا تو نفاق فساد ہوا اور نفاق فساد اس وجہ سے ہے کہ فساد شے کے بگڑ جانے کو کہتے ہیں اور واقع میں شے یا انکار ہے یا اقرار ہے یا تصدیق ہے یا تکذیب ہے اور جب کہ نفاق انکار اور اقرار دونوں کا بگاڑ ہے تو لابد نفاق فساد ہوا اور منافق مفسد ہوا غور کر اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ہم تو اصلاح اور درستی کرنے والے ہیں۔ یہ منافقوں کا قول ہے چونکہ منافق اپنا دین حق سمجھتے تھے اور خفیہ اس کی تائید اور تبلیغ کرتے تھے اس خیال کے پیش نظر منافق کہتے تھے کہ ہم اصلاح اور دوستی کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہی مفسد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تصدیق اور تکذیب دونوں کو بگاڑ دیا واذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفھاء الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون ۔ اور جب ان منافقوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ آدمیوں کی طرح ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لائیں آگاہ ہو جاؤ کہ یہی احمق ہیں ولیکن ان کو علم نہیں ہے ۔ یہ منافقوں کی تیسری برائی ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے فساد کو منع کیا اور دوبارہ ایمان لانے کا حکم دیا کیونکہ فساد سے نظام عالم تباہ ہو جائے گا۔ اور ایمان نہ لانے سے نظام عقبیٰ تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ کوئی صانع یہ نہیں چاہتا کہ اس کی صنعت برباد ہو جائے ۔ فساد سے صنعت دنیوی برباد ہو جائے گی اور ایمان نہ لانے سے جہنم بن جائے گا۔ اور مقصد صانع یہ نہیں ہے کہ اشیاء کو بنا کر

23631

برباد کردے۔ اور جلادے جاننا چاہیئے کہ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایمان صرف اقرار کا نام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اٰمنو کما اٰمن الناس فرمادیا یعنی ایمان لاؤ جس طرح آدمی لائے ہیں سو اگر ایمان اقرار مع اخلاص کے ہوتا تو صرف آمنو کافی تھا کما اٰمن الناس کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن جبکہ کما اٰمن الناس کہا تو اس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان سے مراد صرف اقرار ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان اقرار مع اخلاص ہی کا نام ہے لیکن ظاہر میں اقرار کے سوا اور کوئی طریقہ ایمان کا نہیں ہے اس لئے کما اٰمن الناس کے ساتھ تاکید کر دی الناس میں جو لام تعریف ہے وہ یا تو عہد خارجی کا لام ہے عہدِ خارجی کے معنی یہ ہیں کہ یہ لام بعض معین افراد پر دلالت کرے یعنی لوگوں کے بعض معین افراد جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب خلوص دل سے ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ یا یہ لام لام جنسی ہے یعنی جس طرح جنس انسان ایمان لائی ہے۔ اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ مسلمانوں کو انسان کہا گیا کیونکہ مسلمان ہی انسان ہیں اور باقی تو شَرَّ الدَّوَآبِ (انفال - ۲۲) اور شَرُّ الْبَرِیَّۃِ (بینہ) ہیں یعنی بدترین جانور اور بدترین خلائق ہیں۔ اور اس بات کی دلیل یہ ہے یعنی مومن ہی انسان ہے کافر انسان نہیں ہے۔ کہ انسان کا وجود صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے کائنات میں سے کسی کے لئے نہیں ہے اور ایمان لانے کے معنی یہی ہیں کہ انسان کو یہ علم ہو جائے کہ میرا وجود اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور جبکہ اس نے کفر کیا اور ایمان نہیں لایا تو اس کو یہ علم نہیں ہوا کہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جب کہ اس کا وجود جس شے کے لئے اس کے لئے نہ ہوا، اور ہر شے کا وجود جس شے کے لئے تھا اسی شے کے لئے ہوگیا تو ہر شے سے بدتر ہوگیا اور شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ہوگیا۔ جاننا چاہیئے کہ منافق مسلمانوں کو سفیہ اور نادان کہتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے دین کو غلط جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے یہ لقب

منافقوں ہی پر پلٹ دیا۔ کیونکہ جس نے دلیل سے منہ پھیرا اور دلیل پر عمل کرنیوالوں کو
نادان کہا وہی نادان ہے جس نے دنیا کے بدلے آخرت بیچ ڈالی وہی نادان ہے
جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی اس نے اللہ تعالیٰ سے دشمنی کی اور جس
نے اللہ تعالیٰ سے دشمنی کی وہ ہی نادان ہے۔ اور جو نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا
وہی نادان ہے کافروں کا ساتھ چھوڑ کر دنیا تباہ کی۔ مومنوں کا ساتھ چھوڑ کر عقبیٰ خراب
کی خَسِرَ الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو گیا اس سے زیادہ کیا نادانی ہو گی اللہ تعالےٰ
نے اس آیت میں منافقوں کے لئے لَا یَعْلَمُوْنَ فرمایا اور پہلی آیت میں لَا یَشْعُرُوْنَ (حج ۔۱۱)
فرمایا چونکہ یہ بات کہ منافق حق پر ہیں یا مومن حق پر ہیں یہ غور طلب چیز ہے اسلئے مقام غور
میں علم کا لفظ استعمال فرمایا اور یہ بات کہ نفاق موجب فساد ہے یہ حسی چیز ہے اور
حسیات میں لفظ شعور مستعمل ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلی آیت میں لایشعرون اور دوسری میں
لایعلمون فرمایا اور اس آیت میں علم کا لفظ لانے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس
آیت میں سفیہ یعنی جہالت کا ذکر ہے اور جہالت کے مقابلے میں علم کا لفظ انسب
ہے واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا واذا خلوا الیٰ شیاطینھم قالوا انا معکم
انما نحن مستھزءون۔ اللّٰہ یستھزء بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون۔
منافق جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے سرداروں
سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں ہم تو مسلمانوں سے ہنسی
کرتے ہیں۔ اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے۔ اور ان کو سرکشی میں مدد دیتا ہے اور کھینچتا
ہے اس حالت میں کہ وہ حیرت زدہ ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ قالوا آمنا سے مراد خلوص
قلب سے ایمان لانا ہے یعنی منافق مومنوں سے کہتے تھے کہ ہم خلوص دل سے ایمان لائے
کیونکہ زبان سے ایمان لانا تو مومنوں کو معلوم ہی تھا اس کے بیان کرنیکی ضرورت
ہی نہیں تھی مومنوں کو خلوص قلب سے ایمان لانے کو جتاتے تھے اللہ تعالیٰ کے قول واذا

الیٰ شیاطین ھم کے معنی تخلیہ میں ملاقات کرنے کے ہیں اور خلوص کے معنی گذرنے اور چلے جانے کے ہیں۔ جیسے ایام خالیہ وہ دن جو چلے گئے اور قرون الخالیہ وہ زمانے جو گذر گئے اور اس وقت خلو کے معنی یہ ہوں گے کہ جب وہ اپنے سرداروں کے پاس جاتے ہیں اِنَّا مَعَکُمْ اگر کل منافقوں کا قول ہے تو اس وقت ان کے شیاطین کفار ہیں اور اگر بعض کا قول ہے تو ان کے شیاطین بڑے بڑے منافق ہیں۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ہم مسلمانوں سے استہزا کرتے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مسلمانوں سے موافقت اس لئے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے شر اور برائی سے بچے رہیں اور ان کے راز معلوم ہو جائیں اور ان کے مال غنیمت میں حصہ لیں یہ انا معکم کی تاکید ہے یعنی ہم تمہارے ساتھ ہیں اور کفر پر ثابت قدم ہیں اور انما نحن مستھزؤن اسلام کا رد ہے اور کفر کی نقیض (یعنی اسلام) کا رد کفر کی تائید ہے۔ یا انما نحن مستھزؤن انا معکم سے بدل ہے یا علیحدہ کلام ہے۔ کیونکہ جب منافقوں نے ان کے سرداروں سے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو انہوں نے پوچھا کہ پھر مومنوں سے کیوں ملتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان سے استہزا اور مذاق کرتے ہیں۔

لیکن اللہ ان کا استہزا انہیں پر لوٹا دیتا ہے۔ دنیا اور آخرت میں بے وقار اور مقہور ہو جاتے ہیں۔ اللہ ان کی سرکشی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے اور ڈھیل دے دیتا ہے کہ اندھیرے اور ظلمت میں سرگرداں رہیں۔ راستہ اور ہدایت نہیں سوجھتی خواہ کتنے ہی نظریات و مفروضات عقلی قائم کرتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ
مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ
وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى
اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (بقرہ ١٤٣ ع ١٧)

ہم نے قبلہ کو نہیں کیا وہ جہت جس پر کہ تو تھا۔ مگر اس لئے تاکہ جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے قدموں واپس ہوتا ہے یعنی نافرمانی کرتا ہے۔ قبلہ کا بدل جانا بہت شاق ہے مگر ان لوگوں کے لئے جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اللہ کی شان یہ نہیں کہ وہ لوگوں کی نمازیں اور ایمان ضائع کردے۔ کیوں کہ اللہ لوگوں پر بہت شفقت رکھتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَا۔ اس کے دونوں معنی ہیں کعبہ کی طرف قبلہ تھا اور بیت المقدس کی طرف ہو گیا۔ یہ بھی معنی لگتے ہیں اور یہ بھی معنی لگتے ہیں کہ بیت المقدس کی طرف تھا اور کعبہ کی طرف ہو گیا۔ یہاں ایک عجیب بات نکلتی ہے کہ بیت المقدس کی طرف قبلہ مقرر کرنے کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ حضورؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کیا اس کو اللہ پاک نے اپنی طرف منسوب کیا۔ اور کہا کہ ہم نے جو جہت مقرر کی تھی وہ اس وجہ سے کی تھی کہ یہ معلوم کریں کہ کون متبع رسول ہے اور کون نافرمان ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ پاک کی وحی سے آپ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ لیکن اس کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ جہت کا تقرر نبی نے کیا اور خدا نے کہا کہ یہ میں نے کیا تو معلوم ہوا کہ نبی کا عمل اور فرمان منجانب اللہ ہوا

الا لنعلم من یتبع الرسول تاکہ ہم جان لیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے افعال کسی غرض کے لئے ہیں۔ اس مسئلے میں علماء کی دو جماعتیں ہیں ایک جماعت کہتی ہے کہ اللہ کے افعال کے لئے غرض نہیں ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے نہیں اللہ کے افعال معلل

بالا اغراض ہیں۔ اس کے افعال کے لئے علت اور غرض ہے جو جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ کے فعل اور حکم کے لئے کوئی غرض کوئی علت کوئی مقصد نہیں ہے وہ اشاعرہ کی جماعت ہے اس کے امام ابوالحسن اشعری ہیں۔ اور امام غزالی۔ امام رازی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی تک یہ سلسلہ چلا آتا ہے۔ یہ سب امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد ہیں دوسرا گروہ فقہا کا ہے جو حنفی کہلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہیں معتزلہ اور حکمار اسلام وہ یہ کہتے ہیں اللہ کے فعل کے لئے غرض ہے، مقصد ہے، مصلحت ہے۔ آپ غور کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فعل کے لئے غرض ہوگی تو اس غرض کے ہونے اور نہ ہونے کی طرف نسبت برابر ہے یا برابر نہیں ہے۔ یعنی غرض ہو یا نہ ہو اس کے لئے یہ دونوں برابر ہیں یا کم و بیش ہیں۔ رجحان دونوں کی طرف برابر ہے۔ یا کسی ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ اگر رجحان ہونے کی طرف ہو اور وہ غرض نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ناقص ہو جائے گا۔ اس غرض کے بغیر کامل نہیں ہوگا۔ جو فعل وہ کرے گا۔ اس کے لئے اگر کوئی غرض ہوگی اور غرض اگر نہ ہو تو نقصان اور کمی واقع ہوگی اور اللہ پاک کی ذات نقصان سے پاک ہے۔ اور اگر غرض اور عدم غرض کی طرف نسبت برابر ہوگی تو فعل نہیں ہوگا۔ کوئی کام ہی نہیں ہوگا۔ یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فعل کے لئے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ خدا کی غرض تو ہے۔ مگر وہ غرض اللہ کی طرف راجع نہیں ہے۔ بلکہ بندہ کی طرف راجع ہے۔ بندہ کے لئے مصلحت ہوتی ہے بندہ کو نفع پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر بندہ کا نفع غرض ہے تو اللہ کی نظر میں یہ نفع پہنچانا اولیٰ ہے یا اولیٰ نہیں ہے۔ اگر نفع پہنچانے کی طرف رجحان ہے۔ تو ناقص ہوگیا۔ بات وہی ہے۔ اس میں ان بزرگوں سے مغالطہ ہوا

ہے۔ بڑا عظیم الشان۔ دیکھئے اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ یہ اللہ کا فعل ہے۔ اگر مخلوق کے پیدا کرنے اور پیدا نہ کرنے کی طرف نسبت برابر ہے۔ تو مخلوق پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور اگر پیدا کرنے کی طرف رجحان زیادہ ہے تو اس کا پیدا کرنا واجب ہوگیا اور نقص واقع ہوگیا۔ خدا قادر نہ رہا مضطر ہوگیا۔ لہٰذا اس دلیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوق پیدا نہیں ہوئی۔ مگر مخلوق موجود ہے۔ لہٰذا یہ دلیل غلط ہے۔ یہ سب فلسفی دلیلیں ہیں ان ہی خرافات کو ان حضرات نے ان سے سیکھ کر کچھ رد و بدل کے ساتھ یہاں استعمال کی ہیں، اور سب غلط ہیں۔ شیطانی ہیں اور شیطان نے اپنے شاگردوں کو سکھائی ہیں۔

میں خود بھی اسی مذہب کا ہوں کہ اللہ کے فعل کے لئے غرض نہیں ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ مگر اس دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔ یہ ایسی بات ہے کہ شیر کے شکار کو چلے اور غلہ اور غلیل ساتھ لے کر چلے۔ شیر غلیل سے نہیں مرے گا الٹا نقصان پہنچائے گا۔ مسائل کا بیان کرنا میرا کام نہیں ہے۔ مسئلہ تو تمام علماء ہیں وہ بتا ہی دیں گے۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فعل کے لئے اگر علت ہوگی تو وہ علت یا قدیم ہوگی یا حادث ہوگی۔ یہ بڑی فلسفی دلیل ہے۔ اس کو یہ خود تو استعمال کرتے ہیں اور فلسفی جب یہ دلیل لاتا ہے تو یہ خفا ہوتے ہیں۔ اگر وہ علت قدیم ہے تو اس کا معلول لازمی قدیم یعنی ازلی ہوگا۔ تو عالم قدیم ہو جائے گا۔ اور اگر یہ حادث ہے تو جس طرح اس حادث کے لئے علت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس علت حادث کے لئے ایک اور علت کی ضرورت ہوگی پھر اس علت میں یہی بحث ہوگی۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی چلا جائے گا۔ جو محال ہے۔ لہٰذا علت نہ حادث ہے۔ نہ قدیم۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فعل کے لئے علت نہیں ہے۔ یہ دلیل بھی فلسفیوں کی ہے۔ دہریہ خدا کے وجود کا انکار

اسی دلیل سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا اور ایجاد کیا تو یہ بتاؤ کہ اس میں اس کی ذات موجد ہے یا بالعلت اس کو ایجاد کیا ہے۔ اگر اس کی ذات اس کے ایجاد میں کافی ہے تو جب سے اس کی ذات ہے۔ جب ہی سے عالم کو ہونا چاہیئے۔ عالم قدیم ہو گیا۔ اور اگر کوئی علت لاحق ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو پیدا کرنا پڑا تو وہ علت قدیم ہے یا حادث اگر قدیم ہے تو عالم قدیم ہو گیا اور اگر حادث ہے تو اس علت حادثہ کے لئے ایک اور علت چاہیئے اور اس طرح تسلسل لازم آئے گا۔ یہ دہریے کی تقریر ہے۔ پچاس سال کے مسلسل تجربے کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ نہ غور کام آئے گا نہ خوض کام آئے گا۔ بجز اس کے فضل کے۔ بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ چھ چھ مہینے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر اس کی عنایت ہو جائے تو ایک دن میں مضمون سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر علت ہو گی تو یا قدیم ہو گی یا حادث ہو گی۔ اگر قدیم ہو گی تو عالم قدیم ہو جائے گا اور اگر حادث ہو گی تو تسلسل لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ لہٰذا اس کے فعل کے لئے کوئی غرض نہیں ہے جو اس کو فعل کے کرنے کی طرف لائے۔ مثلاً ہم کھانا کھاتے ہیں اس لئے کہ بھوک لگتی ہے۔ بھوک ہم کو کھانے کے فعل کی طرف لاتی ہے۔ بھوک کھانے کے فعل کی علت اور غرض ہے تو یہ دلیل انہوں نے بیان کی مگر یہ بھی غلط ہے۔ بالفرض ہم نے اس کو مان لیا کہ علت قدیم نہیں ہے۔ حادث ہے اب وہ کہتے ہیں کہ اگر حادث ہو گی تو اس کے لئے ایک اور علت کی ضرورت ہو گی۔ یہاں مغالطہ ہوا ہے کیونکہ یہ علت ایسی حادث نہیں ہے جیسا کہ اس کا وہ فعل حادث ہے جس کی یہ علت ہے۔ بلکہ غایت علت اس حادث کا ضمیمہ ہے۔ یہ علت اس حادث کو چمٹی ہوئی ہے۔ وہی علت کافی ہے۔ جس کی یہ غرض ہے۔ اللہ پاک نے جو فعل کیا جس غرض کے لئے وہ جو غرض ہے

وہ حادث ہے لیکن ایسی حادث نہیں ہے کہ حادث الگ ایک چیز ہو بلکہ وہ جس کی غرض ہے اس کا ضمیمہ ہے۔ اس سے چمٹی ہوئی ہے۔ اس کی حادث کی جو علت ہے۔ وہی اس غرض کی علت ہے۔ اللہ پاک نے آگ کو پیدا کیا جلانے کے لئے حرارت پہنچانے کے لئے تو حرارت پہنچانا غرض اور علت ہوا۔ تو جو شئے آگ میں تاثیر کر رہی ہے وہی حرارت میں تاثیر کر رہی ہے حرارت اگر آگ سے علیحدہ چیز ہوتی تب اس کو مزید علت کی ضرورت ہوتی۔ مزید خالق اور موجد کی ضرورت ہوتی۔ حرارت اسی کی ضمن میں پیدا ہوئی ہے۔

پھر انہوں نے یہ کہا کہ بندہ کا نفع پہنچانا جو ہے وہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے ہے۔ لذت کا حاصل کرنا اور تکلیف کا دور کرنا ان دونوں غایتوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ ابتداً قادر ہے یا قادر نہیں ہے کہ ان دونوں چیزوں کو پیدا کرے۔ کیونکہ غرض کے واسطے سے پیدا کرنا یہ زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ بلا واسطہ پیدا کرے ایک ایسی شے جس کو وہ بلا واسطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس کو واسطے سے پیدا کرنا خلاف عقل ہے اور عبث ہے اور اللہ تعالیٰ عبث فعل نہیں کرتا۔ وہ عبث اور لغو فعل نہیں کرتا۔ وہ اس سے پاک ہے اور واسطے سب عبث ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے افعال کے لئے غرض نہیں ہے۔ یہ بھی وہی فلسفیوں کی بات ہے۔ ان ہی باتوں نے مذہب کا ستیا ناس کیا ہے۔

یہ دلیل بھی بالکل غلط ہے۔ پہلی چیز جو ہے اس کائنات میں وہ تو صرف کن سے پیدا ہوئی ہے۔ ابتدائیات اور مبادیات جو ہیں وہ تو اللہ پاک نے کن سے پیدا کئے ہیں باقی جتنے بھی مرکبات ہیں وہ اجزاء اور مفردات سے پیدا کئے ہیں۔ مفردات کی تو صرف پہلی لائن ہے۔ باقی اکثریت سب مرکبات ہی کی لائنیں ہیں۔ اگر عناصر اربعہ کو مفردات فرض کر لیا جائے تو باقی تمام اشیاء ان سے بنی ہیں۔ جمادات پھر نباتات پھر حیوانات اور

ایک مرکب سے دوسرا پھر اس سے تیسرا پھر چوتھا۔ ایک سلسلہ اسباب کا ہے جو پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے اور اللہ پاک اس پر قادر ہے کہ جو اشیاء یہاں ہیں اور جو آئندہ ہوں گی وہ سب بغیر سبب کے پیدا کرے مگر سب بالواسطہ پیدا ہو رہی ہیں تو پوری کائنات لغو ہو جائے گی۔ مگر پوری کائنات متحقق ہے تو معلوم ہوا کہ واسطے سے ایجاد کرنا بالکل حق ہے۔ اگر یہ ناحق ہوتا تو سارے عالم کو پیدا نہ کرتا۔

انہوں نے اور بھی دلائل دیئے ہیں (جو یاد آئیں گے بیان کر دوں گا)۔ سب غلط ہیں۔ وہ چاہتا تو شروع سے کائنات آخروی بنا دیتا مگر اس نے اس ننھی سی دنیا کو کائنات آخروی کا ذریعہ بنایا۔ تو معلوم ہوا کہ ذریعہ پیدا کرنا اس کی عادت ہے۔ اور جو اس کی عادت ہے وہ حق ہے۔ اس لئے کہ جو خدا کو مانتا ہے وہ یہ تو مانتا ہے کہ جو کچھ اس نے پیدا کر دیا وہ حق ہے۔ اب اس نے واسطے سے پیدا کیا تو معلوم ہوا کہ واسطے سے پیدا کرنا صحیح ہے حق ہے۔ مرکبات سب مفردات سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح مفردات پیدا کر سکتا ہے مرکبات بھی پیدا کر سکتا ہے۔ مگر نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ ذرائع سے پیدا کرنا اس کی عادت ہے اس لئے اُن کی دلیل غلط ہے۔

اب وہ یہ کہتے ہیں کہ کائنات کی کسی شے کو کسی خاص وقت میں پیدا کیا اگر اس خاص وقت پر پیدا کرنے میں اس کی کوئی غرض ہو گی تو وہ غرض اس کے پہلے اور اس کے پیچھے نہیں ہو گی تو اگر وہ غرض ازلی ہے تو پہلے اور بعد کی تخصیص بیکار ہو گئی اور اگر حادث ہے تو اس حادث کے لئے ایک اور غرض کی ضرورت ہو گی اور تسلسل لازم آئے گا۔ یہ دلیل بھی غلط ہے۔

اس لئے کہ اللہ پاک نے ایک خاص وقت میں عالم کو پیدا کیا تو یہ کہنا کہ مصلحت

پہلے نہیں تھی یا بعد میں نہیں تھی۔ یہ کہنا غلط ہے۔ اس میں دونوں فریق سے غلطی ہوئی۔ کیونکہ عالم کے پیدا کرنے سے پہلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کی پیدائش کے قبل تو یہاں کوئی شے ہی نہیں تھی۔ جو پہلے پیچھے کا سوال پیدا ہوتا پہلے پیچھے ہونا تو عالم کی خصلت ہے اس عالم سے باہر کوئی پہل اور پیچھا نہیں ہے۔ اس لئے یہ سوال عالم کے اندر تو ہو سکتا ہے۔ عالم کے باہر نہیں ہو سکتا۔ غلط ہے۔

پھر انہوں نے یہ کہا کہ بندہ کے ہر فعل کا خالق خدا ہے۔ جب ہر فعل کا خالق وہ ہے تو غرض اور مصلحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا جواب ہم تفصیل سے تقدیر کے مسئلے میں دے چکے ہیں۔ خدا کے ہر فعل کے خالق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں۔ جو وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، یہ اپنے شعور میں میں ہی کہہ رہا ہوں۔ خدا جو کر رہا ہے وہ وہاں کر رہا ہے جہاں بندہ نہیں ہے۔ جہاں بندہ ہے۔ وہاں بندہ ہی اپنے فعل کو کر رہا ہے۔ اور وہ یہ خوب اچھی طرح سمجھ رہا ہے کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ یہ اس کے شعور میں کبھی بھی بات نہیں آتی کہ یہ حرکت خدا نے کرائی ہے یا خدا نے پیدا کی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ خوب جانتا ہے کہ میں نے اپنے قوت و اختیار سے یہ حرکت خود کی ہے۔ لہٰذا یہ دلیل بھی غلط ہے اور جتنے دلائل ان کے ہیں اللہ کے افعال کے لئے غرض نہیں ہے۔ سب غلط ہیں اور جھوٹے ہیں۔

اب جو مخالف جماعت ہیں یعنی احناف اور معتزلہ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے فعل کے لئے غرض ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ کے فعل کے لئے غرض نہیں ہوگی تو خدا کا فعل عبث ہو جائے گا۔ اور خدا عبث سے غنی ہے پاک ہے۔ یہ اللہ خوب جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہ فعل عبث ہے دونوں باتوں کو جانتے ہوئے بھی وہ فعل

عبث کرے۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ غیر معقول ہے۔ اس لئے خدا عبث فعل کرے یہ محال ہے اس لئے خدا کے فعل کے لئے غرض نہ ہونا محال ہے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ خدا کے فعل کے لئے غرض و حکمت اور مصلحت ہے۔ ان کی یہی ایک دلیل مجھ تک پہنچی جو میں نے آپ کو بتادی۔ قرآن شریف ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جس سے غرض ثابت ہوتی ہے الا لنعلم تاکہ ہم جان لیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (عمران ۱۹۱) ہم نے یہ عبث پیدا نہیں کیا۔ وما خلقنا السماء والارض وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص ۲۷) ہم نے آسمان زمین اور اس کے درمیان جتنی اشیاء ہیں عبث پیدا نہیں کیں۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے فعل کے لئے مصلحتیں ہیں۔ قرآن شریف سے بعد میں بحث کریں گے۔ پہلے عقلی دلیل لیتے ہیں۔ کہ اگر خدا کے فعل کے لئے حکمت نہیں ہوگی تو وہ عبث ہو جائے گا۔ اس کا رد یہ کیا ہے کہ عبث کے کیا معنی، عبث کے معنی یہ ہیں کہ اس کے فعل کے لئے غرض نہ ہو۔ اب اللہ کے فعل کے لئے اگر حکمت نہ ہوگی تو یہ فعل عبث ہو جائے گا۔ اس جملے کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اللہ کے فعل کے لئے غرض نہ ہوگی تو اللہ کا فعل ایسا ہو جائے گا جس کے لئے غرض نہ ہو۔ یہ جملہ مہمل ہو گیا۔ اور اشاعرہ نے یہ بھی کہا کہ اگر عبث کے کچھ اور معنی ہیں تو وہ ہمیں بتاؤ تاکہ ہم اس میں غور کریں تو ان کی دلیل بھی بے کار ہو گئی وہ بھی یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اللہ کے فعل کے لئے حکمت ہے۔

ان کا ایک اعتراض اور بھی ہے کہ جتنے مصائب اور آلام ہیں دنیا میں کافی بہت زیادہ ہیں اور عاقبت میں تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ تو اگر اس دنیا کے آلام اور مصائب اور اُس دنیا کے ابدی آلام و مصائب کو اگر جمع کریں تو وہ اتنے ہیں کہ جنت کا سکھ اور اس دنیا کا سکھ مل کر اس کے قطرہ کے برابر بھی نہیں ہوتا۔ تو عقل برابر یہ کہہ رہی ہے کہ

جنت اور یہاں کے آرام چاہیے نہ ہوتے مگر ابدی اور دنیوی عذاب نہ ہونا چاہیئے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی حکمت نہیں ہے۔ حکمت اس میں تھی کہ کسی کو بھی عذاب نہ ہوتا یہ بات عقل کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہے بمقابلہ اس کے کہ تھوڑی سی جماعت کو تو آرام اور عیش اور سکھ ہو اور بہت بڑی اکثریت کو دکھ ہو اور دکھ بھی دائم تو ان کی دلیل بھی رد ہو گئی۔ دونوں فریقوں کے دلائل غلط ہیں اور ناکام ہیں مصالح اور حکمت کے احناف زیادہ قائل ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں اجتہاد اسی اصول پر ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کے بھی یہاں ہوتا ہے مگر کم۔ باقی جتنے لوگ ہیں۔ سب انہیں کے شاگرد ہیں اور جو فلسفی علما ہیں وہ عقل کی مطابقت تلاش کرتے ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں کہ حکمت اور مصلحت ہونی چاہیئے۔ اب تحقیق کیا ہے۔ آیا اللہ پاک کے فعل کے لئے حکمت ہے یا نہیں ہے۔ پہلے آپ یہ سمجھیں اور غور کریں کہ آپ نے ایک میز بنوائی۔ اب ہر مرکب کے لئے چار علتیں ہیں۔ چار چیزیں ہوں گی۔ تو یہ شے ہوگی۔ علت فاعلی۔ علت مادی۔ علت فعلی۔ علت غائی۔

۱ ۔ ایک تو بنانے والا چاہیئے اس کو علت فاعلی کہتے ہیں۔

۲ ۔ ایک اس کے لئے مادہ ہونا چاہیئے جس پر بنانے والے کا اثر قائم ہو ۔ یہ علت مادی ہے۔

۳ ۔ اور ایک اس کے لئے صورت چاہیئے کہ بننے کے بعد وہ شکل قائم ہو ۔ اور شکل اس کو کہتے ہیں جس کو ایک حد یا کئی حدیں گھیر لیں ۔ یہ علت فعلی کہلاتی ہے،

۴ ۔ اور کیوں بنایا۔ اس کے جواب میں جو چیز آئے گی وہ اس کی غایت کہلائے گی اس کو علت غائی کہتے ہیں ۔

یہاں ایک دھوکہ لگا ہے۔ ایک بنانے والا ہے بڑھئی۔ ایک بنوانے والا ہے

مالک ۔ دونوں نے ایک ہی فعل کروایا ہے ۔ تو بڑھئی کے فعل کی غایت تو مزدوری ہے
جو اس کو ملے گی ۔ اور مالک کی غایت میز کا استعمال ہے ۔ بڑا فرق ہو گیا ۔

اب ایک بات اور سمجھیں ۔ ہذا خلق اللہ ۔ یہ اللہ کی خلق ہے ۔ (لقمان - ۱۱) خلق مخلوق کے معنی میں
استعمال ہوا ہے اروني ماذا خلق الذين من دونی (لقمان ۱۱) میرے علاوہ اور کسی کی خلق
دکھاؤ ۔ تم جو یہ کہتے ہو کہ یہ بھی معبود ہیں تو معبود حق کی تو یہ شناخت ہے کہ یہ اس نے بنایا
اگر یہ معبودان باطل معبود ہیں تو ان کی خلق دکھاؤ فتشابہ الخلق علیہم (رعد - ۱۶) کیا کاریگری
میں شبہ ہو گیا ان کو ۔ یہ کافر بڑی گمراہی میں پڑ گئے ۔ کیا یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر یہ معبود ہوتے
تو ان کی صنعت کہیں تو ہوتی ۔ تو خلق کا لفظ مخلوق کے معنوں میں ہے ۔ ہذا خلق اللہ کے معنی
ہیں ۔ ہذا مخلوق اللہ ۔ فعل کا لفظ مفعول کے معنی میں ہے اور فعل کا یہ استعمال ہر زبان میں
رائج ہے ۔ یہ کائنات ۔ یہ مخلوق خدا کا فعل ہے تو اب جو تم کہتے ہو کہ خدا کے فعل کیلئے علت
ہے ۔ اس کے کیا معنی ؟ خدا کے ایجاد اور فعل کے لئے علت ہے یا نہیں یا خدا کے مفعول اور
مخلوق کے علت ہے یا نہیں ۔

ایک تو ہے ایجاد اور ایک ہے وہ وجود جو موجود ہے ۔ مخلوق کی طرف اشارہ
کرکے کہیں کہ یہ کس کا فعل ہے ۔ جواب ملے گا خدا کا فعل ہے ۔ مگر یہ خدا کا فعل نہیں ہے
بلکہ یہ وہ شے ہے جس کے ساتھ خدا کا فعل متعلق ہوا ۔ یہ خدا کی خلق ہے ۔ حالانکہ وہ خدا
کی خلق نہیں ہے ۔ مخلوق ہے ۔ مخلوق کے ساتھ خدا کا فعل خلق متعلق ہوا ہے ۔

تو یہ مغالطہ اس طرح لگ گیا کہ " فعل کی علت غائی ہے یا نہیں " اس کو جاری کیا
انہوں نے مخلوق میں مفعول میں اور انہوں نے رد کیا اس کو خلق میں ۔
اصل حقیقت یہ ہے کہ خلق کے لئے علت نہیں ہے ۔ مخلوق کے لئے علت ہے

یعنی جس طرح خدا کی ذات بے علت ہے۔ اسی طرح اس کا فعل یعنی ایجاد بے علت ہے اور اس کا جو موجود ہے۔ مخلوق اس کی علت ہے۔

تو خدا کے فعل کے لئے حکمت مصلحت علت ہے۔ یا نہیں تو اس سے کیا مراد ہے خدا کی مخلوق کے لئے کوئی حکمت اور مصلحت ہے یا نہیں۔ اس کے لئے پوری حکمت ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران-۱۹۱) ہر شے میں حکمت اتنی بھری ہوئی ہے کہ اس کا ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے اگر کر سکتے ہیں تو صرف اتنا جتنا کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعہ سے ہم کو بتا دیا ہے۔ اگر اس کے فعل کے لئے پوچھتے ہو تو اس کے فعل کے ایجاد کے، خلق کے لئے کوئی علت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا فعل بالمشیت ہے۔ غایت اس فعل کیلئے ہوتی ہے جس میں نقص ہوتا ہے کہ اس نقص کی کمی کو پورا کرنے کیلئے فعل کیا جاتا ہے۔ دفع مضرت اور جلب منفعت کیلئے جو فعل ہوتا ہے اس کیلئے دفع مضرت اور جلب منفعت غایتیں بنتی ہیں یعنی یہ فعل کیوں کیا۔ اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ فعل کیوں کیا۔ آرام، آسائش سکھ کو حاصل کرنے کے لئے راحت اور مزے کے حاصل کرنے کے لئے تو نفع اور نقصان اس فعل کی علت ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نفع نقصان سے پاک ہے۔ اس لئے اس کے فعل، ایجاد کے لئے کوئی علت نہیں۔ اور جو شے اس نے ایجاد کی ہے اس میں مصلحت حکمت پوری بھری ہوئی ہے۔ ورنہ وہ عبث ہو جاتی۔ یہ میں نے تحقیق جدید کر دی اس کی آپ عبارت پر غور کیجئے کہ دقت مغالطہ کیا ہوا ہے دو فریق نے فعل و مفعول کو مختلط کر دیا۔ ایک نے فعل کو مفعول کے ساتھ ملا کر اس کا اثبات کر دیا اور انہوں نے مفعول کو فعل کے ساتھ ملا کر اس کو رد کر دیا۔ نہ وہ بات ثابت ہوئی نہ یہ ثابت ہوئی دونوں فریقوں کی دلیلیں غلط ہو گئیں۔ آئندہ تعلم کی تفسیر بیان ہوگی وہ اس سے بھی زیادہ دقیق ہے۔

(پچھلے کا اعادہ کے بعد) آج کا مضمون بہت مشکل اور بہت صعب ہے۔ لنعلم تاکہ ہم جان لیں۔ یعنی پہلے ہم کو نہیں معلوم تھا۔ اب معلوم ہوا تو یہ وہم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا کو پہلے سے علم نہیں تھا۔ اس قسم کی آیات قرآن شریف میں بہت ہیں وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ (محمد-۳۱) ہم آزمائیں گے تمہیں گویا کہ اس سے پہلے شاید علم اللہ کو نہیں تھا۔ آزمانے کے بعد معلوم ہوگا: لَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ (عمران-۱۴۲)، یعنی ابھی اللہ کو یہ نہیں معلوم ہوا کہ تم میں سے کون مجاہد ہے وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (عمران-۱۴۲) اور نہ یہ معلوم ہوا کہ تم میں سے کون صابر ہے فليعلمن الله الذين صدقوا (عنکبوت-۳) — صادقوں کو جان لے یعنی پہلے وہ نہیں جانتا تھا کہ صادق کون ہے وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا (انفال-۶۶) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگیا کہ تم میں کمزوری ہے اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا (انفال-۶۶) اللہ تعالیٰ نے جہاد کے معاملے میں تخفیف کر دی اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے معلوم نہیں تھا۔ یہ ہے دقت۔ ہشام ابن حکم کوفی رافضیوں کا سب سے بڑا رئیس ہے۔ سب سے بڑا متکلم ہے۔ ابو یوسف حلاج کے زمانے کا ہے۔ دوسری صدی کا آدمی ہے۔ تمام رافضی اسی کے پیرو ہیں، جتنے بھی ائمہ ہیں ان کے۔ یہ اور اس کے متبعین یہ کہتے ہیں کہ ازل میں اللہ تعالیٰ کو اشیاء کا علم نہیں تھا۔ جب اشیاء واقع ہوتی ہیں یا پیدا ہوتی ہیں اس وقت علم ہوتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں بدرع کہتے ہیں۔ یعنی بدرع کے قائل ہیں۔ یعنی ابتدا ہوتی ہے علم کی۔ ازل میں اپنی ذات وصفات اور ماہیتوں کو

جانتا ہے مگر ان کی جزئیات کو نہیں جانتا۔ جو چیزیں ہوتی جاتی ہیں ان کو جانتا جاتا ہے۔ اس عالم کی اور آخرت کی۔ اور ان کی دلیل یہ آیات ہیں جو اوپر بیان ہوئیں اور اسی قسم کی اور بہت سی آیات ہیں قرآن شریف میں۔ اور عقلی دلائل ہیں۔ دقت یہ ہے کہ اس طرف سے اگر قاعدہ میں جواب ہو جائے تو سہولت ہو جاتی ہے۔ جہاں جواب نہیں بن پڑتا یا جہاں رکاکت ہوتی ہے تو دشواری ہوتی ہے تو جواب نہیں دیا یا جواب دیا تو ایسا جو لاگو نہیں ہوا۔ قابل اطمینان نہیں ہوا۔ پہلے آپ ایک تمہیدی بات سمجھیں۔ واجب اس شئے کو کہتے ہیں جس کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی وجود جس شئے سے جدا نہ ہو سکے اس کو "واجب" کہتے ہیں۔ اور جس سے عدم جدا نہ ہو سکے اس کو "محال" اور "ممتنع" کہتے ہیں۔ اور جس سے دونوں جدا ہو سکیں اس کو "ممکن" کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحیں فلسفیوں کے یہاں کی ہیں لیکن ان کا استعمال تمام شرائع میں ہے۔ تمام اہل علم اس کو استعمال کرتے ہیں، گو اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی اجازت نہیں دی ان ھو الا اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم، یہ صرف نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں ما انزل اللہ بھا من سلطان[۲۳] اللہ سے اجازت لئے بغیر۔ اس لئے ہمارے نزدیک تو ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے مگر تمام اہل علم ان کو استعمال کرتے ہیں۔ شریعت نے ان کی اجازت نہیں دی کہ یہ نام رکھو۔ بے ہودہ باتیں ہیں۔ بہر حال اصطلاحوں کے معنی تو آپ نے سمجھ لئے ہیں۔ اب غور کریں۔ ہشام ابن ہشام کہتا ہے کہ اگر اللہ اشیاء کے واقع ہونے سے پہلے اشیاء کو جان لے گا تو جن اشیاء کو اس نے جان لیا ان کا وقوع ہو کر رہے گا۔ وہ اشیاء واجب الوقوع ہیں۔ اور جن اشیاء کے عدم وقوع کو جانا اس نے کہ یہ شئے نہیں ہوگی۔ اس کا نہ ہونا ضروری ہے یعنی اس

کا ہونا اور وقوع محال ہے۔ تو اب جتنی اشیاء ہیں ان میں سے کچھ واجب ہوگئیں۔ اور کچھ محال ہوگئیں اور جو شے واجب ہے یا محال ہے۔ اس کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہوتی۔ تو اگر اللہ تعالیٰ وقوع سے پہلے اشیاء کو جان لے گا۔ تو قدرت اس کی مسلوب ہو جائے گی۔ اور وہ عاجز ہو جائے گا۔ اور مخلوق بھی عاجز ہو جائے گی۔ اب دو چیزیں ہیں یا واجب یا محال، واجب اور محال کے ساتھ اللہ کی قدرت متعلق نہیں ہوئی تو بندہ کی قدرت کیا متعلق ہو گی۔ تو خالق و مخلوق دونوں عاجز ہو جائیں گے۔ تو خالق اور مخلوق دونوں عاجز نہیں ہو سکتے تو گویا اللہ تعالیٰ کو ازل میں اشیاء کا علم ہونا محال ہوگیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اشیاء کو ان کے وقوع سے پہلے نہیں جانتا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو اشیاء کا ازل میں علم ہو گا۔ تو اس کے علم کے خلاف ہو نہیں سکتا تو اشیاء یا واجب ہوں گی یا محال ہوں گی۔ اور واجب اور محال کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہوتی، خالق کی نہ مخلوق کی۔ لہٰذا دونوں عاجز ہو گئے اور دونوں عاجز ہو نہیں سکتے۔ یہ محال ہے کہ دونوں عاجز ہوں اور یہ دونوں کا عجز اس بات پر لازم آیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو ان اشیاء کا علم ان وقوع سے پہلے ہے تو اللہ تعالیٰ کو ازل میں اشیاء کا علم ہونا محال ہو گیا۔ اب آپ کو میں یہ بھی سمجھا دوں کہ واجب اور محال اس کو کہتے ہیں جس کے خلاف نہ ہو۔

بہت عجیب اور الطف بات ہے کہ اگر کسی واقعہ کی علت ہو گی تو معلول ہمیشہ علت سے پیچھے ہو گا۔ اور جو شے کسی شے سے پیچھے ہو گی اس شے کا ہونا اس شے کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً درختوں اور مکانوں کی سایہ میں جو ظل ہوتی ہے۔ وہ سورج کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ سورج اس ظل کی علت ہوتا ہے۔ وہ ظل سورج

سے پیچھے ہوتی ہے۔ اگر سورج سے قطع نظر کرلی جائے تو ظل باقی نہیں رہتی تو جو شے پیچھے ہوگی اس کا وجود ضروری نہ رہا بلکہ اس کا وجود علت کے اعتبار سے ہے۔ اور اس نظریہ سے ہے۔ حرارت کا وجود کہیں بذاتہ نہیں ملے گا۔ اگر بذاتہ ہوتا تو اس کا وجود ہوتا۔ بلکہ وہ آگ کے تابع ہے۔ جہاں آگ ہوگی وہاں حرارت ہوگی۔ اگر آگ سے قطع نظر کریں تو حرارت کا کہیں وجود نہیں ہے۔ تو واجب الوجود کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ اس کے لئے علت نہ ہو۔ کیونکہ اگر واجب الوجود کے لئے علت ہوگی تو وہ علت سے پیچھے ہوگا۔ اور واجب الوجود کا وجود اس علت کے اعتبار سے ہوگا۔ ذاتی اعتبار سے نہیں ہوگا۔ اب رہا محال یہ واجب الوجود کی ضد ہے تو جو شے کسی شے کی علت ہوتی ہے تو اس علت کی نفی اس شے کی نفی کی علت ہوتی ہے۔ میں نے تحقیق کرکے ایک نئی بات معلوم کرلی ہے کہ جب واجب الوجود کیلئے سرے سے کوئی علت ہی نہیں ہے تو پھر اس علت کی نفی کیسے ہوگی۔ اس علت کی نفی ہو تب جاکر واجب الوجود کا عدم ہو۔ محال جو واجب الوجود کا ضد ہے تو چاہیئے کہ ضد کی علت کی نفی ہو وہاں علت ہے نہیں اس لئے واجب الوجود اور محال کے لئے علت نہیں ہوگی۔ یہ بہت باریک بات ہے اس کو لوگ نہیں سمجھے۔ اس سے بہت مشکل مسائل حل ہوں گے۔ ہر شے میں دیکھئے جو کسی شے کی علت ہے۔ اس علت کی نفی معلوم کی نفی کی علت ہے۔ واجب الوجود کی چونکہ علت ہی نہیں ہے تو وہاں علت کی نفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاکہ واجب کی نفی ہو۔ اور وہ نفی محال واقع ہو۔ اور ممتنع واقع ہو اور شریک باری تعالیٰ ہو وہ بالذات محال ہے۔ جس طرح بالذات واجب ہے۔

یہاں جو دقت ہوئی ہے کہ پوری جماعت علماء کی اس شبہ کے حل کرنے میں قاصر ہے۔ یہاں میں ایک راز کی بات بتاؤں اس نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ جس طرح

قدرت کی نفی کو محال کر رہا ہے کہ اس سے قدرت کی نفی لازم آتی ہے اور اللہ کی شان سے یہ بعید ہے کہ قدرت کی نفی ہو تو جس طرح قدرت کی نفی اس کی شان سے بعید ہے۔ اس طرح علم کی نفی بھی تو اس کی شان سے بعید ہے۔ قدرت کے اثبات میں جہل کو قبول کر رہا ہے۔ حالانکہ علم اس کا پوری قدرت کو محیط ہے۔ اور زیادہ قوی ہے۔ بہت بڑی غلطی کی۔ یہ اصولی نکتہ تھا۔ جو میں نے آپ کو بتادیا۔ اصل میں حدود کلام سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی غلطیاں ہوئی ہیں۔ پورا عبور ہونا چاہیئے۔ عبور کے بعد ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح حساب کا قاعدہ اگر اچھی طرح سمجھ لے تو کوئی سوال ہو فوراً حل کر دے گا اسی طرح اگر حدود کلام سے واقفیت ہو تو جو مسئلہ پیش آئے گا حل کر دے گا۔ یہ جتنے غلط اور بے بنیاد ہزارہا مذاہب پیدا ہوئے ہیں وہ اسی ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں باری تعالیٰ کو عیب سے بری کرنا ہے تو یہ کتنی بڑی حماقت ہے۔ کہ ایک کمزور عیب سے بری کرنے کے لیئے اس سے قوی عیب کو اختیار کر لیا جائے۔ اگر بچانا ہے تو تمام عیوب سے بچاؤ یہ استدلال غلط ہے۔ قانونی غلطی کی ہے۔ سخت غلطی کی ہے۔ دوسری صدی کا آدمی ہے کہتا ہے۔ کہ نبی غلطی کر سکتا ہے۔ امام غلطی نہیں کر سکتا۔ اس لیئے کہ نبی کے لیئے وحی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ غلطی کرے گا تو اصلاح ہو جائے گی۔ امام کے لیئے وحی کا دروازہ بند ہے اس لیئے وہ غلطی نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہاں اصلاح کا موقع نہیں ہے اور اہل سنت والجماعت اس کا جواب نہیں دے سکے۔ ایسی بہت سی غلطیاں ہیں۔ بے شمار۔ سب بے ہودہ باتیں ہیں۔ پچاس برس سے غور کر رہا ہوں۔ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ وہ توفیق دیدیگا تو سہولت ہو جائے گی اور اگر توفیق نہیں دے گا تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ دلیل یہ ہے اللہ تعالےٰ کو جس شے کا علم ہو گا وقوع کا یا عدم وقوع کا وہ

ہو گئے ہے گا۔ اگر وقوع کا علم ہے تو اس کا ہونا واجب اور جس کے عدم وقوع کا علم ہے اس کا ہونا محال۔ اور محال اور واجب کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہو سکتی تو خدا عاجز ہو گیا اور جب خدا کی قدرت متعلق نہیں ہو سکتی تو بندہ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا بندہ بھی عاجز اور یہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں عاجز ہوں لہٰذا خدا کو وقوع سے پہلے اشیاء کا علم ہے۔

آدمی اس کو صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ ذمہ داری میری ہے۔ اور وہ جزا اس شعور کے اعتبار سے ہے۔ اس لئے نہ کوئی تکلیف بالمحال لازم آتی ہے نہ کسی قسم کا کوئی حرج۔ نہ خدا کے فعل میں کوئی سفاہت کچھ بھی نہیں۔ سارا قصہ ختم ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دوسرا شعور ہے۔ حقیقی شعور یہ ہے کہ ایک کو ایک دیکھے۔ مگر جب وہ احول چشم ہو گیا۔ تو وہ ایک کو دو دیکھے گا۔ لیکن جو دو دیکھ رہا ہے وہ بھی یہ جانتا ہے کہ یہ ایک ہی ہے اسی طرح ہر شخص جس کو صحیح معرفت ہو چکی وہ خوب جانتا ہے کہ ہر فعل کا خالق خدا ہے۔ مگر کہے گا یہی یہ میں نے کیا ہے۔ جس طرح احول چشم خوب جانتا ہے کہ ایک ہی ہے۔ لیکن جب دیکھے گا دو نظر آئیں گے۔ اسی طرح معرفت میں کتنا بھی بالغ ہو جائے۔ اور یہ کہے کہ خالق ایک ہی ہے۔ لیکن کہے گا یہ کہ اپنے فعل کا خالق میں ہوں۔ جس طرح وہاں آنکھ میں خرابی ہو گئی ہے۔ اسی طرح یہاں ذہن میں خرابی ہو گئی ہے۔ تو جتنے بھی احکام شرائع ہیں۔ وہ اس موجود شعور کے اعتبار سے ہیں۔ واقع کے اعتبار سے نہیں ہیں۔ کیونکہ واقع کے اعتبار سے ہوتے تو ان میں تبدیل نہ ہوتی۔ مگر ان میں ہر وقت تبدیلی ہو رہی ہے۔

یہ نظام موجود شعور کے اعتبار سے ہے۔ ہم مکلف اس موجود شعور کے اعتبار سے ہیں۔ اس شعور میں کمی ہو جائے مٹ جائے گا۔ تکلیف ساقط

ہو جائے گی اگر یہ شعور جاتا رہے سو جائے، کوئی معذوری ہو جائے جس سے
شعور جاتا رہے۔ تکلیف ساقط ہو جائے گی۔

یہاں اس آیت میں لِنَعْلَمَ وارد ہوا ہے یا اسی طرح کی آیات جو ہیں ان کا
مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ اب معلوم کرے گا کیونکہ اس ذات عالی کو تو پہلے ہی سے
معلوم ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی حسّی طور پر خود جان لے اور اس شخص کو شعور
حاصل ہو جائے تاکہ وہ قاعدے کے مطابق ماجور ہو۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا
وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ
إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي
وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ كَمَا أَرْسَلْنَا
فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا
تَعْلَمُونَ ۝ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ

(بقرہ ۱۴۹-۱۵۲)

تو جہاں سے بھی نکلے نماز کیلئے تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرلے وانه للحق من ربك اور یہی بات حق ہے تیرے رب کی جانب سے وما الله بغافل عما تعملون اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے تمہارے اعمال سے لئلا یکون للناس علیکم حجة تاکہ لوگوں کا تمہارے اوپر کوئی احتجاج نہ ہو۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ظلم کیا ہے۔ فلا تخشوهم تم ان سے مت ڈرو واخشونی اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پورا کر دوں اور تم صاحب ہدایت ہو جاؤ۔ تین بار فرمایا ومن حیث خرجت ....

مفسرین نے اس کی توجیہہ یہ فرمائی ہے کہ پہلی مرتبہ اندرون خانہ کعبہ کے لئے فرمایا۔ دوسری مرتبہ اہل شہر کیلئے فرمایا اور تیسری کے مخاطب سارے عالم کے مسلمان ہیں۔ اور چونکہ قبلہ کا معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے اتنی تاکید کی ہے۔ ایک آیت کو تین مرتبہ اس لئے فرمایا تاکہ لوگوں کا آپ پر احتجاج نہ ہو کیونکہ یہودی یہ کہا کرتے تھے کہ دین میں تو تم ہمارے مخالف ہو۔ مگر قبلہ میں ہمارے شریک ہیں تو اس طعنہ زنی پر اللہ پاک نے تین بار تاکید فرمائی کہ وہ منسوخ ہو گیا یعنی بیت المقدس اور کعبہ ابد تک مقرر ہو گیا۔ تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کعبہ ہمیشہ قبلہ رہے گا۔ اس لئے تاکید فرمائی جو لوگ ایمان نہیں لائے یعنی یہود تو طعنہ دیتے رہیں گے ورنہ سب کے منہ بند ہو گئے بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کو جو قبلہ پسند ہے ہم وہی عنایت کریں گے۔ اس لئے فرمایا جہاں سے نکلو منہ اپنا کعبہ کیطرف پھیر لو۔

دوسری آیت اس بنا پر ہے کہ وانہ للحق من ربک سچائی اور حق تیرے خدا کی طرف سے ہے اس واسطے منہ کعبہ کی طرف پھیر لو۔ تیسری مرتبہ آیت اس لیے نازل فرمائی کہ لوگوں کا احتجاج باقی نہ رہے۔ لئلا یکون للناس علیکم حجۃ
جیسا کہ یہودی طعنہ دیا کرتے تھے کہ اگر ہم نہ ہوتے تو یہ کدھر سجدہ کرتے اور چند جو ظالم ہیں وہ تو طعنہ دیتے رہیں گے۔ ان کا خیال نہ کرو۔ نہ ان سے ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ تاکہ میں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں مکمل کر دوں اور تم اس پر عمل کر کے راہ یاب ہو جاؤ۔ یہ دونوں رائیں مفسرین کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں کسی مصلحت کی ضرورت نہیں ہے۔
ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مصلحت ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر یہ رائے مفسرین کی ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ اللہ پاک کے افعال کیلئے اور احکام کیلئے کوئی مصلحت نہیں ہے۔ اس کو آپ غور سے سمجھیں کیوں کہ اگر مصلحت ہوگی تو سورۃ رحمٰن میں آیۃ فبای الاء ربکما تکذبان متعدد بار آئی ہے اور وہاں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ اس لئے کہ بعض مقام ایسے ہیں کہ وہ رحمت سے خالی ہیں۔ بلکہ عتاب اور عذاب ہیں۔ جیسے سنفرغ لکم ایہا الثقلن (رحمٰن۔ ۳۱) ہم تم سے سلٹنے کیلئے بالکل فارغ اور تیار ہو گئے ہیں یہ جو دھمکی ہے وہ رحمت نہیں ہو سکتی بلکہ عذاب ہے اور اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ تم اپنے رب کی نعمتوں میں کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ یہ بالکل عقل کے خلاف ہے۔ یہ نعمت نہیں ہے بلکہ اور زحمت ہے۔ یرسل علیکما شواظ من نار ونحاس فلا تنتصران (رحمٰن ۳۵) تمہارے اوپر آگ کا گولہ چھوڑا جائے گا اور تمہارا کوئی غمخوار اور مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ کتنی سخت وعید ہے۔ پھر فرمایا۔ فبای الاء ربکما تکذبان۔ حالانکہ یہ نعمت نہیں ہے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اور نعمت کا لفظ استعمال فرمایا۔

جہنم میں اور کھولتے ہوئے پانی میں رہیں گے اور طواف کریں گے۔

پھر فرمایا:۔ یطوفون بینھا وبین حمیم اٰن (رحمٰن۔۴۴) یہ نہ در حقیقت جنتیوں کے لئے نعمت ہے اور نہ دوزخیوں کے لئے نعمت ہے۔ جہاں رحمت کا ذکر ہے وہاں تو یہ مصلحت ہو سکتی ہے مگر عذاب کو نعمت کہنے میں کوئی مصلحت نہیں ہے کیونکہ مصلحت تو وہ ہے جو عقل میں آجائے۔ جو عقل میں نہ آئے وہ مصلحت نہیں ہے۔ روزہ میں شہوت ٹوٹ جاتی ہے۔ کمزور ہو جاتی ہے معدہ کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ تو یہ تو ظاہر مصلحت ہے۔ مگر حج میں کنکریاں مارنا اور وہ بھی سات گن کر نہ ایک زیادہ نہ ایک کم اس میں کوئی مصلحت نہیں نظر آتی۔ جو چیز بظاہر معلوم ہوتی ہے یہاں وہ بھی نہیں ہے۔ یہ محض مشیت ہے۔ اس کو حق ہے جو چاہے سو کرے اور جتنی مرتبہ چاہے ایک آیت کو نازل فرمائے۔ اس کی وجہ بیان نہیں کرنی چاہیئے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ پاک کے فعل کے لئے مصلحت نہیں ہوتی۔ مصلحت کے دو جزو ہیں ایک مضرت کا دور کر دینا اور دوسرے فائدہ کا حاصل کرنا۔ برائی کا دور کرنا اور اچھائی اور سکھ حاصل کرنا۔ یہ دو مصلحتیں انسان کے عقل میں ہیں۔ ان دو کے علاوہ تیسری کوئی مصلحت عقل میں نہیں ہے۔ دکھ سے بچنا اور سکھ کا حاصل کرنا یہی مصلحت ہے اسی پہ عالم کی فلاح اور اعتبار ہے۔ اور ان دونوں باتوں پہ اللہ تعالیٰ ابتداً قادر ہے۔ اور اللہ پاک کو ان دو چیزوں کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اللہ پاک کا کوئی فعل اس حکمت اور مصلحت کے مطابق نہیں ہوگا جو انسانی عقل میں ہے بلکہ اس کا فعل محض بالمشیت ہوگا۔ اسی کا نام حکمت ہے۔ حکمت کے معنی فعل محکم اور مستحکم کے نہیں ہیں شہد کی مکھی کا چھتہ ایسا محکم اور مستحکم ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے ریاضی داں اس کے مخفی

سے قاصر ہیں۔ تو چاہیئے کہ شہد کی مکھی حکیم کہلائے۔ مکڑی ایسا باریک اور مضبوط گھر بناتی ہے کہ بڑے بڑے صناع اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں تو اس کو بھی حکیم کہا جانا چاہیئے۔ مگر اس کو حکیم نہیں کہتے۔ دفع مضرت اور جلب منفعت۔ یہ دونوں معنٰے حکمت کے نہیں ہیں بلکہ حکیم اس کو کہتے ہیں جس کی مرضی کے مطابق فعل ہو۔ بالکل نئی اور عجیب بات ہے۔ غور کریں کہ جب بنانے والا کوئی پرزہ بناتا ہے وہ اس کی مرضی کے مطابق بن جاتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے۔ اگر ذرا سی کسر رہ جاتی ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حکمت اور دانائی یہ ہے کہ بنانے والے کی مرضی کے مطابق چیز بن جائے۔ اب آپ اشیاء پر غور کریں۔ تو بے شمار اشیاء ایسی ملیں گی کہ جن کی کوئی حکمت اور مصلحت معلوم نہیں ہوتی۔ سمندر میں اس قدر جانور ہیں کہ انسان کے لئے ان کو پیدا کرنے کی کوئی مصلحت نہیں معلوم ہوتی۔ بالکل کسی قسم کی کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی۔ انسان کی عقل عاجز ہے تو یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ پاک کا فعل بالمصلحت ہے اور اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کا فعل بالمشیت ہے جو چاہے سو کرے۔

سب سے بڑی اور ہین بات یہ ہے۔ اس پر غور کریں کہ پہلے ایک شئے کو بنانا پھر بگاڑ دینا یہ بالکل عقل میں نہیں آتا۔ بنا کر پھر برباد کرنا۔ پیدا کرنے کے بعد پھر مار دینا۔ یہ بات بالکل عقل میں نہیں آتی۔ اس کو عقل پسند نہیں کرتی۔ عقل اس بات کو پسند کرتی ہے کہ پیدا ہی نہ کیا جائے۔ غور کریں عقل یہ کہتی ہے کہ پیدا ہو کر مر جانا یہ زیادہ برا ہے اس سے کہ پیدا ہی نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی کے لڑکا پیدا ہو۔ اور پھر مر جائے تو اس کو بہت رنج ہوتا ہے اور اگر وہ بالکل ہی پیدا نہ ہو تو اس کو

بالکل غم نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل اس کو پسند کرتی ہے کہ پیدا نہ ہو بمقابلہ
اس کے کہ پیدا ہو پھر مر جائے۔ ایک شخص مالدار ہو پھر وہ فقیر ہو جائے اس سے
بہت زیادہ اذیت ہوگی۔ اور اگر کوئی فقیر ہی شروع سے ہو مالدار نہ ہو تو اس کو پرواہ
نہیں۔ اس کو اذیت نہیں ہوتی تو عقل اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ بننے کے بعد
بگاڑ ہو۔ لیکن روز ہو رہا ہے۔ بنتا ہے بگڑتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے مرتا ہے تو کوئی مصلحت
اللہ کے فعل میں نظر نہیں آتی۔ سب بالمشیت ہو رہا ہے جو چاہے کہے جو چاہے
کرے۔ اس کے قول و فعل کیلئے کوئی مصلحت نہیں ہے اور دیکھئے قرآن کریم میں جو
سورتیں پہلے نازل ہوئی تھیں ان کو آخر میں رکھوایا اور جو سورتیں بعد میں نازل ہوئی
تھیں ان کو پہلے رکھوایا۔ تو اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال میں کوئی مصلحت نہیں
ہے۔ اور مصلحت سے میری مراد وہ مصلحت ہے جو انسانی عقل میں آ جائے۔ اب رہی کوئی
خدا کی مصلحت تو اس کو ہم نہ سمجھتے ہیں نہ جانتے ہیں۔ وہ الگ چیز ہے کہ وہ مصلحت کیا
ہے۔ اگر ہماری مصلحت اس کے ہاں مقدر ہے تو اس کے معنی مشیت ہی کے
ہوں گے۔ تو مفسرین کی جو رائے ہے وہ ظاہر نہیں ہے اور معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق
ہے۔ ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں وہ خدا ہے جو چاہے سو کرے۔ آخری آیت جو
نازل ہوئی وہ الیوم اکملت لکم دینکم ہے وہ چھٹے پارہ میں رکھ دی گئی
ہے۔ یعنی اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے ربط ہی نہیں ہے نہ شروع میں نہ آخر میں
نہ وسط میں ہے۔ یہ بات بالکل عقل میں نہیں آتی کہ اس میں کیا حکمت تھی۔ کہ جو
آیت آخر میں نازل ہوئی اس کا چھٹے پارہ میں اندراج ہو۔ بس اللہ پاک ہے جو
چاہے سو کرے۔ اس میں زبردستی کوئی عقل کی بات نکالنا اچھی بات نہیں ہے۔

کہیں چسپاں ہو جائیگی اور کہیں نہیں ہوگی۔ اور جہاں چسپاں ہو جائے گی وہاں بھی در حقیقت
یقینی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ مجتہد کا اجتہاد ظنی ہے یقینی نہیں ہے۔ جو کچھ مجتہد سمجھا ہے
پاک کی یہی مراد ہے۔ یہ یقینی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مراد نہ ہو کیوں کہ عوام الناس
پر عمل واجب ہے۔ اس لئے عمل تو کرنا پڑے گا۔ لیکن اعتقاد اور یقین اس رائے پر نہیں
ہوگا۔ مجتہد کی رائے پر تو عمل کر سکتے ہیں مگر اس پر ایمان نہیں لا سکتے۔ اعتقاد نہیں
سکتے۔ جب تک یقینی دلائل نہ ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب
ہو۔ للہذا تم ان سے مت ڈرو۔ یہ سب لغو باتیں کہتے ہیں۔ مجھ سے ڈرو۔ اس کے معنی
کہ ان کا کیا ہے۔ دو چار دس بیس مرتبہ کہیں گے پھر چپکے ہو رہیں گے۔ لیکن اگر میری
نافرمانی کی تو سیدھے دوزخ میں جاؤ گے۔ اور بڑی سخت سزا ملے گی۔ اس لئے تم کو مجھ
ڈرنا چاہیئے۔ اور کعبہ کا تعین اس لئے کر دیا کہ میں تمہارے اوپر اپنا احسان مکمل کر دوں
یہاں ابن حزم اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو دھوکہ لگا ہے کہ دین مکمل ہو گیا
اب اجتہاد کی ضرورت نہیں تو الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہونے کے
(مائدہ۔ ۳)
بعد کافی عرصہ تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ رہے اور برابر وحی آتی رہی
قرآن شریف نہ سہی دوسری وحی سہی۔ اور جس طرح قرآن شریف دین ہے اسی طرح
حدیث شریف بھی دین ہے۔ آخر وقت میں آپؐ فرما رہے تھے۔

لعن اللہ علی الیہود والنصاری اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد

(عن عائشہؓ) لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو
(مشکوٰۃ باب المساجد)
مسجد بنا لیا۔ یہ آپؐ پر وحی نازل ہوئی اور آخر وقت میں آپؐ نے فرمایا۔ اس سے
بھی آپؐ فرماتے رہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب تک زندہ رہے

سب دین تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کی تو تکمیل ہو گئی جب یہ آیت نازل ہوئی باقی
غیر مطبوع دین جو ہے وہ قیامت تک باقی رہے گا تو اس آیت میں جو اتمام ہے ، وہ
قرآن کا اتمام ہے یہاں جو اتمام نعمت ہے وہ قبلہ کا تعین ہے کہ اس کو میں نے تمہارے
لئے مکمل کر دیا یا یہ جواب ہے کہ مضارع کا صیغہ حال اور استقبال دونوں میں مستعمل ہے
تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ تم ان سے مت ڈرو
تاکہ میں آئندہ تمہارے لئے نعمت کو مکمل کرتا رہوں۔ یہ معنی بہت آسان ہو گئے اور
جب تم اس پر عمل کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔ ہدایت فرع ہے خوف الٰہی کی اور خوف کی
دو وجوہات ہیں۔ ایک تو اس کی ذات کا جمال اور کمال ہے اور ایک اس کی نافرمانی پر
عتاب اور عذاب مرتب ہوتا ہے۔ شیر سے انتقام کی وجہ سے نہیں ڈرتے بلکہ اس کے
ذاتی جلال سے ہیبت ہوتی ہے۔ اللہ پاک کا ذاتی جلال جو ہے اس سے خوف کھانا چاہئیے
اور وہ شدید العقاب ہے اس لئے وہ فرماتا ہے میری نافرمانی سے ڈرو دونوں صورتوں
میں ڈرنے کے قابل میں ہی ہوں۔ مجھ ہی سے ڈرو۔ اور کسی سے مت ڈرو۔ کیونکہ
دوسرا جو نقصان اور دکھ یا نفع اور سکھ پہنچائیگا اس کا پیدا کرنے والا بھی میں ہی ہوں دونوں کا
داعی میں ہی ہوں۔ اس لئے ہر حیثیت سے مجھ ہی سے ڈرنا چاہیئے۔

فلا تخشوهم

واخشوني ولاتم نعمتي عليكم ولعلكم تهتدون

كما ارسلنا فيكم رسولا منكم يتلوا عليكم

آیاتنا ویزکیکم ویعلّمکم الکتاب والحکمۃ ویعلّمکم مالم تکونوا تعلمون۔

اور یہ نعمت جو تمہارے اوپر مکمل کی ہے وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ تم پر ارسال کرنا ہے انبیاء کا۔ جس طرح تم پر انبیاء کو بھیجا۔ اسی طرح میں نے تمہارے لیئے کعبہ کو مقرر کر دیا۔ اور رسولؐ ایسا ہے جو تمہارے سامنے ہماری آئیں پڑھتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ تزکیہ کیا چیز ہے دنیا سے جو تعلق دل کو ہے اس تعلق کو توڑ دینا۔ دل کو دنیا کیطرف سے پھیر دینا۔ یہ بات بتا تا ہی نہیں بلکہ دل میں بٹھا دینا ہے اسطرح کہ دنیا سے رغبت بالکل باقی نہ رہے۔ تمہیں پڑھ کر سنایا۔ پھر تمہاری صفائی قلب کی۔ پھر تم کو کتاب اور حکمت سکھائی۔ کتاب کیا ہے۔ قرآن۔ اس کے دقائق اور عجائب سمجھائے۔ حکمت کے ذریعہ سے۔ اب حکمت کیا ہے۔ عقلی دلائل سے مقصود کا ثابت کرنا۔ اور غیر مقصود کا باطل کرنا۔ یعنی براہین اور عقلی دلائل کے استعمال کرنے کا طریقہ بتانا ہے۔
یہ عجیب بات ہے غور کریں اللہ پاک فرماتا ہے کہ حکمت سکھاتا ہے۔ وہ کیا ہے

ادعوالی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ (نحل - ۱۲۵) ان کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے بلا۔ (النحل ۱۶/۱۲۵) یعنی جو لوگ علماء فضلاء حکماء اور عقلاء ہیں ان کو دلائل یقینیہ سے اپنی طرف بلا۔
اور جو دوسرے درجہ کے درمیانی لوگ ہیں ان کو موعظہ حسنہ سے سمجھا۔ مواعظ حسنہ ان دلائل کو کہتے ہیں جو عام منافع کے پیش نظر پوری قوم نے تسلیم کر لیا۔ مسلمات عامہ کے

ایک تو وہ مسلمات ہیں جو یقینی ہیں جیسے آگ کو حرارت لازم ہے اور دوسرے یہ بات کہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ ماں باپ سے برا سلوک نہ کرو۔ سچ بولو۔ یہ مشہور باتیں ہیں تمام انسانوں نے مل کر ان باتوں کو جس کا دخل نظام عالم میں ہے ان کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس میں کسی مذہب کی قید نہیں ہے۔ لامذہب لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ سچ بولو جھوٹ نہ بولو وغیرہ۔ لیکن روزِ جزا کے منکر ہیں اس لئے ان کو نہ تو ثواب مقصود نہ خدا کی خوشی مقصود بلکہ اگر ماں باپ سے حسنِ سلوک اور اولاد سے محبت اور ان کی پرورش نہیں ہوگی تو نظامِ عالم بگڑ جائیگا۔ اس لئے انہوں نے ان باتوں کو تسلیم کیا ہے تاکہ نظامِ عالم باقی رہے ان کو مواعظ حسنہ اور مشہورات عامہ کہتے ہیں مثلاً ریاضی کے تین اصول ہیں۔ یہ اصل موضوع کہلاتے ہیں۔ استاد کے حسن ظن سے تسلیم کر لئے گئے ہیں تاکہ نظام اقلیدس باقی رہے ورنہ ثابت نہیں ہے۔ حساب اور الجبرا اسی کی فرع ہیں۔ صرف ایک شکل کا نتیجہ ہیں۔ سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے اس کو مان لیا ہے ورنہ دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ دلائل یقینیہ وہ ہیں کہ جن کے دونوں جزوں کا تصور آتے ہی ان کے درمیان نسبت کا یقین آ جائے جب آگ اور حرارت کا تصور آئے گا فوراً اس کا یقین ہوگا کہ آگ گرم ہے۔ سورج اور روشنی کا تصور آتے ہی یقین ہوگا کہ سورج روشن ہے۔ اور دونوں جزوں کے تصور کے بعد اگر ان کے درمیان نسبت کا تصور نہ ہو سکے۔ اور ویسے ہی تسلیم کر لیا جائے وہ مشہور چیز ہوتی ہے۔ یقینی نہیں ہوتی لیکن عام لوگ اس کو یقینی سمجھتے ہیں اور جو علماء کامل نہیں ہوتے وہ یقینی سمجھتے ہیں۔ جیسے کسی ظالم کے سامنے آپ کہیں کہ سچ اچھی چیز ہے تو وہ کہے گا یقیناً اچھی چیز ہے۔ صدق اور اچھائی کا جب تصور کرے گا تو دونوں کے تصور کو حکم لگانا لازم نہیں ہے۔ جس طرح آگ سے حرارت الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح اچھائی سچ

سے الگ نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہیں ہے۔ سچ سے اچھائی جدا ہو سکتی ہے لیکن نظامِ عالم میں اور مفادِ عالم بیشتر اس پر موقوف ہے۔ اس لئے سچائی کو اچھا مانا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کی جان بچانے کیلئے جھوٹ بولنا فرض ہے۔ اس لئے اگر وہ سچ بولے گا تو ابولہب سے بھی بدتر کافر ہوگا۔ اس سے پتہ چل گیا کہ سچ میں ذاتی حسن نہیں ہے۔ اگر ذاتی حسن ہوتا تو اس سے بھلائی جدا نہ ہوتی۔ اسی طرح کسی بے گناہ کو ظالم سے بچانے کے لئے اگر وہ بچ سکتا ہے تو جھوٹ بولنا اچھا ہے۔ اس وقت سچ بولنا بہت برا ہے۔ دلی میں ایک واقعہ ہوا۔ فساد کے زمانہ میں قرولباغ میں چند مسلمان لڑکیاں جان بچانے کے لئے ایک سکھ سہیلی کے گھر میں چلی گئیں اور اس سے کہا کہ تم دوستی کا حق ادا کرو اور ہمیں بچاؤ۔ اس لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ یہ میری سہیلیاں ہیں اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیں کہ یہاں نہیں ہیں۔ چنانچہ لوگ جب تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو اس نے جھوٹ بول دیا کہ یہاں کوئی مسلمان لڑکی نہیں ہے۔ پھر بعد میں اسے خیال ہوا کہ میں نے تو پاپ کیا کہ جھوٹ بولدیا تو وہ گاندھی جی کے پاس گیا اور سارا قصہ سنایا کہ مجھ سے یہ پاپ ہوگیا ہے۔ میں کیا کروں تو گاندھی جی نے کہا کہ بے شک تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے کہ جھوٹ بولا۔ حالانکہ اس نے بڑے ثواب کا کام کیا کہ بے گناہوں کی جان ظالموں کے ہاتھ سے بچالی۔ یہ قصہ مجھ سے بھیا جی میرٹھ والا نے بیان کیا۔ یہاں سچ بولنا گناہ تھا۔ اگر نبی کی جان بچ سکتی ہو تو جھوٹ بولنا فرض ہوجاتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر سچ بولے گا تو کافر ہوجائے گا۔ یہ اصولی بات ہے اس کو یاد رکھیئے۔

وجادلھم بالتی ھی احسن (نحل-۱۲۵) اور ان سے مجاہدہ کر مناظرہ کر مباحثہ کر۔ اس طریقہ کے ساتھ جو بہترین ہے۔ یہ مسلمات خاصہ ہوئے یعنی قوموں کے

خاص مسلمات ہوتے ہیں۔ انہیں پکڑ کر ان ہی پر الزامات لگائے جائیں جیسے یہودیوں سے آنحضرت صلعم نے فرمایا:

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرَاتِ فَاتْلُوْهَا

اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (عمران-۹۳)

لاؤ تورات کو اور پڑھو اس میں سے اگر تم سچے ہو۔ توریت ان کا مسلمہ تھا ان سے کہا توریت میں دکھاؤ اگر اس میں یہی لکھا ہے جو تم کہتے ہو۔ ان ہی کے مسلمات سے ان کا رد کر دینا۔ یہ تین طریقے اللہ پاک نے فرمائے تو نبی پہلا کام تو یہ کرے گا کہ اللہ کی آیات پڑھ کر سنا دے گا۔

دوسرا کام وہ یہ کرے گا کہ تمہارے نفس میں جو گندگی دنیا سے لگاؤ اور محبت کی ہے اس کو نکال دیگا۔ اور صحیح تعلق نفس کا اللہ کی ذات سے جوڑیگا کیونکہ وہ امر رب ہے اس کی تفسیر انشاء اللہ آئندہ کرونگا۔ اور کتاب سکھائے گا عجائب اور غرائب علوم تم کو سکھائے گا۔

سکندر اعظم نے استاد ارسطو سے ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک کتاب لکھدی۔ اس میں استدلال اور استنباط کا طریقہ لکھدیا۔ اس کتاب کا نام تعلیم اوّل رکھا۔ ابو نصر فارابی نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اس کا نام تعلیم ثانی رکھا۔ اب یہ دونوں کتابیں تعلیم اوّل اور تعلیم ثانی نایاب ہیں۔ کہتے ہیں شیخ الرئیس نے ان کو جلا دیا تاکہ ان کی کتاب رائج ہو جائے۔ اور شیخ الرئیس نے اس کا خلاصہ لکھا اور اس کا نام کتاب الشفاء رکھا۔ یہ بات ایک زمانہ سے مشہور چلی آرہی ہے کہ عقلی علوم حکماء نے درست کئے ہیں یہ غلط ہے بلکہ یہ تمام علوم آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور قرآن حکیم میں کما حقہ موجود ہیں

تمام انبیاء علیہم السلام نے یہ استدلال کا طریقہ سکھایا ہے۔ کہ اس طرح سے بات کو سوچو
غور کرو۔ طرح طرح سے قرآن شریف میں یہ بار بار آیا ہے کہ غور کرو، غور کرو اور غور کرنے
کا طریقہ بھی اس نے بتایا ہے۔ وما قدروا اللہ حق قدرہٖ تم نے اللہ کی ایسی قدر
(انعام ۔۹۱)
نہیں کی جیسی کرنی چاہیئے تھی۔ اذ قالو ما انزل اللہ علیٰ بشرٍ مّن شیئٍ
کب قدر نہیں کی۔ جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا یہ یہودیوں
نے کہا یعنی کوئی بشر منزل من اللہ نہیں ہے۔ یہ کلیہ ہے۔

قل من انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ (الانعام ۹۱)

اللہ پاک نے فرمایا۔ ان یہودیوں سے کہو کہ جس کتاب کو موسیٰ لائے تھے اس
کو کس نے اتارا تھا۔ اس بات کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ اللہ نے کوئی شے کسی بشر پر نہیں
اتاری۔ یہ کلیہ ہوا۔ اس کلیہ کا رد اس جزئیہ سے کیا کہ موسیٰ جو کتاب لائے تھے وہ کس نے
اتاری تھی۔ کیوں کہ توریت جو ہے وہ منزل من اللہ ہے تو اس سے نتیجہ یہ نکل آیا کہ
موسےؑ بشر نہیں ہیں اور یہ غلط ہے۔ لہٰذا یا وہ کلیہ غلط ہے یا یہ جزئیہ غلط ہے لیکن
موسےؑ پر توریت نازل ہوئی یہ غلط نہیں ہے۔ اس پر دونوں فریق متفق ہیں۔ تو پتہ
چلا کہ وہ کلیہ غلط ہے جو یہودیوں نے پیش کیا ہے۔ یہی طریقہ استدلال ہے یہ شکل
ثانی ہے۔ مہندس کی شکل اوّل موقوف ہے۔ شکل ثانی پر تو وہ بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگئی
تمام اشکال اسی سے ثابت ہوتے ہیں اس لئے پوری منطق اسی سے ثابت ہوگئی۔ قرآن
شریف میں جگہ جگہ یہ استدلال ہے۔ قرآن کی زبان میں اسے میزان کہتے ہیں اسی سے
سیکھ کر منطق والوں نے بھی اس کا نام میزان ہی رکھا ہے تو نظری استدلال کرنے کا طریقہ
نبی بتائے گا کہ اس طرح غور کرو ورنہ وہ کہہ سکتا ہے۔ مجھے غور کرنا نہیں آتا کس طرح

غور کرو۔ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون اور تم کو وہ سکھائے گا وہ باتیں
جن کا تم کو علم نہیں ہے۔ برابر چلا آرہا ہے۔ آیات پڑھ کر سنائے گا۔ قرآن شریف پڑھکر
سنائیگا۔ قرآن شریف سکھائے گا۔ حکمت سکھائے گا۔ پھر وہ چیزیں سکھائے گا کہ جس کا
تمہیں علم نہیں ہے۔ تو یہ کونسی چیزیں ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو قرآن شریف کے علاوہ
رسول اللہ صلعم پر وحی ہوئیں یعنی وحی کے ذریعہ سے جو علوم حاصل ہوئے ہیں تم کو وہ بھی
سکھائیں گے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ حدیث رسول اللہ صلعم بھی دین ہے اور حجت ہے
ورنہ مالم تکونوا تعلمون کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن سکھا دیا۔ حکمت سکھا دی۔
تزکیہ نفس کا طریقہ سکھا دیا۔ اب کیا باقی رہ گیا۔ نہیں سنت رسول باقی رہ گئی۔ وہ بتانے کا
تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ قرآن کی سب باتیں تمہیں معلوم ہوگئیں۔ حکمت کی باتیں معلوم ہوگئیں
تزکیہ نفس کی باتیں معلوم ہوگئیں۔ اب قرآن کے علاوہ جو اور باتیں وحی سے ان کو معلوم ہوئی ہیں وہ
تم کو بتا دینگے کیونکہ نبی تو مامور ہے بتانے پر۔ یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک اے رسول جو تم پر نازل ہوا ہے
تمہارے رب کی طرف سے وہ سب لوگوں کو بتلا دو۔ تو جو کچھ اس کو معلوم ہوا ہے اس کی
تمام سب کی تبلیغ کر دیگا۔ روکے گا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے
وہ بیان ضرور کر دیگا۔ ایک آدمی کو آپ کتنا سمجھائیں کہ دیکھ یہ نہ کر اس سے تجھے نقصان
پہنچ جائے گا مگر وہ نہ مانے اور جب نقصان پہنچ جائے تب وہ سمجھ جائے گا کہ ہاں
آپ ٹھیک کہتے تھے۔ ماں باپ کتنی محبت اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔ اولاد بھی جانتی ہے
کہ ماں باپ اس سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن محبت کا صحیح علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود
صاحب اولاد ہوتے ہیں۔ تو جو شخص حضورؐ کی باتیں سنے گا۔ وہ کان تک رہیں گی یا ممکن ہے
دل تک بھی کان کے ذریعہ پہنچ جائیں۔ لیکن صحیح معرفت اس کو اس وقت ہوگی جب وہ

سنت پر عمل کریگا۔ اور اللہ پاک نے فرمایا:۔

فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون (البقرۃ ۱۵۲)

تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔ اس آیت کی مختلف تفسیریں بیان کی ہیں علماء نے۔ تم مجھے یاد رکھو طاعت کے ساتھ میں تمہیں یاد رکھوں گا رحمت اور احسان کے ساتھ۔ تم یاد کرو مجھ کو دعا کے ساتھ میں یاد رکھوں گا تم کو قبولیت کے ساتھ۔ تم یاد رکھو مجھ کو خلوت میں تو میں تم کو یاد رکھوں گا بیابانی میں۔ تم مجھ کو یاد رکھو گے دکھ میں تو میں تم کو یاد رکھوں گا سکھ میں۔ تم مجھ کو یاد رکھو دنیا میں تو میں تم کو یاد رکھوں گا عقبیٰ میں۔ تم مجھ کو یاد رکھو ابتداء میں تو میں تم کو یاد رکھوں گا خاتمہ کے وقت۔ اسی طرح اور بھی تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ اصل بات میں آپ کو بتاتا ہوں جس طرح آپ مصافحہ کریں کسی شخص سے۔ تو آپ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے لگ جائیگا۔ اور اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے لگ جائے گا۔ اسی طرح آپ کا دل اس سے لگ گیا تو اس کا دل آپ کے دل سے لگ گیا۔ قصہ ختم جس کا دل خدا سے لگ جائے گا خدا اس کے دل سے لگ جائے گا بالکل حسی بات ہے۔ واشکروا لی ولا تکفرون میرا شکر ادا کرو اور ناشکرے نہ بنو۔

شکر کیا چیز ہے۔ اس کو سمجھ لو۔ شکر کی تفسیر علماء نے یوں بیان کی ہے کہ شکر کہتے ہیں اس ثنا کو جو منت اور احسان کے جواب میں کی جائے۔ کوئی آپ کے ساتھ احسان کرے اور آپ اس کی تعریف کریں حمد کریں، ثنا کریں۔ اس تعریف کو شکر کہیں گے۔ اگر آدمی جان لے کہ یہ نعمتیں منجانب اللہ ہیں تو یہ خدا کا شکر ہے۔ میں نے امام رازی کی کتابوں میں دیکھا ہے۔ تمام علماء اب تک یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ شکر عبادت ہے

یہ عبادت نہیں ہے۔ بھول ہوگئی۔ غلط ہے۔ شکر عبادت نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- ولا یشرك بعبادة ربه احداً (الکہف ۱۲/۱۱۰) مت شامل کرکسی کو عبادت میں اپنے رب کے ساتھ۔ یعنی عبادت میں شرک کرنا کفر ہے۔ اس بات کو سب مسلمان جانتے ہیں کہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک کریگا تو یہ کفر ہے لیکن شکر میں شرکت واجب ہے فرض ہے اور عبادت میں شرکت حرام ہے۔ تو شکر کیسے عبادت ہو سکتا ہے۔ اَنِ اشکر لی ولوالدیك (لقمان ۱۴/۱۴) شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔ والدین کی عبادت کو نہیں کہا۔ تو معلوم ہوا کہ شکر اور چیز ہے اور عبادت اور چیز ہے۔ یہ بالکل نئی بات ہے جو اللہ پاک نے مجھے بتائی غور کرنے سے شکر ایمان کا جزو بنے گا۔ ورنہ اس کا تعلق علم معاملہ سے ہے عبادت سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہترین معاملہ جو ہے اس کا نام شکر ہے۔ اس نے عنایت کی۔ اور سب سے بڑی عنایت جو ہے وہ یہ حیات ہے۔ اس عنایت سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ مال وجاہ تو ایسی چیز ہے کہ کسی کو ملتی ہے کسی کو نہیں ملتی۔ سکھ ایسی چیز ہے کسی کو ملتی ہے کسی کو نہیں ملتی۔ لیکن حیات اور وجود سب کیلئے ہے۔ اس کی تو رحمت اور نعمت عام ہے۔ اس لئے کہ حیات کے بغیر جتنی بھی نعمتیں ہیں سب بیکار ہیں کیوں کہ مرنے کے پاس جتنی نعمتیں رکھ دیں سب بیکار ہیں۔ کل نعمتیں حیات کے بغیر بیکار ہیں۔ اور حیات بغیر کل نعمتوں کے باکار ہے۔ کیوں کہ نہایت بھوکا آدمی تمام نعمتوں سے بھرے دسترخوان پر بیٹھا ہو۔ اور یکا یک جان کا خطرہ لاحق ہو۔ فوراً سب نعمتوں کو چھوڑ چھاڑ جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ حیات سب سے قیمتی چیز ہے تو اس نے احسان عظیم کیا کہ لا شے کو شے بنا دیا۔ معدوم کو موجود بنا دیا۔ اس کا تصور جب کرے گا کہ اس کا کرنے والا صرف وہی ہے اور اسی کی طرف اس کی نسبت ہے بس اسی کا نام شکر ہے۔ یہ

معاملہ ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کیا تم اس معاملے کو لوٹا دو۔ میں نے تم کو جو نعمت دی ہے جوں کی توں میرے اوپر نثار کر دو۔ جو قوی اللہ پاک نے دیئے ہیں سب اسی میں صرف کر دو۔ آپ نے دعوتوں میں دیکھا ہو گا کہ جو لوگ دور بیٹھے ہوتے ہیں وہ خوب سیر ہو کر کھاتے رہتے ہیں لیکن جو بادشاہوں اور وزیروں کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی چائے کی پیالیاں جوں کی توں بھری رکھی رہتی ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ بادشاہ اور وزیر کی ذات کی طرف ہوتی ہے۔ نعمت کی طرف بالکل التفات نہیں کرتے۔ اسی طرح منعم کی ذات کی طرف نظر ہوتی ہے۔ نعمتوں کی طرف نظر نہیں ہوتی۔ یہ حقیقی شکر ہے اس لئے اللہ پاک نے فرمایا کہ تم شکر کرو اور ناشکری مت کرو۔ اس کے علاوہ جتنے بھی عبادات و معاملات ہیں کسی عبادت کے اچھا کرنے پر اضافہ نہیں ہے کسی معاملہ کے اچھا کرنے پر اضافہ نہیں ہے۔ نماز پڑھو گے اس کا مقررہ معاوضہ مل جائے گا۔ روزہ رکھو گے اس کا مقررہ معاوضہ مل جائے گا جس کا حق جو کچھ ہے وہ ادا کر دو۔ لوگوں کے ساتھ احسان کرو اس کا جو مقررہ پھل ہے وہ مل جائے گا لیکن یہ جو معاملہ شکر کا ہے اس کے لئے خصوصیت ہے۔ (ابراہیم ۱۳)

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید

یہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا ہے کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا تو میں ان نعمتوں میں اضافہ کر دوں گا۔ صرف یہی ایسی چیز ہے جس پر اضافہ کا وعدہ کیا ہے۔ ورنہ اور کسی عبادت یا کسی معاملہ پہ وعدہ اضافہ کا نہیں ہے۔ یہ بہترین چیز ہے ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ یہی چیز اگر اللہ کی طرف منسوب ہو تو یہ حمد ہے خدا کی تعریف کرے۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ مع الفاظ کے اس کو ادا کرے اب حمد اور شکر کا فرق سمجھ لیں۔ حمد کی تعریف علمائے محققین نے یہ کی ہے کہ زبان سے

ثنا اور تعریف کرنی کسی اختیاری خوبی پر۔ کسی میں اختیاری خوبی ہو اس کی تعریف کی جائے تو اس تعریف اور مدح کا نام حمد ہے۔ امام فخرالدین رازی نے فرمایا کہ نعمت پر کسی کی تعریف کرد یہ شکر ہے اور نعمت تم کو پہنچے یا نہ پہنچے پھر تم اس کی تعریف کر دیہ حمد ہے آئمہ متقدمین نے یہ دو تعریفیں کی ہیں۔ پہلی تعریف تو یوں غلط ہے کہ اللہ پاک کی ذات اور صفات قابلِ حمد ہیں اور اس کے اختیار میں نہیں ہیں یا اللہ تعالیٰ کی ذات۔ اور صفات اور کمالات سب غیر اختیاری ہیں وہ کسی کے اختیار سے پیدا نہیں ہیں۔ نہ خود اس کے نہ کسی اور کے یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اس میں تاثیر کر سکے۔ وہ سب از خود ہیں للہذا وہ تعریف ناقص ہے۔ بندہ دو کلام جو اللہ پاک نے اپنے کلام میں جو اصول بتائے ہیں اگر ان کا صحیح استعمال نہیں کرے گا تو ہمیشہ غلطی کرے گا۔

دوسری تعریف یوں غلط ہے کہ حاتم کی سخاوت اور رستم کی شجاعت سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مگر ہم برابر ان کی تعریف کرتے ہیں۔ استاد سے ہمیں فائدہ پہنچا ہم ان کی تعریف کرتے ہیں۔ تو چاہیئے کہ یہ دونوں حمد ہوں مگر یہ حمد نہیں ہیں۔ پھر حمد کیا چیز ہے میں کہتا ہوں ایسی تعریف کہ جس تعریف پر زیادتی نہ ہو سکے۔ بس یہ تعریف حمد ہے کسی شے کو۔ لیں اس سے بہتر دوسری شے ہوگی یا ہو سکے گی۔ اب ایک ایسی شے ہے جس سے بہتر کوئی شے نہیں اس کی جو تعریف ہوگی اس سے زیادہ کسی کی تعریف نہ ہوگی۔ نہ ہو سکے گی۔ یہی تعریف حمد ہے اور یہ جان لینا کہ جو کمالات اس ذات پاک کے ہیں اس سے بہتر کمالات نہیں ہو سکتے ان کمالات پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا جان لینا ہی شکر ہے۔ بندہ کو چاہیئے کہ اللہ پاک کی حمد و ثنا کرے۔ اور شکر کرے ناشکری نہ کرے۔ اللہ پاک آپ کو اور بندہ کو دونوں کو توفیق دے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥
(بقرہ - ۱۵۴)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں ان کو مت کہو کیا مت کہو ؟" اموا
یعنی ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم کو ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے منافقین
کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنی جانوں کو گنواتے ہیں۔ اور ناحق مرتے ہیں بعض تفسیر میں یہ بھی
آیا ہے کہ خود مسلمان آپس میں کہتے تھے کہ فلاں مر گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ شہ
کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ایسی حیات ہے
جو تمہارے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی۔

یہاں حیات کی علت اللہ کی راہ میں مرنا بتائی ہے۔ ہم کو صرف موجود حیات
شعور دیا گیا ہے۔ یہ حیات حس و حرکت کا نام ہے۔ جس جسم میں حس و حرکت ہوتی
اس کو حی کہتے ہیں۔ اور جس جسم میں حس و حرکت نہیں ہوتی اس کو مردہ کہتے ہیں۔
اسکے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس حیات کے ساتھ حی ہیں ج
کو تم حیات سمجھتے ہو مگر تمہیں اس کا پتہ نہیں دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ا
حیات کے ساتھ حی ہیں جس حیات کو نہ تم جانتے ہو نہ سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ ہم
صرف ایک ہی حیات کو جانتے ہیں نا۔ حس و حرکت والی حیات کو دوسری کسی قسم
حیات کو نہیں جانتے اور نہ ہمیں اسکا شعور دیا گیا ہے۔

مفسرین کی پانچ جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ حیات مجاز
ہے۔ دراصل وہ زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ چونکہ ان کے کارنامے ایسے ہیں۔ کہ ان کی یاد
دن باقی رہے گی۔ بس یاد کے باقی رہنے کو مجازاً حیات کہا ہے۔

دوسری جماعت نے یہ کہا کہ مردہ کو نہلا کر دفن کیا جاتا ہے اور شہدا کو بغیر نہ
دفن کیا جاتا ہے اسی لئے ان کو مجازاً زندہ کہا گیا ہے۔

تیسری جماعت کہتی ہے کہ وہ حقیقتاً زندہ ہیں۔ اسی ہماری جسمانی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں۔

چوتھا گروہ یہ کہتا ہے کہ جسمانی نہیں بلکہ وہ روحانی طور پر زندہ ہیں۔

پانچواں گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ نہ روحانی طور پر زندہ ہیں نہ جسمانی طور پر زندہ ہیں بلکہ وہ عنقریب زندہ ہوں گے اور ان کو ثواب اور نعمتیں ملیں گی۔ یہ گروہ معتزلہ کا گروہ کہلاتا ہے۔ اسی لئے وہ عذاب قبر اور ثواب قبر کے منکر ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے دونوں گروہ حیات کے قائل ہیں۔ ایک روحانی حیات کا قائل ہے۔ دوسرے جسمانی حیات کے قائل ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آئندہ زندہ ہوں گے ان کی دلیل یہ آیت ہے کہ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۔ نیک بخت لوگ بہت آسائش میں ہیں۔ حالانکہ وہ اب نہیں ہیں بلکہ روز جزا ہوں گے۔ اسی طرح یہ آیت کہ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۔ وہ جہنم میں اب نہیں ہیں روز جزا ہوں گے۔ قرآن شریف میں اس قسم کی کثیر آیات ہیں ان سے استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح فرمادیا کہ وہ جنت میں ہیں حالانکہ وہ ابھی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمادیا کہ وہ "حی" ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت "حی" نہیں ہیں بلکہ وہ حی مستقبل میں ہوں گے۔

مگر ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے بلکہ غلط ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا بل احیاءٌ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اسی وقت زندہ ہیں۔ اس کے آگے بھی اسی مضمون کی آیت ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (آل عمران ۱۶۹، ۱۷۰) جو راہ خدا میں قتل کر دیئے گئے ان کو مردہ گمان مت کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ یُرْزَقُوْنَ۔ فَرِحِیْنَ ان کو روزی بھی پہنچتی ہے اور شاداں اور فرحاں ہیں۔ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ جو اب تک نہیں ملے ہیں۔

ان سے ان کی طرف سے بہت خوش ہیں اس لئے کہ جب ان سے کہا جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو تو وہ کہیں گے یا اللہ ہم کو دوبارہ بھیجدے کہ ہم دوبارہ شہید ہوں۔ اور کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا جو ہمارا حال ہے کہ خدا نے ہم کو نعمتیں اور راحتیں دی ہیں خدا نے فرمایا کہ اچھا میں ان کو خبر دے دیتا ہوں کہ تم کتنے راضی خوشی ہو۔ اور یہ آیت آل عمران میں ہے۔ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالفعل زندہ ہیں۔ اس لئے ان کا یہ استدلال کہ وہ فی الحال زندہ نہیں ہیں بلکہ آئندہ زندہ ہوں گے صحیح نہیں ہے۔

جو لوگ جسمانی حیات کے قائل ہیں ان کی دلیل احادیث ہیں۔ جیسے فرمایا رسول اللہ صلعم نے قبر ایک باغ ہے جنت کے باغوں میں سے یا گڑھا ہے جہنم کے گڑھوں میں سے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جسمانی ہی حیات ہے۔ عذاب اور ثواب دونوں جسمانی طریقہ پر ہی ہو رہا ہے۔

دوسرا گروہ جو روحانی حیات کا قائل ہے وہ کہتے ہیں نہیں یہ حالات روح پر گذرتے ہیں۔ کیونکہ جسم تو فنا ہو جاتا ہے۔ اور روح باقی رہتی ہے۔ روح کے باقی رہنے کے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنی روحوں کو ہمارے حوالے کرو۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ ط آج کے دن تمہیں بڑا رسوا کن (انعام - ۱۰) عذاب دیا جائے گا۔ جہنم کی جو وعید دی گئی ہے گناہگاروں کو قیامت سے پہلے عذاب ہوگا تو ظاہر ہے نیکو کاروں کو قیامت سے پہلے ثواب ہوگا۔ عذاب و ثواب ہو نہیں سکتا جب تک حیات نہ ہو۔ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (نوح - ۲۵)

حضرت نوحؑ کی امت کے بارے میں کہا کہ ان کو غرق کر دیا گیا اور جہنم کی آگ میں داخل کر دیا گیا۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا فرعون والوں کو صبح و شام (مومن - ۴۶) آگ پیش کی جاتی ہے۔ جب عذاب قیامت سے پہلے ہو رہا ہے تو ثواب بھی قیامت سے پہلے ہوگا۔ یہ کہنا کہ وہ ابھی زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ قیامت میں زندہ ہوں گے۔ یہ اسی

لئے غلط ہے کہ قیامت میں زندہ ہونے کا تو علم ہے مگر یہ ایسی حیات ہے جس کا شعور نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ قیامت والی حیات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ قیامت میں تو ہر مردہ کو حیات ملے گی پھر شہدار کی تخصیص کیا ہوئی۔ لا تحسبن کا لفظ ایسی حیات پر دلالت کر رہا ہے جس میں شبہ ہو سکتا ہے۔ قیامت کی حیات پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ لہٰذا فی الحال وہ "حی" ہیں۔ رہی بات حیات روحانی اور حیات جسمانی کی تو انہوں نے کہا کہ ہم نے مردہ کے جسم کو گلتے سڑتے دیکھا ہے۔ جانوروں کو کھاتے دیکھا ہے تو جسمانی عذاب مشاہدہ کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اللہ تعالےٰ کی ذات قادر مطلق ہے۔ اس کو قدرت حاصل ہے کہ ایک ایک جز کو زندہ کر دے اور ان کو پورا پورا عذاب دے۔ لفظ شعور ان سب باتوں کو رد کرتا ہے کیونکہ یہ حیات ان تمام حیاتوں سے مختلف ہے جن کا شعور ہم کو ہے۔

روحانی حیات کی بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اسی حیات میں بھی تخصیص نہیں ہے۔ مومنین اور اولیا اللہ کی روحوں کو بھی یہ حیات حاصل ہے۔ سب کو جزا مل رہی ہے۔ سب خوش ہیں اور امن میں ہیں۔ اور یہ شعور میں موجود ہے شہدار کی تخصیص سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب غور کیجئے وہ کونسی شے ہے جو شہدار کو حاصل ہے اور غیر شہدار کو حاصل نہیں ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ مقتول فی سبیل اللہ مردہ نہیں ہے۔ اور مقتول مردہ ہے تو قتل فی سبیل اللہ دراصل علت ہے حیات کی۔ یہ علمی اصول ہے کہ نسب پر جو بھی حکم مرتب ہوگا اس کی علت وہ قید ہوگی جس کے ساتھ وہ مقید ہے۔ یہاں مقتول مقید ہے فی سبیل اللہ کے ساتھ تو حیات کی علت فی سبیل اللہ ہونا ہوا۔ اب کوئی کام آپ فی سبیل اللہ کریں تو یہ فی سبیل اللہ کرنا ایک حیات ہے۔ اور وہ حیات

ایسی ہے کہ آپ کو اس کا شعور نہیں ہے۔ یہ حیات حس وحرکت جو ہے یہ مانع ہے اس حیات
کے شعور سے۔ تو فرمایا کہ فی سبیل اللہ مرنا حیات کی علت ہے۔ اسی لئے فرمایا اِنَّ صَلَاتِیْ
وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (انعام ۱۶۲) اے رسولؐ اعلان کر دو کہ تمہاری نمازیں
عبادتیں حیات اور ممات سب رب العالمین کے لئے ہیں۔ فی سبیل اللہ ہیں۔ اور نبی کا
ہر عمل فی سبیل اللہ ہے اور ہر عمل فی سبیل اللہ کے ساتھ حیات ہے تو نبی اتنی حیاتوں کے
ساتھ "حی" ہوگا کہ اس کا تصور نہیں ہو سکتا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ
مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ
الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ
وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ (بقرہ-۱۵۵-۱۵۶)

ہم تم کو آزمائیں گے۔ پہلے فرمایا نافرمانی نہ کرو بلکہ شکر کرو۔ اس آیت کا تعلق وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ سے ہے۔ ہم تم کو ان میں سے کس کس شے سے آزمائیں گے۔ وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہے۔ اور بہت سی بداعمالیوں کو تمہاری اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ اب یہاں ایک دقت ہے کہ اکثر مصائب اور آلام اکابرین پر آتے ہیں قَالَ أَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ يُبْتَلَى الْعَبْدُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ (ترمذی) زیادہ مبتلائے مصیبت جو ہوتے وہ انبیاء ہوتے۔ پھر اولیاء پھر جیسے اکثر اکابر مبتلائے مصیبت ہوتے ہیں یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر جو یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں کیا یہ ان کے ہاتھ کی کمائی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو مبتلائے مصیبت کر دیتا ہے۔ اور آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ گناہوں کی وجہ سے آرہی ہیں۔ تو اس مضمون کو آپ سمجھ لیں کہ انبیاء اولیاء بزرگوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے۔ فرمایا۔ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ صحیح بات یہ ہے کہ میری نماز میری قربانی میری زیست میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ عوام الناس کو جو مصیبت آتی ہے وہ ان کی بداعمالی کی جزا ہوتی ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام جو تکالیف ہوتی ہیں وہ ان کے عمل کی جزا نہیں ہوتی

بلکہ وہ خود ایک عمل ہوتا ہے۔ جس کی جزا ان کو ملتی ہے۔ جس طرح ان کو عبادات کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کی جزا ان کو ملتی ہے اسی طرح یہ مصائب ان پر آتے ہیں۔ اور حکم ہوتا ہے کہ ان کو برداشت کرو۔ تو یہ ان کا عمل ہوتا ہے۔ اس کی بھی جزا ملتی ہے یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا اور آپ کے سامنے بیان کر دیا۔ اور اس بات کی دلیل کہ یہ ان کے اعمال ہیں۔ یہ آیت ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ ۔ ۔ ۔ ۔ الْعَالَمِیْنَ۔ (انعام - ۱۶۲) موت میں بھی تکلیف ہے بڑی سخت۔ بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم کے جنازہ پر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر اسباب موت اور امراض موت یہ سب بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ سب اولیاء اور انبیاء کو ہوتے ہیں۔ تو یہ حقیقت میں جزائیں نہیں ہیں۔ اعمال ہوتے ہیں۔ فاسقوں اور فاجروں کے یہاں ان کا فسق و فجور ان تکالیف کا سبب ہوتا ہے۔ اور انبیاء اور اولیاء کے یہاں یہ جزا نہیں ہیں بلکہ یہ خود اعمال ہیں اور عبادات ہیں۔ جس طرح نماز روزہ حج زکوٰۃ عبادتیں ہیں اور ان کے ساتھ وہ مکلف ہیں اسی طرح وہ ان مصیبتوں کے ساتھ مکلف ہیں۔ ان مصائب کی ان کو ایسی ہی جزا ملے گی۔ جیسی ان عبادتوں پر جزا ملے گی۔ بالکل نئی اور انوکھی بات ہے۔ اب رہ گئے بچے ان کو کیوں تکلیف پہنچتی ہے۔ ان کی تکلیف نہ عمل ہے نہ جزا ہے۔ نہ ان کے گناہ ہیں۔ جن کی یہ جزا ہو نہ عمل ہے کہ اس کی جزا ان کو ملے گی بلکہ یہ محض قہر ہے۔ قہر کے معنی یہ ہیں کہ بلا وجہ اور بغیر کسی سبب اور داعی کے تاثیر کر دینا۔ یہ مجرد مشیت الٰہی سے ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے مبتلائے تکلیف کر دیتا ہے۔ جانوروں کو بچوں کو: اور یہ لکھا ہوا ہے،

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ (حدید ۲۲) نہیں پہنچتی زمین پر نہ تمہاری جانوں پر کوئی مصیبت ایسی نہیں آتی جو کتاب میں درج نہیں ہے۔ یہ محض

مشیت ہے اور یہ سب مکلفین میں ہے۔ نیکوں کا دکھ ان کا عمل ہوتا ہے۔ اور بدکاروں کا دکھ ان کے برے اعمال کی جزا ہوتی ہے۔ یہ تھوڑے اعمال کی جزا ہوتی ہے۔ اکثر کو وہ معاف کر دیتا ہے۔ اب ایک بات اور ہے۔ اس پر غور کریں موسیٰ علیہ السلام سے اللہ پاک نے فرمایا۔ جب وہ ڈرے کہ رسول میرے پاس ڈرا نہیں کرتے۔ تو خدا کا جتنا بھی قرب ہوگا۔ اتنا ہی مصیبت سے بُعد ہوگا۔ اور جتنا راحتوں میں مبتلا ہوگا اتنا ہی خدا سے بعد ہوگا۔ میں ایک مرتبہ لیاقت علی خاں کی پارٹی میں شریک ہوا۔ جب دعوت ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جو لوگ ان کے قریب چاروں طرف بیٹھے تھے۔ وہ ان سے باتوں میں مشغول تھے اور ان کی پیالیاں بھری کی بھری رکھی تھیں۔ مگر جو لوگ دور تھے وہ مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور خوب کھا رہے تھے۔ تو جتنے مقرب ہوتے ہیں وہ دنیاوی راحتوں اور نعمتوں سے محروم رہتے ہیں اور جتنے بعید ہوتے ہیں۔ اتنے راحتوں اور نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ جتنا دنیوی راحتوں سے قریب ہوگا اللہ سے اتنا ہی بُعد ہوگا۔ اور جتنا راحت دنیوی سے دور ہوگا اللہ تعالےٰ سے قرب ہوگا۔ جتنا اللہ پاک سے قریب ہوگا۔ دنیوی راحتوں سے دور رہے گا۔ اور جتنا خالق تعالیٰ سے بعید ہوگا دنیوی راحتوں سے اتنا ہی قریب ہوگا۔ آج کی جو آیت ہے یہ اس اصول کی دلیل ہے۔ اور یہ بات جیسا کہ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ بچوں کو اطفال کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ پچھلے گناہوں کی جزا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ فلسفہ زیادہ تر ہندوستان کے فکار نے خصوصاً اہل سومنات نے اختیار کیا یہ لوگ آواگون یا تناسخ کے زیادہ قائل تھے آواگون بالکل غلط اور جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو نہ مرے اور کوئی مرنے والا ایسا نہیں ہے جو کبھی نہ کبھی

کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آن واحد میں مرجاتا ہے اور معلوم نہیں ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل اس ایک آن میں اتنی تکلیف ہو جاتی ہے۔ جتنی ایک ماہ میں ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ باریک جارجیٹ کے کپڑے کو کانٹوں پر ڈال کر زور سے جھٹکا دینے سے جھیر جھیر ہو جائے گا۔ اسی طرح لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ قلب فیل ہو جانے سے آدمی بغیر تکلیف کے فوراً مر گیا۔ لیکن حقیقت میں آسانی سے نہیں مرا۔ بلکہ آن واحد میں تمام کرب مجتمع ہو کر اس پر لوٹ پڑے۔ اور یہ اذیت اتنی شدید ہوتی ہے۔ جو ایک ماہ کی معمولی تکلیف میں مجموعی طور پر ہوتی ہے۔ گو وقت کم لگتا ہے مگر تکلیف سب کو ہوتی ہے۔ تو اگر تکلیف کا سبب محض بداعمالی ہوتا تو جہاں میں کوئی دکھ سے خالی نہیں یعنی سب بدعمل ہو گئے۔ سارا عالم بدعمل ہو گیا اور ان لوگوں کے نزدیک عالم ازلی ہے۔ تو ازل سے ابد تک سارا عالم شر ہی شر ہو گیا۔ خیر کا پتہ نہ رہا تو عالم شر محض ہو گیا۔ یہ بداھتاً عقل کے خلاف ہے۔ کہ عالم شر محض ہو۔ یہ ناجائز ہے۔ جب شر محض نہیں ہو سکتا اور تکالیف برابر ہو رہی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تکالیف کا سبب محض بداعمالی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بداعمالی کی وجہ سے انسان جانوروں میں منتقل ہوتا ہے۔ آدمی یا جمادات میں یا نباتات میں یا انسان کے دوسرے اجسام میں۔ مرنے کے بعد انسان کے جسم میں منتقل ہونے کو نسخ۔ حیوان میں منتقل ہونا مسخ۔ نباتات میں فسخ اور جمادات میں منتقل ہونا رسخ کہلاتا ہے۔ یہ چار طریقے ہیں منتقل ہونے کے جو ان کے خیال میں ہیں۔ ان لوگوں نے اس کے دلائل دیئے ہیں لیکن وہ سب غلط ہیں۔ تناسخ کے رد میں ارسطو کی دلیل جو شفا میں نقل کی گئی ہے یہ ہے کہ بدن کی طبعیت کا تقاضہ یہ ہے کہ حدوث نفس ہو۔ تو یہ ایک تو جسم کے تقاضہ کے

مطابق نفس ہوگا اور ایک دوسرے انسان کے جسم کو چھوڑ کر روح آئے گی تو ایک جسم میں دو نفس ہو جائیں گے۔ اور ایک بدن میں دو روحوں کا ہونا محال ہے اس لئے تناسخ محال ہے لیکن یہ دلیل غلط ہے اول تو طبیعت کوئی شے ہے یہ ثابت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ طبیعت اس قوت بے شعور کا نام ہے جس سے ایک ہی قسم کے فعل سرزد ہوں یہ حکمار کی اصطلاح ہے اور ان کے یہاں اس کے یہ معنی ہیں جو میں نے بیان کئے مثلاً بھاری چیز کو اگر کوئی شے روکنے والی نہ ہو تو نیچے ہی چلتی چلی جائے گی۔ اب یہ ابد تک نیچے ہی جاتی رہے گی۔ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو اس قوت کو طبیعت کہتے ہیں۔ اور قوت بے شعور جس سے مختلف قسم کے فعل سرزد ہوں وہ قوت نباتی کہلاتی ہے۔ کہ ایک شاخ ادھر جا رہی ایک ادھر جا رہی ہے۔ ایک اوپر دوسری نیچے جا رہی ہے۔ اور وہ قوت بے شعور جس سے ایک ہی قسم کے فعل سرزد ہوں اسکو جمادی کہتے ہیں۔ کہ ایک ہی فعل کئے چلا جا رہا ہے۔ اور بے شعور ہے۔ حرکت مستدیرہ ہے۔ وہ جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔ دائمی ہے۔ اور طبیعت ذی شعور جس سے مختلف قسم کے فعل سرزد ہوں وہ نفس حیوانی ہے۔ یہ چار قسم کی طبیعتیں تسلیم کی گئی ہیں۔ حکمار کے یہاں اول تو یہ ثابت نہیں ہے کہ ایسی قوت بے شعور موجود ہے۔ لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسی قوت موجود ہے۔ تو بدن کی طبیعت نفس کے حدوث کو چاہتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ اصل میں وہ فیضان نفس کو چاہتی ہے۔ حدوث نفس کو نہیں چاہتی۔ یعنی بدن کی طبیعت یہ چاہتی ہے کہ اس سے کوئی روح متعلق ہو جائے۔ خواہ جدید روح پیدا کر کے متعلق کر دے یا کسی دوسرے جسم سے آئی ہوئی پرانی روح متعلق ہو جائے۔ روح کے تعلق کو چاہتی ہے۔ روح کے حدوث کو نہیں چاہتی۔ وہ مطلق روح کو چاہتی ہے۔ چنانچہ تناسخ کی

روح آسکتی ہے۔ اور اس سے متعلق ہو سکتی ہے۔ جدید حدوث نفس کا تقاضہ نہیں کرتی۔ یہ دلیل ناقص ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی۔ جتنی دلیلیں تناسخ کے رد کی لوگوں نے بیان کی ہیں۔ تقریباً سب غلط ہیں۔ امام ابن حزمؒ نے یہ فرمایا کہ یہ تناسخ اس لئے باطل ہے کہ یہ نقشہ جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ روح کا عکس ہے۔ جب روح ہٹ جائے گی تو یہ نقشہ باطل ہو جائے گا۔ اور جب یہ روح کسی دوسرے بدن میں جائے گی تو اس کا نقش بھی ہوگا۔ تو دو آدمی ایک نقش کے ہو جائیں گے۔ اور دو آدمیوں کا ایک شکل کا ہونا ناممکن اور محال ہے۔ اس لئے تناسخ محال ہے۔ یہ دلیل بھی غلط ہے اس لئے کہ یہ نقشہ روح کا نہیں ہے۔ روح کے متعلق ہونے سے پہلے یہ نقش مکمل ہو چکتا ہے۔ اور روح کے جدا ہونے کے بعد برسوں یہ نقش باقی رہتا ہے۔ خاص کر شہدا ر اولیا ر اور انبیا ر کا اور مسالوں کے ذریعہ سے جو محفوظ کئے جاتے ہیں اگر روح کا نقشہ ہوتا تو یہ ہرگز باقی نہ رہتے دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ دو آدمیوں کا ایک شکل کا نہ ہونا کیسے معلوم ہوا کیا ساری دنیا کے آدمیوں کا مشاہدہ کر لیا۔ ؟ امام فخرالدین رازیؒ نے فرمایا کہ اگر ایک بدن کو چھوڑ کر روح آئے گی تو اس بدن میں جو واقعات اس کو لاحق ہوئے تھے ان کو یاد کرے گی۔ لیکن پچھلے بدن کی کوئی بات اس بدن میں یاد نہیں آتی۔ لہٰذا یہ روح کسی بدن کو چھوڑ کر نہیں آتی۔ تمام متکلمین کی یہی رائے ہے۔ لیکن یہ بالکل ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ یاد کے تسلسل کے لئے موجود دماغ شرط ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے بدن کا حال چھوڑ و خود اس بدن کے واقعات اس دماغ کے ہوتے ہوئے یاد نہیں رہتے ماں کے پیٹ کے واقعات کہاں یاد ہوتے ہیں۔ جب اس دماغ کے موجود ہوتے ہوئے واقعات یاد نہیں آتے تو اس دماغ کو چھوڑ کر کہاں یاد آئیں گے۔ بعض حکمار

نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں جائے گی تو جتنے آدمی مرتے ہیں تو اتنے ہی پیدا ہونے چاہئیں۔ بعض لڑائیوں میں اور وباؤں میں کئی کئی لاکھ آدمی مر جاتے ہیں۔ مگر اتنے پیدا نہیں ہوتے۔ یہ بھی لغو بات ہے۔ ساری دنیا کے آدمیوں کی پیدائش کا اول تو جائزہ نہیں لیا۔ رہ تو اب ممکن ہوگیا ہے اور اعداد و شمار اموات کے مقابلے میں پیدائش کے زیادہ ہیں) اور اگر جائزہ لے بھی لیں تو یہ کیا ضروری ہے کہ انسان ہی پیدا ہوں جانور پیدا ہو گئے۔ نباتات و جمادات پیدا ہو گئے۔ حق بات یہ ہے کہ عمل جزا سے زمانہ مقدم ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ایک اور دو تین ہوتے ہیں۔ یعنی جس عمل کی جزا ملے گی۔ وہ عمل پہلے ہو گا۔ جزا بعد میں ملے گی۔ تو وہ بدن جس میں عمل ہوا وہ مقدم ہوا اور جس میں جزا ملی وہ موخر ہوا۔ اور جانور جو ہے وہ عملی قالب نہیں ہے۔ وہ جزائی قالب ہے۔ ان کے نزدیک ہمارے نزدیک وہ محض قہر الہٰی ہے۔ انسانی قالب عمل قالب ہے اور حیوانی قالب جزائی قالب ہے تو انسانی قالب مقدم ہوا اور حیوانی قالب موخر ہوا۔ تو جو شے کسی شے سے پیچھے ہو گی۔ اس کے لئے اول ہو گا اور عمل جزا کے ساتھ چسپاں ہے۔ عمل ختم ہوا جزا شروع ہوئی اور جزا شروع ہوئی اور جزا کے لئے ہے ابتداء تو جزا محدود ہوئی اور جو شے محدود ہو اور وہ کسی شے سے متصل ہو تو وہ شے بھی محدود ہو گی۔ تو حیوان اور انسان دونوں کے لئے ابتداء ہو گی تو لا ابتداء نہ جانور رہا نہ انسان تو لا ابتدا کوئی قالب بھی نہ رہا۔ اب جو قالب ہوا وہ پہلا قالب تھا۔ اور جو روح اس سے متعلق ہوئی وہ پہلی روح تھی اور وہ روح و قالب کا پہلا تعلق تھا۔ تو پہلا انسان جو پیدا ہوا وہ کسی قالب کو چھوڑ کر آیا۔ نہ کسی پرانی روح اس میں آئی۔

بلکہ وہ روح وقالب پہلی ہی بار پیدا ہوا۔ لہٰذا یہ تناسخ غلط ہوگیا۔ لہٰذا یہ بچوں اور جانوروں کو جو تکالیف پہنچ رہی ہیں۔ وہ محض مشیت الٰہی سے پہنچ رہی ہیں انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

ویسے بھی سمجھ لیں کہ ہر مرکب اپنے اجزاء سے پیچھے ہوتا ہے۔ پیچھے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس مرکب کے لئے پہل اور ابتدا ہوگئی۔ ہر انسان کے بدن میں مٹی موجود ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے۔ اگر مٹی اس کا جزء نہ ہوتی تو مٹی میں تحلیل نہیں ہوتا۔ تو انسان مٹی سے بنا ہے اور مٹی زمین ہے تو زمین نوع انسانی کے ہر فرد سے پہلے ہے۔ کوئی انسانی فرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ زمین میرے سامنے بنی یا میرے ساتھ پیدا ہوئی انسانی سلسلے کے جتنے افراد ہیں۔ وہ زمین کو اسی طرح اپنے سے پہلے دیکھ رہے ہیں۔ خواہ کتنے بھی پرانے زمانہ میں ہوں جس طرح ہم آج زمین کو اپنے سے پہلے دیکھ رہے ہیں۔ تو مٹی یا زمین انسان سے مقدم ہے تو انسانی سلسلہ لا ابتدا نہ رہا۔ اس کے لئے ابتدا ہوگئی اور تناسخ باطل ہوگیا۔ یہ دلیل میری ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے یہ دلیل نہیں بیان کی اور مجھے اس دلیل کا پتہ اس طرح چلا۔ ایک روز شب قدر میں مجھے یہ الہام ہوا کہ فَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (رحمٰن ع ۱) اللہ پاک نے انسان کی پیدائش کی ابتدا کی مٹی سے کہ ابتدائے آفرینش مٹی ہے۔ جب ابتدا مٹی سے ہوئی تو انسان کے لئے اول ہوگیا۔ تو جب پہلا انسان بن گیا تو اس سے پہلے کوئی انسان تھا ہی نہیں جس کی روح اس میں آتی۔ یہ بات تو ایسی واضح ہے کہ آپ حضرات سب سمجھ رہے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ ویسے میں نے فلسفیانہ دلیل سے بھی اس کا ابطال کر دیا ہے۔ آپ

دیکھیں ہم نے مسئلہ کا حصر کیا چار صورتیں ہیں۔ پانچویں نہیں ہے۔
یہاں دو چیزیں ہیں (۱) بدن (۲) روح۔
اس کی چار صورتیں ممکن ہیں۔
۱۔ روح وجسم دونوں قدیم۔
۲۔ روح قدیم جسم حادث۔
۳۔ روح حادث جسم قدیم۔
۴۔ روح اور جسم دونوں حادث۔ ان چار صورتوں کے علاوہ پانچویں صورت نہیں۔ اور ان چار صورتوں میں تناسخ باطل ہے۔

اگر روح جسم دونوں قدیم ہیں تو اب ان کا تعلق یا قدیم ہوگا یا حادث۔ اگر حادث ہے تو روح پہلی بار جسم سے متعلق ہوئی اور کسی بدن کو چھوڑ کر نہیں آئی انسان ازلی نہ رہا۔ اور اگر تعلق قدیم ہے۔ تو روح وجسم کا تعلق ازلی ہوا اور انسان ازلی ہو گیا۔ اور ازلی کو موت نہیں۔ مگر انسان برابر مر رہا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ نہ مرے تو کوئی انسان ازلی نہیں۔ لہٰذا روح وجسم قدیم ہونے کی تقدیر پر تناسخ باطل ہو گیا۔

اگر روح جسم دونوں حادث ہیں تو دونوں نو پیدا ہیں ازلی نہیں رہے بلکہ بدلی روح پہلے جسم کے ساتھ پہلی بار متعلق ہوئی اور کسی جسم کو چھوڑ کر نہیں آئی لہٰذا تناسخ باطل ہو گیا۔

اگر روح حادث اور جسم قدیم ہو تو یہ بات کبھی نہیں آئی کہ جسم قدیم ہو اور روح حادث ہو۔ دوسری بات یہ کہ روح جب حادث ہوئی تو پہلی بار بدن

سے متعلق ہوئی اور کسی جسم کو چھوڑ کر نہیں آئی اس صورت میں بھی تناسخ باطل ہوگیا
اب ہی یہ بات جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ روح قدیم اور جسم حادث تو اول تو حوادث کا
سلسلہ لا انتہا نہیں جا سکتا۔ وہ کسی نہ کسی جگہ ٹھہرے گا۔ اور روح قدیم جو ہے وہ
لا انتہا ہے۔ نیز ہر بدن دو بدن کے بیچ میں ہے۔ اور بیچ کا تصور ہو نہیں سکتا۔
جب تک کہ پہل نہ ہو۔ ہر باپ دادا اور بیٹے کے بیچ میں ہے۔ اور بیچ ہو نہیں سکتا
جب تک ابتدا نہ ہو۔ تو پہلا باپ ہونا چاہیئے۔ وہ پہلا انسان آدم علیہ السلام ہیں۔ بدن
کا سلسلہ لا انتہا جا نہیں سکتا تو ابتدا میں روح جس بدن کے ساتھ متعلق ہوگی۔ وہ
پہلی بار ہوگی اور کسی جسم کو چھوڑ کر نہیں آئے گی۔ بدن کے حادث ہونے کی صورت میں۔
لہٰذا اس صورت میں تناسخ باطل ہوگیا۔ یہ نئی دلیل ہے۔ کتابوں میں یہ دلیل نہیں
ملے گی۔ یہ تیسری دلیل ہے۔

ایک دلیل میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بیٹے اور باپ کا جو علاقہ ہے یہ
اضافی ہے۔ لیعنی باپ کو بیٹا ہونا لازمی ہے۔ اور بیٹے کو باپ ہونا لازمی ہے۔ تو اگر
یہ سلسلہ لا اول جائے گا تو آخر معلول تو ہوگا علت نہیں ہوگی۔ اور ان میں ہے اضافت
ہر معلول کے لئے علت چاہیئے۔ لہٰذا اول میں علت ہونی چاہیئے۔ علت پھر معلول پھر
علت پھر معلول۔ یہ دلیل نصیر الدین طوسیؒ نے بیان کی ہے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اس
لئے کہ اس سلسلے کو آخر فرض کیوں کیا سلسلہ ابھی موجود ہے۔ قطع تو نہیں ہوا۔ وہ تو
دونوں طرف لا انتہا مانتے ہیں۔ نہ ادھر ٹھہرتا ہے۔ نہ ادھر ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا یہ دلیل
بھی ناقص ہے۔

امام ابن حزمؒ نے کہا اول ہونا چاہیئے کیونکہ اول نہیں ہوگا تو دوسرا نہیں

ہوگا۔ اور دوسرا نہیں تو تیسرا نہیں ہوگا۔ اسی طرح سارا جہان نہیں ہوگا۔ لیکن سارا جہان موجود ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اول ہے۔ یعنی سلسلہ لا انتہا نہیں جا سکتا۔ لہذا اتنا سخ باطل ہے۔ مگر ان کی یہ دلیل بھی غلط ہے۔

بڑی باریک بات ہے۔ بڑی باریک غلطی میں نے پکڑی ہے۔ جو آج تک کسی نے نہیں پکڑی کہ اگر اول نہیں ہوگا تو ثانی نہیں ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے مگر کہاں۔؟ کس سلسلے میں؟ جس سلسلے میں اول ہے اس میں اگر اول نہیں ہوگا۔ تو ثانی نہیں ہوگا مگر جو سلسلہ لا اول ہے وہاں اول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو سلسلہ اول ثانی ثالث پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ دلیل ٹھیک ہے۔ مگر جس سلسلے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کے لئے ابتدا ہے ہی نہیں۔ تو اول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اول ہے ہی نہیں۔ یہ لا اول ہے۔ جو سلسلہ ذی اول ہوگا۔ اس میں وہ دلیل صحیح ہوگی۔ کہ اول نہیں تو ثانی نہیں۔ وغیرہ سلسلہ لا اول کو سلسلہ اول پر قیاس کر لیا۔ میں نے اس کو رد کر دیا۔ مجھ سے پہلے اس کی غلطی کسی نے نہیں پکڑی۔ امام غزالی اور ان کے سلسلہ کے اور دیگر اساتذہ کہتے ہیں کہ سلسلہ لیل ونہار جو ہے وہ یا طاق ہے یا جفت ہے عربی میں اس کو زوج وفرد کہتے ہیں۔ جفت یا زوج وہ ہے جو دو پر پورا پورا تقسیم ہو جائے۔ اور طاق یا فرد جو دو پر پورا پورا تقسیم نہ ہو۔ تو اگر سلسلہ طاق ہے اس میں سے اگر ایک گھٹا دیں تو جفت ہو جائے گا۔ اور جفت نصف ہو سکتا ہے۔ نصف محدود شے ہے۔ جب دونوں جزو محدود ہو گئے تو ان کا کل بھی محدود ہوگا۔ اور جب کل محدود ہو گیا تو اس پر ایک کا اضافہ کریں تب بھی وہ محدود ہی رہے گا۔ تو لا محدود ہونے کی تقدیر پر محدود ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ محال ہے۔ لہذا سلسلہ لا اول

نہیں ہے۔ اور اگر جفت ہے تو اس میں بھی یہی تقریر ہوگی۔ جو اوپر بیان ہوئی۔
اور اس دلیل کا نام رکھا برہان زوج وفرد۔ لیکن یہ بھی بالکل غلط اور لغو بات ہے
یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ شیر کے شکار کو نکلے اور غلیل اور غلہ لے کر نکلے۔ غلہ سے
بھلا شیر کہاں مر سکتا ہے۔ غلط ہتھیار سے ہتھیار کا نہ ہونا بہتر ہے۔ اور غلط قدم
اٹھانے سے نہ اٹھانا بہتر ہے۔ اس سے یہ اچھا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ اس کی غلطی کبھی
کسی نے نہیں پکڑی یہ میں نے ہی پکڑی ہے۔ یہ دلیل وہاں صادق آئے گی۔ جو
سلسلہ زوج وفرد پر مشتمل ہوگا۔ اور یہ سلسلہ ایک اور دو پر مشتمل ہے ہی نہیں۔ اگر ایک
اور دو پر مشتمل ہوتا تو پھر جھگڑا اکائی کا تھا۔ یہ تو سلسلہ لا اول ہے یہ ایک۔ اور دو
پر مشتمل ہی نہیں ہے۔ جو سلسلہ ایک دو پر مشتمل ہوگا وہ یا طاق ہوگا یا جفت ہوگا۔ یہ
تو صفت محدود کی ہے۔ ایک بہت بڑے بزرگ ہیں۔ شیخ مقتول رضا شیخ سعدیؒ
کے استاد اور پیر ہیں بہت بڑے حکیم ہیں جیسے افلاطون۔ ان کی کئی کتابیں میں
میں نے پڑھی ہیں۔ تلمیحات اور حکمت اشراق۔ ان کا بھی کچھ رجحان تناسخ کی
طرف ہو گیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں آج اور کل ملکر محدود ہیں اور اس میں اور ملائیں وہ
بھی محدود۔ اور ملائیں وہ بھی محدود۔ اس کے کل اجزا محدود ہیں۔ محدود میں
محدود ملائیں گے تو محدود ہی رہے گا۔ لامحدود نہیں ہو سکتا محال ہے۔ اس کا نام
انہوں نے رکھا برہان عرشی۔ یہ بھی دھوکا ہے۔ یہاں ایک ہے ہی نہیں۔ وہ تو سلسلہ
کی کڑی ہے۔ اور یہ جو محدود میں محدود ملا رہے ہو یہ کتنی بار ملایا۔ اگر محدود مرتبہ
ملائیں گے تو محدود ہوگا۔ اور اگر لامحدود مرتبہ ملائیں گے تو لامحدود ہو جائے گا۔
محدود مرتبہ ملا رہے ہو۔ تو محدود نظر آ رہا ہے۔ اور یہ برہان عرشی بھی غلط ہے۔ یہ

سب فضول باتیں ہیں۔ متکلمین نے ایک دلیل ایجاد کی ہے کہ یہ سلسلہ ممکنات کا جو ہے وہ سب جاکر واحد پر ٹھہرتا ہے۔ مخلوق کا سلسلہ خالق پر جاکر ٹھہرتا ہے۔ اور خالق مخلوق سے مقدم ہے جب خالق مقدم ہوا تو مخلوق موخر ہوگئی۔ اور موخر ہوتے ہی ذی ابتدا ہوگئی۔ اس لئے مخلوق کی ابتدا ہے۔ یہ لا اول نہیں ہے۔ اور جو لا اول نہیں ہے وہ محدود ہے۔ یہ دلیل کتنی غلط ہے اور اس دھوکہ میں سب آگئے۔ بحرالعلوم نے شرح مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ یہ برہان اتم ہے۔ مکمل برہان ہے۔ تمام علماء اس پر متفق ہیں۔ بات کو سمجھے نہیں میں نے اس کی باریک غلطی پکڑ لی۔ خالق کا پتہ کیسے چلا۔ جو سلسلہ لا اول کا قائل ہے اسے تو خالق کی ضرورت ہی نہیں وہ خالق کو مانتا کب ہے خالق کا پتہ تو اس وقت چلے گا۔ جب اس سلسلے کا لا انتہا ہونا باطل ہو جائے اور سلسلے کے لئے اول ہونے کا پتہ چل جائے۔ اور سلسلہ کا ذی اول ہونا خالق سے ثابت کرو گے تو الٹا ہوگیا۔ دور لازم آیا۔ یعنی خالق کا پتہ ہی نہیں چل سکتا جب تک سلسلے کے لئے ابتدا نہ ہو اول ہونا پہلے کسی دلیل سے ثابت کرلو۔ پھر جاکر خالق ثابت ہوگا۔ اور اس وقت خالق کے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں رہے گی وہ تو دہیں ثابت ہوگیا۔ تو خالق کا ثبوت موقوف ہے تسلسل کے ابطال پر۔ اور اگر تسلسل کا ابطال خالق کے ثبوت پر موقوف ہوگا تو الٹا ہو جائے گا اور دور لازم آئے گا۔ لہٰذا سب دلیلیں غلط ہیں بلکہ میں کہتا ہوں یہاں تقدیم و تاخر ہے اور جو شے پیچھے ہے اس کے لئے ضرور اول ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ سورج مجھ سے پہلے ہے۔ ہر شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ میں زمین کے اوپر ہوں تو ہر شخص یہ جان رہا ہے کہ زمین مجھ سے پہلے ہے۔ اگر انسانوں کا سلسلہ لا انتہا جائے۔

ہر حالت میں سورج سے پیچھے ہی رہے گا۔ اور زمین سے پیچھے رہے گا۔ جب پیچھے ہوا تو اس سلسلے کے لئے ابتداء ہے لا تناہی جا نہیں سکتا۔ محدود ہو گیا حسیات سے ثابت کرنا چاہیئے۔ قرآن تو بھرا ہوا ہے حسی دلیلوں سے، یہی تو خطرہ کی بات ہے کہ اتنی واضح دلیلوں کے ہوتے ہوئے عمل نہیں کیا، ایمان نہیں لایا۔ دقیق بات ہوتی تو عذر کر دیتا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا اس لئے روشن دلائل بیان کئے ہیں۔ تاکہ کسی کو عذر نہ رہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنْ حَجَّ
الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا ؕ
وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ۝ اِنَّ
الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْھُدٰی
مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ
یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ
تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ ۚ
وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ
اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ ۙ خٰلِدِیْنَ
فِیْھَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝

(سورہ بقرہ ۱۵۸-۱۶۲)

بے شک صفا و مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ جس نے بیت اللہ کا حج
کیا۔ ان پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرلے جس نے اپنی خوشی سے کوئی نیکی کی تو
بے شک اللہ بڑا قدر دان اور جاننے والا ہے۔

صفا اور مروہ دو پہاڑ ہیں۔ اوپر سے مضمون چلا آرہا ہے کہ نماز اور صبر سے
مدد طلب کرو اور ہم تم کو کچھ جانی و مالی نقصان دیکر ڈرائیں گے اور آزمائیں گے۔
اس مضمون کے بعد صفا و مروہ کا ذکر بظاہر کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ تو مناسبت پیدا
کرنے کے لئے بعض مفسرین تو یہ کہتے ہیں کہ اوپر جو آیات ابراہیم کے بنائے کعبے کے متعلق
آئی ہیں۔ ان کا تعلق ان آیات سے ہے۔ اور بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ صفا و مروہ
میں حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو پیاس کی شدت سے آزمایا تھا اور وہ ان دونوں
کے درمیان دوڑی تھیں تو آزمائش کے ذکر کے ساتھ اس کا ربط ہے بعض حضرات نے
یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ بعض شرائع ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی خوبی معلوم ہو جاتی ہے
فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (البقرہ-۱۵۲) تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر
کروں گا اور ہماری نعمتوں کا شکر کرو اور ناسپاسی مت کرو۔ یہ ایسی بات ہے کہ عقل میں
آتی ہے کہ منعم کی نعمتوں کا شکر کرنا چاہیئے۔ اسی طرح دکھ درد مصیبت پر صبر کرنا عقل
سے اچھا اور ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اور ناشکری کرنے کی قباحت سمجھ میں آتی ہے بعض
احکام خداوندی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی خوبی یا قباحت عقل سے معلوم نہیں ہوتی۔ جیسے

مناسک حج ہیں، کنکریاں مارنا، طواف کرنا، صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا۔ یہ ایسے امور ہیں کہ ان کی خوبی عقل سے معلوم نہیں ہوتی۔ تو اللہ پاک نے تینوں قسم کے احکام ایک جگہ بیان کر دیئے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ میں تین قسم کے احکام دوں گا۔ جو عقل کو اچھا معلوم ہو، ایسا بھی حکم دوں گا۔ جو عقل کو برا معلوم ہو، ایسا بھی حکم دوں گا۔ اور ایسا بھی حکم دوں گا جو سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اللہ پاک کے احکام کو عقل کے مطابق کرنا اور آیات میں ربط تلاش کرنا، یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ پاک کو اختیار ہے کہ جو چاہے سو کرے اور جس جگہ چاہے کرے۔ آغاز کلام ایسے الفاظ (الٓمٓ) سے کیا جس کے لغت میں کوئی معنی نہیں ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال کرنا کلام میں جن کے معنی معلوم نہ ہوں عقلاً صحیح نہیں ہے۔ تو مناسبت تلاش کرنا اپنے لئے یہ کوشش ٹھیک نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ملا واحدی کے مکان پر ماجد دریا آبادی اور محمد علی جوہر اور دیگر حضرات موجود تھے وہاں ربط آیات کا ذکر چھڑ گیا میں نے کہا یہ ربط دینے کی ضرورت نہیں ہے یہ کام حضرت شیخ محی الدین عربی نے بہت   کیا ہے۔ انہوں نے بسم اللہ سے لے کر والناس تک آیات کو ایسا ربط دیا ہے کہ یہ سب ایک ہی چیز مسلسل ہے۔ یہ ان لوگوں کی باتیں ہیں۔ میری سمجھ میں اس کی ضرورت نہیں آئی کیونکہ اللہ کے افعال میں ہم دیکھتے ہیں کوئی ربط نہیں ہے۔ ایک پہاڑ ہے کہ اس کی چوٹی آسمان سے جا ملی ہے۔ بالکل اس کے برابر ایسا گڑھا ہے کہ تحت الثریٰ تک چلا گیا ہے۔ تو جب اس کے افعال میں ربط نہیں ہے تو اس کے اقوال میں ربط کیوں ہو۔ گلاب کا نازک درخت خوبصورت پھول لگایا اور اس کی ٹہنی میں اس کے برابر بڑا خبیث کانٹا لگا دیا۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی تو اس کے فعل کے لئے عقل کی مناسبت شرط نہیں ہے۔ اگر مناسبت نظر آ جائے وہ الگ بات ہے۔ مگر مناسبت

عقل ہونی چاہیئے یہ اصول غلط ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا اور رسول کی ضرورت ہی نہیں انسان عقل سے سارا کام نکال لے۔ عقل کا تو صرف اتنا کام ہے کہ جیسے آنکھ کا کام ہے کہ دیکھے۔ مگر جب تک باہر کی روشنی شامل نہیں ہو گی۔ اندھیرے میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح عقل کا کام یہ ہے کہ غیر محسوس اور معقولات کو دیکھے مگر اس کے لئے بھی شرط ہے کہ بیرونی روشنی ہونی چاہیئے۔ یعنی روشنی نہیں ہو گی تو عقل نہیں دیکھ سکے گی۔ جس طرح آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج ہے۔ اسی طرح عقل نبوت کی روشنی کی محتاج ہے۔ بغیر اس روشنی کے عقل نہیں دیکھ سکتی۔ اور جس طرح آنکھ اندھیرے میں کوئی شے نہیں دیکھ سکتی۔ مگر اندھیرے کو دیکھ سکتی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ اسی طرح عقل معقولات کو نہیں دیکھ سکتی مگر یہ دیکھ سکتی ہے کہ وہ ان کو نہیں دیکھ سکتی۔ یعنی اصل بات عقل میں نہ آئے مگر یہ بات ضرور سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ اس بات کو نہیں سمجھ رہی ہے بس عقل کا یہ کام ہے ۔ یہ انتہائی عقل ہے۔ مناسبتیں جتنی ہیں سب غلط ہیں۔ اتفاقاً کوئی مناسبت پیدا ہو جائے یہ اور بات ہے۔ دیکھئے یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ وجود، عدم کے بعد ہو۔ یا تو ہوتی یا نہ ہوتی۔ ہر شے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہے۔ اور جو شے درمیانی ہو گی۔ وہ اول سے پیچھے ہو گی۔ تو تمام کائنات درمیانی شے ہے۔ یہ لا اول نہیں ہو سکتی۔ ممکن درمیانی شے ہوئی۔ اس کے لئے ازل ہونا چاہیئے۔ لا اول وہ نہیں ہو سکتا۔ تو امکان ازلی نہیں ہو سکتا۔ یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ازلی عادت تو یہ تھی کہ فعل نہ کرے۔ اب جو اس نے فعل کیا تو یہ بالکل عادت کے خلاف کیا۔ اگر عادت کے مطابق ہوتا تو ہمیشہ سے ہوتا اور عالم دائمی اور ازلی ہو جاتا۔ مگر ازلی نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ عالم خلاف عادت ہے۔ جب عادت کے خلاف ہوا تو عقل کے بھی خلاف ہوا۔ یہاں حسن

و قبح دکھ اور سکھ دونوں باتیں موجود ہیں اور یہ کسی درجہ میں بھی عقل میں نہیں آتا کہ دکھ ہو۔ عقل میں دکھ اور سکھ کا مجموعہ بالکل نہیں آتا۔ عقل کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سکھ ہی سکھ ہوتا۔ یا کم از کم نہ دکھ ہو نہ سکھ ہو یعنی سکھ کے ساتھ دکھ بھی ہو۔ یہ عقل میں نہیں آتا۔ زیادہ جہنم میں جائیں اور چند جنت میں جائیں۔ اس سے کہیں اچھا تھا کہ کوئی بھی جہنم میں نہ جاتا چاہے جنت میں جاتا یا نہ جاتا۔ کیونکہ دکھ سے بچنا یہ زیادہ بہتر ہے۔ سکھ کے حاصل ہونے سے۔ عقل اس کو (دکھ کو) پسند نہیں کرتی۔ مگر موجود ہے۔ دکھ کی صلاحیت سارے جسم میں موجود ہے۔ کہیں بھی چٹکی لیں دکھ ہوگا۔ سکھ کی صلاحیت ایک دو اعضاء میں ہے۔ یعنی زبان کی نوک جہاں لذت حاصل ہوتی ہے۔ تو یہاں دکھ زیادہ ہے سکھ کم ہے یہ عقل کے خلاف ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے افعال میں عقل سے مناسبت نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے اقوال میں عقلی مناسبت تلاش کرنا بے سود ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ہمارے یہاں صدق و کذب کی معیار "مناسبت واقع" ہے۔ یعنی دودھ سفید ہے یہ سچ اس لئے ہے کہ دودھ جو کڑھائی میں ہے۔ یہ بات اس پر منطبق ہے۔ اگر منطبق نہ ہو تو کذب ہے۔ یہ ہے معیار۔ دودھ سیاہ ہے۔ یہ قول اس دودھ پر منطبق نہیں ہے اس لئے کذب ہے۔ مگر یہ معیار اللہ کے افعال میں چل نہیں سکتی۔ کیونکہ وہاں معاملہ الٹا ہے فعل اس کے قول کے مطابق ہوگا۔ اس نے کہہ دیا آگ ٹھنڈی ہو۔ فوراً گل و گلزار ہوگئی۔ عصا کو کہا کہ سانپ اژدہا ہو۔ مجرد اس کے کہتے ہی لکڑی اژدہا بن گئی۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے اور راز کی بات ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں۔ کوئی عالم یہ بات نہیں کہے گا۔ یعنی اس کا کوئی قول فعل کے تابع نہیں ہوگا۔ پوری کائنات قول کن کے تابع وہاں مطابقت ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے یہاں تو یہ دیکھا جائے گا کہ قول فعل کے مطابق ہے۔

یا نہیں. مگر وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا۔ وہ تو جو کچھ کہہ دے گا وہی حق ہے۔ واقعہ ویسا ہی ہو جائے گا۔ اور ہر شے اس پر مجبور ہے۔ راضی ہے۔ انسان ذرا سا پیدا ہوتا ہے۔ پھر اتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ یہ کہاں سے آیا۔ یہی بھیڑ بکری دنبے کے گوشت سے بنا۔ تو اب انسان ہے اشرف۔ بھیڑ ہے ارذل۔ اس کو کتنا بھی سمجھاؤ کہ مرنے کے بعد آدمی بن جائے گی۔ مگر وہ نہیں مانے گی۔ اپنی صورت پر راضی ہے۔ اسے ماریں گے تو دکھ پائے گی۔ خوش نہیں ہوگی۔ ہر شے اپنی صورت پر راضی ہے۔ اسے بدلنا نہیں چاہتی۔ یہی وجہ ہے کہ جنت میں ایک دوسرے کو دیکھ کر نہیں جلے گا۔ حالانکہ وہ دوسرے کو اس طرح دیکھے گا جیسے تارا۔ مگر وہ اس کی بلندی پر جلے گا نہیں بلکہ جو اس کو مل گیا اس پر خوش اور راضی ہوگا۔ تو اللہ کا کلام اگر ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے معنی نہ ہوں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مربوط نہ ہو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مولانا محمد علی یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ بس جو اس نے فرما دیا وہ ٹھیک ہے۔ آپ اور دیکھیں کہ کلام اللہ کی ترتیب وہ نہیں ہے۔ جس ترتیب سے نازل ہوا۔ بلکہ الٹا ہے۔ پہلی سورۃ مدنی ہے اور مکی سورتیں بالکل آخر میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقدیم و تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس تقدیم و تاخیر کا کوئی حکم قرآن پاک میں نہیں ہے۔ اور فرمایا وما ینطق عن الھوٰی (نجم-۲) آپ اپنی خواہش سے بولتے نہیں ان اتبع الا ما یوحیٰ (انعام-۵۰) میں صرف وحی کا تابع ہوں تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی وہیں سے ہوئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی آپ پر وحی ہوتی ہے۔ شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی علامت کے ہیں۔ تو مفسرین نے فرمایا کہ صفا و مروہ دو عبادتیں ہیں۔ اور ایک جماعت نے یہ فرمایا کہ عبادتوں کے مواضع ہیں۔ تو صفا و مروہ عبادتیں ہیں۔ یہ تو معنی لگتے نہیں کیونکہ

ان دونوں کے درمیان عبادات ہوتی ہیں تو یہ مواضع عبادت ہیں مقامات عبادت ہیں[1]۔ حج معنی قصد کرنا۔ جس نے بیت اللہ کا قصد کیا عبادت کے لئے یا اعتمار کیا۔ اعتمار کے معنی زیارت کے ہیں۔ ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ طواف کریں۔ یہاں ذرا سی باریک بات ہے اَنْ یَطَّوَّفَ بِهِمَا اور چیز ہے اور اَنْ یَّطُوْفَ بَیْنَهُمَا اور چیز ہے۔ اسلام سے قبل ان دونوں پہاڑوں پر بت رکھے ہوئے تھے اور لوگ ان کو مس کیا کرتے تھے تو اسلام لانے کے بعد لوگوں کو کراہیت ہوئی کہ وہاں سعی کریں تو حکم آیا کہ نہیں وہاں طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اب کیا ہوا کہ آیا جو فرض چیز ہے۔ اس کے کرنے میں گناہ نہیں ہے۔ یا جو مندوب چیز ہے۔ اس کے کرنے میں گناہ نہیں ہے۔ یا مباح کے کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ جس فعل کو اللہ تعالیٰ کلیتًا طلب کرے اس کا نام فرض ہے۔ جیسے نماز، روزہ اور جس فعل کو جزوی طلب کرے یعنی اگر کرے گا تو انعام دوں گا۔ اور نہیں کرے گا تو سزا نہیں دوں گا۔ اس کو مندوب کہتے ہیں۔ اور ایسے فعل جس کو کرنے یا نہ کرنے کا کوئی صلہ نہیں ہے۔ اس کی اجازت دیدی۔ اس کو مباح کہتے ہیں تو یہاں عَلَیْهِ کا لفظ ان تینوں کو شامل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے یہ کہا ہے کہ لا جناح کا لفظ ایسی جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ جس کا کرنا واجب ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ ان کو کرو۔ دوڑو۔ تو یہ واجب نہیں ہے۔ اگر دم یعنی خون دیکر چھوڑ دے تو حج ادا ہو جائے گا۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ رکن حج ہے۔ اگر نہیں دوڑا تو حج ناقص ہو جائے گا۔ اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اگر نہ کرے تو نہ حج جائے گا نہ کوئی گناہ ہو گا۔ بس یہ بات ہے تین رائیں ہیں۔ کیونکہ اس میں سے تین معنی نکلتے ہیں۔ یہ حضرت جابرؓ نے جو شدت

---

(۱) فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ۔

پیاس میں دوڑ لگائی تھی تو ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ عطا کر دیا۔ یہ اس کا اثر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عبادت قرار دیدیا۔ ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم تطوع کہتے ہیں نیکی کے اس کام کو جو فرض نہ ہو اور بندہ اپنی خوشی سے وہ نیک کام کرے۔ جو بندہ تطوع کرتا ہے۔ اللہ اس کا قدردان ہے۔ جب شکر کا لفظ خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی قدردان کے آتے ہیں۔ اور بندہ کی طرف ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ نعمت دینے والے کے احسان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جو اپنی خوشی سے کثرت سے نیکی کر رہے ہیں۔ نفل ادا کر رہے ہیں۔ اس کی اچھی جزا دیگا۔ یہ جو روحانی خوبیاں اور عجائب وغرائب حاصل ہوتے ہیں۔ وہ فرائض ادا کرنے سے نہیں بلکہ وہ کثرت سے نوافل ادا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ آپ غور کریں کہ ایک ملازم ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے مالک کے گھر جاتا ہے۔ اور گھر کا سودا سلف لاتا ہے۔ بچوں کو بہلاتا ہے اور گھر کے کام کرتا ہے۔ اس سے کہو کہ گھر جا تو کہے کہ نہیں حضور رہیں یہاں، بچوں کو بہلاتا رہوں گا۔ اب اگر وہ کبھی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو جائے یعنی فرض ترک کر دے اور دیکھنے والے اس کی شکایت کریں کہ یہ آج غیر حاضر ہو گیا تو مالک کہے گا کہ جانے دو وہ گھر کا کام کاج کرتا ہے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت کرتا ہے۔ تو نوافل ادا کرنے کا یہ فائدہ ہو گا کہ فرض کے ترک پر بھی اس کی بازپرس نہیں ہو گی۔ اور معافی مل جائے گی۔ اسی طرح جو لوگ تطوع کرتے ہیں۔ اگر وہ کوئی کام خلاف عادت بھی کر بیٹھیں تو اللہ تبارک تعالیٰ وہ صحیح کر دیتا ہے فرمایا کہ میں اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں۔ اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں۔ اتنی بڑی چیز ہے یہ تطوع۔ اور وہ علیم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے کتنی زائد خدمت میری کی ہے

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بینہ للناس فی الکتب اولئک یلعنھم

اللہ و یلعنھم اللعنون ، بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں۔ جو اللہ نے نازل کیا بیّنات و ہدایت جبکہ ہم نے کتاب میں اس کی توضیح کردی یعنی سمجھا دی جس طرح یہود نے رسول اللہ کی بعثت کے بارے میں جو توراۃ میں آیا ہے۔ اور دیگر احکام الٰہی کو چھپا دیا تھا لوگوں کی ہدایت کے لئے کتاب میں وضاحت کردی۔ تنزیلی الفاظ کے معنی اور فوائد کی وضاحت کردی۔ وہ وضاحت کیا ہے۔ قیاس ہے۔ خبر واحد ہے۔ اجماع ہے۔ تو جو لوگ ان کو چھپاتے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے لعنت ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ اجماع۔ قیاس و حدیث جو خبر واحد سے ہم کو پہنچی ہے۔ اس کو نہیں چھپانا چاہئے اور ظاہر کردینا چاہئے۔ سخت وعید ہے۔ کہ چھپانے والے پر لعنت ہے۔ لعنت کے معنی ہیں۔ بعد عن الرحمت اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں گے۔ لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔ کہاں کریں گے۔ روز جزا کریں گے کہ تم نے ایسا کام کیا تم پر خدا کی لعنت ہے۔ یا یہاں کریں گے۔ تو یہاں تو سب کہتے نہیں زبان سے مگر دل میں سب لعنت بھیجتے ہیں۔ و ان من شیءٍ الا یسبح بحمدہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہیں کرتی۔ ولکن لا تفقھون تسبیحھم لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ اس طرح ہر شے یہاں لعنت کر رہی ہے مگر ہم ان کی لعنت کو نہیں سمجھتے۔ جس طرح ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ یہی معنی ٹھیک ہیں۔

الا الذین تابوا واصلحوا وبینوا فاولئک اتوب علیھم وانا التواب الرحیم ،

لعنت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے توبہ کی۔ توبہ کے یہ معنی ہیں۔ کہ شرمندہ ہوئے اور یہ عزم کیا کہ آئندہ نہیں کریں گے۔ تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط شرمندہ ہوئے۔ دوسری شرط کہ اس فعل سے جو فساد برپا ہوا تھا۔ اس کا ازالہ کیا کہ ہم نے

تم کو دھوکہ دیا تھا اور جو بات غلط ہم نے کہی تھی۔ اس کا یہ جواب ہے۔ اس لئے تم لوگ اس سے باز آجاؤ اور تیسری شرط یہ ہے۔ کہ آئندہ اس فعل کو نہ کرنیکا عزم بالجزم کیا تو ایسے لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں یہاں بھی وہی لفظ "اتوب" ہے۔ "اتوب" کے معنی ہیں توبہ کرتا ہوں۔ اللہ جب کہے "اتوب" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں توبہ قبول کرتا ہوں کیونکہ انا التواب الرحیم میں بڑا توبہ قبول کرنیوالا اور رحمت والا ہوں۔ "تواب" مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت زیادہ توبہ قبول کرنیوالا انسان تو دو تین مرتبہ معاف کرنے کے بعد ناراض ہو جاتا ہے۔ کہ تو بار بار یہی کرتا ہے۔ اب کی تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ، ستر بار بھی توبہ کرے اور پھر اس فعل کو کرے پھر توبہ کرلے تو بھی قبول کرلیتا ہے۔ غرغرہ لگنے سے پہلے تک دلیل اس کی یہ ہے۔ کپڑا بار بار میلا ہوتا ہے۔ پھر دھونے سے صاف ہو جاتا ہے۔ جب تک جھلنگا نہ ہو جائے اور پھٹ نہ جائے۔ پھٹنے کے بعد تو مجبوری ہے۔ جب رہا ہی نہیں تو کیا توبہ قبول کرے گا۔ یا تو کثرت کی توبہ قبول کرتا ہے۔ یا یہ کہ ایک آدمی کی کثرت سے توبہ قبول کرتا ہے۔ دونوں معنی نکلتے ہیں۔ ہر ایک کی توبہ قبول کرتا ہے یا ایک شخص کی ہر ہر بار توبہ قبول کرتا ہے۔ رحیم بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت زیادہ رحمت والا ہے کیونکہ اس کی رحمت بہت وسیع ہے۔ غور کریں اصول یاد رکھئے رحمت کے معنی ہیں نفع پہنچانا۔ ضابطہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شے کی زیادہ ضرورت ہے اس کی مقدار زیادہ بنائی۔ یعنی سونے چاندی کی ضرورت کم ہے تو اس کی مقدار کم پیدا کی۔ لوہے تانبے کی ضرورت زیادہ ہے تو اس کی مقدار زیادہ پیدا کر دی۔ جواہرات کی ضرورت اس سے بھی کم ہے تو اس کی مقدار اور کم کر دی۔ امراض میں

دیکھئے۔ غیر مہلک امراض زیادہ ہیں۔ مہلک امراض ٹی بی۔ کینسر وغیرہ کی کم ضرورت تھی۔ تو وہ کم پیدا کیے۔ اکثر مریض غیر مہلک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مہلک میں بہت کم تعداد ہے۔ کیونکہ ان کو صرف خاص وقت میں پیدا کرنا تھا۔ جبکہ مریض کو ہلاک ہی کرنا مقصود ہو۔ کھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ زیادہ پیدا کر دیا۔ پانی کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس کو اس سے زیادہ پیدا کیا۔ ہوا کی ہر وقت ضرورت ہے اس کو ہر جگہ پیدا کر دیا۔ اگر کہیں ذرا دیر ہوا نہ ہو تو فوراً دم گھٹ کر مر جائے تو ضابطہ یہ ثابت ہو گیا کہ جس شے کی ضرورت زیادہ ہے۔ اس کو زیادہ پیدا کر دیا اب انسان میں ان منافع کے حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہوا پانی غذا سے منفعت حاصل کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتی تو لبقدر کوشش وہ منفعت حاصل کر سکتا۔ مگر یہاں ہو یہ رہا ہے کہ جو زیادہ محنت کر رہا ہے یعنی مزدور وہ کم حاصل کر رہا ہے اور جو گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر قلم چلاتا ہے وہ زیادہ حاصل کر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان منفعتوں کے حاصل کرنے کا مدار کوشش پر نہیں ہے ورنہ ہر شخص پہنچ جاتا۔ اب یہ ساری نعمتیں جو ہیں۔ وہ سب بے کار ہیں۔ اگر ہم تک نہیں پہنچیں۔ مثلاً ضروری نہیں کہ ہم تک روپیہ پہنچ جائے بلکہ یہ ضروری چیز کہ روپیہ پہنچ جائے ہم تک بینکوں میں لاتعداد نوٹ اور روپیہ ہے تو سب بیکار۔ ضروری یہ ہے کہ ہم اس روپے تک پہنچ جائیں یا وہ روپیہ ہم تک پہنچ جائے۔ تو سب سے زیادہ ضروری چیز منفعت کا ہم تک پہنچانا ہوا۔ اور منفعت پہنچانا ہی رحمت ہے۔ تو رحمت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ تو رحمت کی مقدار ہر شے سے زیادہ ہو گی۔ تو خدا کی رحمت ہر شے

سے وسیع ہے۔ یہی معنی اس کے رحیم ہونے کے ہیں۔ اس کی رحمت کا کوئی
اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنت اللہ والملائکہ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ مر گئے
بغیر توبہ کئے کفر کی حالت میں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے فرشتوں
کی لعنت ہے اور لوگوں کی یا تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ یہ ہمیشہ اسی لعنت میں
رہیں گے لا یخفف عن ھم العذاب، ان پر عذاب کم نہیں کیا جائے گا۔
و لا ھم ینظرون، اور نہ ان کو عذاب سے بچنے کی مہلت دی جائے گی۔ یہاں
فوراً عذاب ملے گا جدا نہیں ہوگا۔ یہ ترجمہ تو ہوگیا اب یہاں ایک بات سمجھ لیں
حقیقی ایمان وہ ہے جو مرتے وقت ہو۔ دنیا میں جو ایمان لایا وہ حقیقی ایمان
نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ مرتد ہوجاتا ہے۔ مرتد ہونے کے بعد وہ پہلے
جو ایمان لایا وہ حقیقی ایمان نہیں تھا۔ منافقت تھی۔ حقیقی ایمان وہ ہے جس
کے بعد مرتد نہ ہو۔ اور وہ ایمان وہ ہے جو مرتے وقت ہو۔ یہ خیال ہے علماً
کی ایک جماعت کا۔ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ مرتد ہونے سے پہلے جو ایمان
لایا تھا وہ بھی حقیقی ایمان تھا۔ جب کافر ہوگیا تو وہ حقیقی کفر ہوگیا۔ جب ایمان
لایا تو اللہ اس سے خوش ہوگیا۔ اور انعام کا حقدار ہوگیا۔ اور اب جو اس نے کفر
کیا۔ تو اللہ ناراض ہوگیا۔ اور مستحق لعنت ہوگیا۔ یہ گروہ یہ کہتا ہے کہ ایمان میں استحقاق
ہے دائمی ثواب کا اور کفر میں استحقاق ہے دائمی عذاب کا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اللہ
کو اختیار ہے جس کو چاہے ثواب دے۔ جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ کلی کلاں
مختار ہے۔ بہت باریک بات ہے۔ اصل میں کفر و ایمان میں عذاب و ثواب کا

استحقاق ہے ہی نہیں۔ اب آپ کہیئے لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ۔ آپ کہاں گئے جنت میں۔ یہیں بیٹھے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہمارا ایمان کچا ہے۔ تو چلو اولیاء اللہ کا ایمان لے لو۔ کہاں گئے جنت میں۔ تمام انبیاء و صدیقین کا ایمان ثابت تھا۔ جنت ثابت نہیں تھی۔ یہ عقلی استحقاق نہیں ہے۔ وہ تو اس نے وعدہ کیا ہے۔ کہ اگر تم ایسا کرو گے تو میں تم کو جنت دوں گا۔ استحقاق ذاتی نہیں ہے۔ جو شخص ایمان لے آئے گا اور ایمان کی حالت میں مر جائے گا۔ تو بے شک میں اس کو جنت دوں گا۔ یہ وعدہ ہے۔ استحقاق نہیں ہے۔ اگر کوئی کفر کرے گا۔ اور کفر کی حالت میں مر جائیگا تو میں اس کو ہمیشہ دائمی دوزخ دونگا۔ یہ وعید ہے استحقاق نہیں ہے۔ نیکی خواہ عمل کی ہو یا اعتقاد کی اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو حرکت ہے۔ بہت زیادہ غامض بات ہے۔ حرکت ایسی گھٹیا چیز ہے۔ کہ وہ خود مجتمع الاجزاء نہیں ہے۔ آپ خاموش کھڑے ہیں۔ یہ سکون ہے اس کا کوئی نتیجہ نہیں۔ صرف وعدہ ہے کہ اگر ایسا کرے گا تو تجھ کو انعام دوں گا۔ اور ایسا کرے گا تو سزا دوں گا۔ اب انشاء اللہ آگے آئندہ بیان کروں گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِلٰـھُکُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ‏

(البقرہ - ۱۶۳)

تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے سوائے اُس کے اور وہ رحمٰن ہے۔ بہت رحمت کرنیوالا ہے اور دونوں جہان میں رحمت کرنیوالا ہے۔

الہ کے معنی معبود۔ معبود کسے کہتے ہیں؟ یہ اسوقت تک معلوم نہیں ہوسکتا۔ جب تک عبادات کے معنی معلوم نہ ہوں۔ معبود عبادت سے مشتق ہے۔ الہ معبود کو کہتے ہیں۔ مجھے عبادت کے صرف تین معنی بہت تجسس کرنے کے بعد معلوم ہوئے۔

بہت بڑے بڑے امام ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت کے معنی غایت تنظیم کے ہیں۔ اور مفسرین کی ایک جماعت یہ فرماتی ہے کہ عبادت کے معنی غایت تذلیل کے ہیں یعنی تعظیم کی ضد۔ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھنا ہی عبادت ہے۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جس فعل کے کرنے سے اللہ راضی ہو وہ فعل عبادت ہے۔ یہ تین معنی میرے علم میں آئے۔ اور کسی نے کچھ کہا ہو تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ تینوں معنی غلط ہیں۔ زیادہ تر آئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادت غایت تنظیم ہے غور کیجئے۔ یہاں بہت زیادہ تعظیم ہوتی ہے۔ پیروں کی تعظیم ہوتی ہے۔ ذی علم لوگوں کی تعظیم ہوتی ہے۔ امراء اور بادشاہوں کی تعظیم ہوتی ہے اور بہت زیادہ تعظیم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ پاؤں پر سر رکھ دیتے ہیں غرض زیادہ سے زیادہ جو تعظیم کی جا سکتی ہے کی جاتی ہے حکیم اجمل خاں بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کے یہاں جب نواب رامپور آیا کرتے

تھے تو یہ ان کے گھٹنے پکڑا کرتے تھے۔ اظہار تعظیم کیلئے طامس رو انگریز سیاح نمادہ کہتا ہے کہ چھ ماہ مجھے انتظار کرنا پڑا۔ تب باریابی ہوئی اور جہانگیر کو مجھے سجدہ کرنا پڑا مغل بادشاہوں کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ لیکن نہ تو بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ میری عبادت کر رہے ہیں۔ نہ تعظیم کرنے والا یہ سمجھتا تھا کہ وہ عبادت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی اچھی دلیل میرے خیال میں آئی کہ آدمؑ کو سجدہ جو فرشتوں نے کیا سب آئمہ اس پر متفق ہیں کہ یہ سجدہ عبادت نہیں تھا۔ بلکہ سجدۂ تعظیم تھا۔ کیوں کہ اللہ پاک غیر اللہ کو سجدہ کا حکم نہیں دیتا۔ امام ابن حزم جیسے علماء جو ظاہر قرآن اور ظاہر حدیث پر عمل کرنے والے ہیں اور دیگر آئمہ سب کا اسی پر اتفاق ہے کہ یہ سجدۂ تعظیم تھا۔ اور جن لوگوں نے پیر مرشد کو سجدہ جائز قرار دیا ہے وہ اسی آیت سے استنباط کیا ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے دلی میں حسن نظامی نے ایک رسالہ لکھا تھا کہ مرشد کو سجدہ تعظیم جائز ہے۔ میں نے ملا واحدی سے اس کا رد کرا دیا تھا کہ یہ غلط ہے۔ مرشد یا کسی غیر اللہ کو سجدہ قطعی ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال ہے کہ نماز کے آگے سے گذرنا سب کے نزدیک ناجائز ہے۔ سینہ کا زیادہ سے زیادہ اندازہ دو فٹ کا ہے اس مسافت کو قدم جو ایک فٹ کا ہے سیکنڈ کے نصف حصہ میں طے کر جائیگا۔ یہ سیکنڈ کے نصف حصہ میں نماز کے سامنے سے جب بے خیالی میں گذرنا بھی ممنوع ہے تو کسی کو سجدہ جو قیام سے بہت بڑھیا چیز ہے مرشد کو کیسے جائز ہو سکتا ہے جس میں بہرحال ٹائم لگے گا بالکل غلط بات ہے۔

جب سب نے یہ تسلیم کیا کہ یہ سجدہ عبادت نہیں ہے سجدہ تعظیم ہے تو پتہ چلا کہ ان کے نزدیک عبادت اور شے ہے اور تعظیم اور شے ہے یہ غلطی ہم نے ہی پکڑی ہے اور کسی نے نہیں پکڑی کہ جب تم خود سجدہ کی دو قسمیں کر رہے ہو تو تعظیم عبادت کیسے

ہوسکتی ہے۔ اگر تعظیم عبادت ہوگی تو سجدۂ تعظیم سجدۂ عبادت ہوجائیگا۔ لہٰذا عبادت کو تعظیم کہنا غلط ہے۔ بالکل اسی طرح تذلیل ہے۔ ظالم وجابر اور زبردست کے سامنے یہاں سب اپنی ذلّت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کے خادم ہیں غلام ہیں۔ اپنے کو حقیر ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کو عبادت کوئی نہیں سمجھتا۔ تو غایت تعظیم اور غایت تذلیل کو عبادت سمجھنا دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔ اب تیسری بات ذرا دل کو لگتی ہے۔ عبادت وہ فعل ہے جس سے اللہ راضی ہو۔ مگر غور کرنے سے پتہ چلا کہ یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ عبادت ہوتی ہے بتوں کی، شیطان کی۔ لا تعبد والشیطان شیطان کی عبادت مت کرو (مریم-۴۴) یہاں عبادت تو متحقق ہے۔ اللہ نے اس عبادت سے منع کیا ہے۔ وہ اس سے راضی نہیں ہے شیطان کی عبادت سے اللہ راضی نہیں ہے تو چاہیئے کہ یہ عبادت نہ کہلائے مگر اللہ نے اسے عبادت کہا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی عبادت سے خوش ہوتا ہے اسی طرح معاملات کی درستی سے راضی ہوتا ہے۔ جس طرح نماز سے خوش ہوتا ہے اسی طرح پورا تولنے سے راضی ہوتا ہے۔ یعنی اعمال کی درستی سے بھی راضی ہوتا ہے۔ اور عبادت سے بھی راضی ہوتا ہے۔ بلکہ عبادت کے مقابلے میں معاملات کی درستی سے زیادہ راضی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عبادت میں قصور ہوجائے تو قابل معافی ہے لیکن معاملہ میں قصور ہوجائے تو یہ ناقابل معافی ہے۔ اگر کسی نے جمعہ کی نماز نہیں پڑھی تو اس کا امکان ہے کہ وہ توبہ کرے تو معافی مل جائے مگر کسی کا روپیہ اگر دینا ہے اور وہ نہیں دیا تو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا۔ یعنی حق العباد حق اللہ پر مقدم ہے۔ اگر نماز پڑھ رہا ہے اور سجدہ میں بھی چلا گیا اور ایک بچہ کنوئیں کی طرف بھاگ رہا ہے اور اس کا قطعی امکان ہے کہ وہ کنوئیں میں گر جائے گا تو فوراً نیت توڑ دے۔ اور بچے کو پکڑ لے تو اس سے پتہ چل گیا کہ معاملات کی درستی اللہ تعالیٰ کو زیادہ

پسند ہے۔ تو اگر اللہ کی پسند ہو گی عبادت ہو گی تو معاملات بھی عبادت ہو جائیں گے۔ حالانکہ
شریعت نے دونوں کو الگ الگ رکھا ہے۔ ایک کو حق اللہ کہتے ہیں وہ عبادت ہے دوسرے
کو حق العباد کہتے ہیں وہ معاملات ہیں۔ لہٰذا یہ تینوں معنی غلط ہیں۔ اب آپ غور سے سنیں
میں ایک بہت باریک تحقیق بتاتا ہوں اس سے عبادت کے معنی سمجھنے میں بڑی سہولت ہو
جائے گی۔ یہاں برابر حرکت ہو رہی ہے کوئی جسم حرکت اور سکون سے خالی نہیں ہے۔ تمام اجسام تمام
حیوانات تمام انسان یہاں ہر شے حرکت کر رہی ہے۔ حرکت کہتے ہیں شے کا ایک مکان چھوڑ کر
دوسرے مکان میں آجانا۔ اس جانے کا نام حرکت ہے اور ایک ہی جگہ رہنے اور نہ جانے کا
نام سکون ہے۔ جتنے اعمال ہیں وہ نیکی ہوں یا بدی سب یا تو حرکت ہوں گے یا سکون ہونگے
ان ہی دو پر مشتمل ہوں گے۔ اور حرکت کے واسطے جہت چاہیے کس طرف حرکت کر رہا ہے۔
وہ جہت ہی مقصد ہوا کرتی ہے۔ اگر جہت نہیں ہو گی تو حرکت ہی کرتا رہے گا۔ منزل تک
نہیں پہنچے گا۔ جہت وہ آخری نقطہ ہوتا ہے جہاں جا کر حرکت ختم ہوتی ہے۔ ایک نقطہ سے
چلتی ہے دوسرے نقطہ تک پہنچتی ہے۔ اور بیچ کی مسافت کو قطع کرتی ہے۔ جس نقطہ سے
چلتی ہے اس کا نام ہے قبیح اور جس نقطہ پر ختم ہوتی ہے اس کا نام ہے حسن۔ جہاں سے چلتی ہے
اس کا نام برائی ہے اور جہاں پہنچتی ہے اس کا نام ہے بھلائی۔ اس حرکت کرنیوالے کی نگاہ میں
واقع سے بحث نہیں۔ حرکت کرنیوالا اپنے خیال میں قبیح سے حسن کی طرف حرکت کرتا ہے۔
اسی حرکت کا نام طلب ہے۔ مثلاً فلاں چیز کی طلب ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جہاں سے
آپ چل رہے ہیں اس کو چھوڑ رہے ہیں اور جہاں جا رہے ہیں اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
اور جو چیز حاصل ہو رہی ہے وہ اچھی ہے اور جو چیز چھوڑ رہے ہیں وہ بری ہے۔ اگر آپ
کے خیال میں وہ بھی بری ہوتی تو آپ وہاں کبھی بھی نہ جاتے۔ معاملات ہیں، عبادات ہیں۔ ..

لین دین میں سب جگہ آپ دیکھ لیجیے یہی ہو رہا ہے۔ مثلاً آپ کو دس روپے کا کپڑا خریدنا ہے تو جب تک کپڑے کی خوبی آپ کے خیال میں نہیں آئے گی آپ دوکاندار کو جیب سے دس روپے نکال کر نہیں دیں گے۔ جب تک دس روپیہ کے نوٹ کی خوبی آپ کے خیال میں رہے گی۔ کپڑے کو ملتے رہیں گے۔ نوٹ نہیں دیں گے۔ جونہی نوٹ کی برائی اور کپڑے کی بھلائی دل میں بیٹھے گی تو نوٹ نکال کر دے دیں گے اور کپڑا لے لیں گے۔ سب جگہ یہی ہو رہا ہے۔ اس کا نام طلب ہے یہ نئی اور بہت اچھی بات ہے۔ عام طور پر علماء بھی اس بات کو نہیں سمجھتے۔

اب طلب کی دو قسمیں ہیں۔ یا طلب ناقص ہے یا طلب کامل ہے۔ طلب ناقص وہ ہے جو پورا ہونے کے بعد پھر دوبارہ ہو یعنی مطلوب کے حاصل ہو جانے کے بعد بھی مطمئن نہ ہو۔ بلکہ طلب باقی رہے۔ فقیر کہتا ہے اللہ کے واسطے ایک پیسہ دے دو۔ پیسہ مل جاتا ہے تو آنہ دو آنہ مانگتا ہے۔ جب یہ مل جاتا ہے تو روپیہ دو روپیہ مانگتا۔ جب یہ مل جاتا ہے تو دس بیس مانگتا ہے پھر ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ پھر ملک گیری تک پہنچتا ہے۔ مگر طلب باقی رہتی ہے۔ بادشاہت مل جاتی ہے تو اور ملک طلب کرتا ہے۔ ساری دنیا مل جائے۔ اور بعض کو ملی ہے پھر بھی طلب ساقط نہیں ہوتی۔ باقی رہتی ہے۔ تو طلب ساقط نہ ہو باقی رہے ایسی طلب طلب ناقص ہوتی ہے کیونکہ مطلوب نہیں ہے جب مطلوب حاصل ہو جائیگا مطمئن ہو جائیگا اور طلب ساقط ہو جائے گی جزئی مرتب ہونا نہ مرہ بات ہے یعنی مطلوب بالذات حاصل ہو جانے کے بعد طلب ساقط ہو جاتی ہے

فوجدنا ما وعدنا ربنا حقا ہمارے رب نے جس کا وعدہ کیا تھا وہ چیز ہم کو مل گئی
(اعراف ۔ ۴۴)

اب کسی شے کی طلب نہیں رہی۔ قرآن بھرا ہوا ہے۔ طلب ناقص میں انسان حیوان سے

شریک ہیں۔ بھوک لگتی ہے تو بھوک کی برائی سے بھاگتا ہے۔ اس کو رفع کرنے کے سامان روٹی سالن گھاس وغیرہ جمع کرتا ہے۔ بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ ہر چھ گھنٹے بعد بار بار اسی طرح دوڑ لگاتا ہے اصل میں وہ چیزیں مطلوب نہیں ہوتیں اگر مطلوب ہوں تو ۲۴ گھنٹے کھانے پینے میں مصروف رہے۔ ۲۴ گھنٹے مطلوب ہوں۔ تھوڑی دیر کھانے کے بعد سیری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا لقمہ زیادہ مزہ کا ہوتا ہے۔ دوسرا اس سے کم ہوتا ہے واقعہ یہی ہے اگرچہ وہ محسوس نہیں کرتا۔ کم ہوتے ہوتے آخری لقمہ بے مزہ ہوتا ہے۔ بس وہیں سے اس کو چھوڑ دیتا ہے اب کیسا لذیذ سے لذیذ کھانا دیں وہ کہے گا بس اب نہیں یہ طلب ناقص ہے۔ طلب کامل وہ ہے جو مطلوب حاصل ہونے کے بعد طلب ساقط ہو جائے اب یہاں ایک بڑی اچھی بات نکل آئی یہاں کوئی مطلوب ایسا نہیں ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد طلب ساقط ہو جائے۔ تو وہ مطلوب اس جہان سے باہر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر مطلوب یہاں بھی نہ ہو اور باہر بھی نہ ہو تو طلب عبث ہو گئی۔ کوئی پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو۔ جواب ملے گا معلوم نہیں تو حرکت لغو ہو گئی۔ یعنی اس کا ہونا اس کے نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔ اور اسی حرکت و حس کا نام زندگی ہے۔ تو زندگی بیکار ہو گئی۔ تو یہ عالم عبث ہو گیا۔

وماخلقت ھذا باطلاً (آل عمران۔ ۱۹۱) اور عبث ہے نہیں تو اس کو باکار ہونا چاہیئے وہ باکاریت کیا ہے مطلوبیت تک پہنچنا اور مطلوب یہاں ہے نہیں تو لابد مطلوب اس جہان سے باہر ہے۔ اسی کا نام دار الحیوان ہے۔ اسی کا نام جنت ہے اسی کا نام خدا کی رضا ہے۔ طلب ناقص اور طلب کامل تو سمجھ میں آ گئی۔ اب اس پر غور کریں کہ طلب ناقص کے منافع میں کبھی مطلوب ناقص ہوتا ہے جو ذرائع ہیں وہ مطالب ناقص ہوا کرتے ہیں۔ کہ جب تک حاصل نہیں ہوتے ان کی طلب رہتی ہے۔ جب حاصل ہو جاتے ہیں ان کی طلب ہٹ جاتی ہے

نہیں۔ وہ ضرورت ہے بلکہ حاجت ہے۔ یہ ذریعہ ہے ان اعمال کا جو ذریعہ بنتے ہیں بقائے نسل کے عشق کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ پوری طلب ہو کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہیئے۔ اسی طرح کھانا مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ حصول قوت کا ہے۔ ورنہ کون ہے کہ اپنے مطلوب کی چبا چبا کر ایسی حالت خراب کرے کہ دو گھنٹے بعد اس کی ایسی شکل ہو جائے کہ کوئی دیکھنا گوارا نہ کرے۔ بڑی ٹکسالی حکمت کی باتیں ہیں اگر طلب بھی کامل ہے اور مطلوب بھی کامل ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ طلب اختیاری ہے یا اضطراری ہے۔ اگر یہ اضطراری ہے تو یہ عشق حقیقی ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ آپ کو عشق کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ یہ آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملے گی۔ اور اگر یہ طلب کامل اختیاری ہے تو اسی کا نام عبادت ہے۔ مطلوب کامل کی پوری طلب اپنے اختیار سے کرے اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ اس کو اس نے خشوع و خضوع کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ مخلصین مخلصین کئی جگہ آیا ہے۔ وہ عربی کا لفظ ہے میں نے آپ کو اردو میں سمجھا دیا ہے۔ اپنے اختیار سے کامل طلب ہو۔ پوری توجہ اسی کی طرف ہو اس میں غیر اللہ کا شائبہ نہ ہو یہی عبادت ہے۔

اب اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات بنا کر مخلوق کی تقسیم کردی۔ دو حصے کر دیئے۔ ایک انسان اور ایک غیر انسان۔ انسان کے علاوہ پوری کائنات اس لئے بنائی کہ یہ کل کی کل انسان میں خرچ ہو جائے۔ براہِ راست یا کسی واسطے سے جو شے بظاہر بیکار نظر آتی ہے اگر غور کریں تو وہ دس بیس واسطوں سے انسان میں کام آئیگی۔ یا کسی ایسی شے میں کام آئے گی جو بالآخر انسان کے کام میں آئیگی۔ ایک مچھلی جو سمندر کی گہرائیوں میں رہتی ہے جس کو کبھی دیکھا بھی نہیں گیا۔ وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتی ہے کہ سمندر کا پانی جب بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور کھیتوں میں برستا ہے تو اس میں اس کی حرکت کی وجہ سے

خاص خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ہم اس کو نہیں جانتے۔ اللہ کی حکمتیں بحر زخار ہیں ہم نہیں جان سکتے سوائے اس کے کہ جتنا اس نے ہم کو بتا دیا۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (عبس ۱۸) ہم ان چیزوں سے پیدا کرتے ہیں جن کو تم جانتے بھی نہیں، ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سے پیدا ہو گئے۔ اس سے پیدا ہو گئے اللہ ہی کو علم ہے کہ کن چیزوں سے پیدا کیا جب کل شے انسان میں خرچ ہو رہی ہے اور ان سب کو انسان جب اپنے آپ میں خرچ کر کے یہ ایک شے بن گیا تو اب یہ شے یہ انسان کس لئے ہے؟ کل کائنات تو اس کیلئے ہے اور یہ کس کیلئے ہے تو یہ اختیاری طور پر جب اس کو علم ہو گیا کہ یہ اپنے بنانے والے خالق کیلئے ہے تو یہ جان لینا ہی علم ہے اور اس علم کا نام ایمان ہے۔ اس طلب کا اس حرکت کا اس عمل کا نام عبادت ہے۔ یہ ایمان و عمل کی حقیقت ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (طٰہٰ ۴۱) میں نے تجھ کو اپنی ذات کیلئے بنایا۔ کائنات کو اس کے لئے بنایا۔ اور اس کو اپنے لئے بنایا۔ اس کے عرفان کا نام ایمان اور اس کے عمل کا نام عبادت۔ جو شے جس کیلئے ہوتی ہے وہ اس شے میں اپنے آپ کو کھپا دیتی ہے۔ بکرا آپ کے لئے ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ بکرا کھپ کھپا کر وہ آپ کو بنا دے گا۔ اسی طرح انسان خدا کیلئے ہے اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ انسان نے اپنے آپ کو خدا پر نثار کر دیا۔ موجودات میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس پر نثار ہوا جائے سوائے میرے جو شے نثار ہونے کے قابل ہے وہ صرف اللہ ہے اور کوئی نہیں ہے اور یہ نثار ہونا ہی بقا ہے۔ ظاہر میں وہ نثار ہو رہا ہے۔ حقیقت میں وہ بن رہا ہے جیسے آگ حرارت کیلئے ہے آگ جل رہی ہے بظاہر فنا ہو رہی ہے لیکن حقیقت میں وہ بن رہی ہے اگر حرارت جاتی رہے تو آگ آگ نہ رہے۔ بڑے غور کی بات ہے۔ سورج روشنی کیلئے ہے

اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر روشنی نہ رہے تو سورج سورج نہ رہے اسی طرح اگر آپ خدا پر نثار ہو گئے کھپ گئے تو فنا نہیں ہوئے بلکہ بن گئے۔ باقی رہا اور جہاں باقی رہے گا اس مقام کا نام جنت ہے۔ جنت مقصود نہیں ہے وہ تو حیات ہے حس و حرکت ہے حیوانیت ہے۔ یہاں حیوانیت کو برس۔

ایک سو بیس برس وہاں لا انتہا مدت مگر رہا حیوان کا حیوان ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان دار آخرت جو ہے وہی حیوان ہے۔ یہ مقصود کیسے ہوگا یہ تو انسان ہے۔ (عنکبوت ۶۴)
انسانی نقطے سے حرکت کر رہا ہے تو اونچے نقطے پر جائیگا اور اوج جو ہے وہ اس کا خالق ہے وہ اس طرف جائیگا۔ مانا کہ وہ حیوان اس حیوان سے بہتر ہے مگر نوعیت تو ایک ہی ہے وہی کھانا ہے وہی پینا ہے۔ وہ تو نقطہ اوّل ہوگا نقطہ ثانی نہیں ہو سکتا۔ اسی سے تو سجا رہا ہے حوریں ہیں۔ باغات ہیں نہریں ہیں یہ مقصود نہیں ہیں وہ بیٹھنے کی جگہ ہے وہاں بیٹھ کر ہو۔ مقصود تو خدا کا دیدار ہے۔ خدا کی ذات ہے۔ وہ دیدار کس جگہ ہوگا۔ اس جگہ کا نام باغات حور و قصور جنت ہے۔ آپ نیت کیجئے "میں نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز خاص واسطے حور و قصور کے" نہیں کر سکتے یہ حرام ہے نیت خاص واسطے اللہ کے ہوگی عوام الناس چونکہ سمجھ نہیں سکتی تھی اس لئے اس کی ذرا سی تعریف کر دی کہ جو جگہ ایسی ہے تو مقصود کیسا شاندار ہوگا۔ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ وہ اللہ واحد ہے تو یہ واحد کبھی تو اسم ہوتا ہے (اخلاص۔۱)
ایک دو تین میں سے ایک یہ تو اسم ہے عددی ہے۔ اور میں ایسی گلی سے گذرا جو ایک ہی یہاں ایک صفت ہے تو یہاں واحد جو ہے وہ اس کی صفت واقع ہوا ہے۔ واحد کسے کہتے ہیں؟ واحد اسے کہتے ہیں کہ جس اعتبار سے اس کو واحد کہا جا رہا ہے اس اعتبار سے وہ منقسم نہ ہو سکے۔ خواہ اور اعتبار سے ہو جائے۔ ایک انگلی ہے تو جس اعتبار سے اس کو ایک کہا جا

انگلی غیر منقسم ہے ویسے اس کی تقسیم تین پوروں میں ہوتی ہے یہ دوسرا اعتبار ہے۔ ایک میز کے دو ٹکڑے کر دیجئے۔ وہ تقسیم ہو گئی مگر یہ ٹکڑے میز کے ٹکڑے ہیں میز نہیں ہے میز تو ایک ہی ہے اور وہ غیر منقسم ہے۔ ٹکڑا اور چیز ہے میز اور چیز ہے۔ اسی طرح ایک ہفتہ (۸ دن) ایک عشرہ (۱۰ دن) ایک کوڑی (۲۰) ایک سینکڑہ (۱۰۰) یہ سب قابل تقسیم ہیں لیکن جس اعتبار سے ان کو ایک کہا جا رہا ہے اس اعتبار سے ان میں سے کوئی تقسیم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے کوئی وجود وحدت سے خالی نہیں ہے۔ اس بنا پر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ وجود اور وحدت ایک چیز ہے۔ اس پر بعض اماموں نے یہ اعتراض کیا کہ نہیں موجود منقسم ہے واحد اور کثیر پر موجود واحد ہوگا یا کثیر ہوگا۔ اس کی دو قسمیں ہیں اگر موجود اور واحد ایک چیز ہو تو اس کی تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ کثیر کی طرف یہ اعتراض غلط ہے بات انکی سمجھ میں نہیں آئی۔ غور کرنے کی چیز ہے۔ دیکھئے سونا ہے اس کی بالی بنائی کنگن بنایا۔ اب سونے کی تقسیم ہو گئی دو گہنوں کی طرف۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی چیز ہے جو بالی وہی سونا ہے وہی کنگن ہے۔ سونا جس اعتبار سے کس لگا کر پتہ چل جاتا ہے اس اعتبار سے دونوں جگہ سونا موجود ہے جوں کا توں۔ بڑی غلطی پکڑی میں نے۔ وہ صحیح نہیں ہے تقسیم وہ ایک ہی چیز ہے

الھکم الہ واحد۔ ایک تو اس کے معنی ہیں کہ الہ ایک ہی شئے ہے۔ مختلف چیزوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ مرکب نہیں ہے ذی اجزاء نہیں ہے۔ جیسے جسم کے اجزاء ہیں کہ بعض جسم تو ایسے ہیں کہ دیگر اجزاء سے مل کر بنے ہیں۔ بعض اجزاء ایسے ہیں کہ وہ دیگر اجزاء سے مل کر تو نہیں بنے مگر آپ ان کو کاٹیں تو ان کے ٹکڑے ہوتے چلے جائیں گے ان کو اجزائے مقداریہ کہتے ہیں۔ اور جن اجزاء سے جسم بنتا ہے ان کو اجزائے عددیہ کہتے ہیں جیسے حلوہ ہے کہ اس کے اجزائے عددیہ گھی، روا، کھانڈ موجود تھے۔ یا جیسے پانی ہے کہ اسکے

اجزاء نہیں ملتے۔ اگر کہو کہ یہ دو گیسوں سے مل کر بنا ہے تو چلو ان دو گیسوں کو لے لو۔ وہ گیس کیسی ہے اگر وہ بھی کسی گیس سے بنی ہے تو اور آگے چلو آخر ایک گیس ایسا آجائے گا کہ وہ کسی گیس سے نہ بنا ہو گا۔ تو واحد کے ایک معنی تو یہ ہیں جیسے نقطہ جزء لایتجزا۔ مرکب نہیں ہے مفرد ہے۔ اور ایک معنی یہ ہیں کہ الوہیت واحد ہے یعنی موجودات میں الہ بننے کے قابل کوئی شئے نہیں ہے۔ صرف وہی ہے یہ دونوں معنی یہاں لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرکب نہیں ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کسی سے پیچھے نہیں ہے مرکب پیچھے ہوتا ہے اپنے اجزاء سے۔ مرکب محتاج ہوتا ہے اجزاء کا اور اجزاء مرکب کا غیر ہوتے ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ مرکب ہو گا تو غیر کی طرف محتاج ہو گا اور جب وہ غیر کی طرف محتاج ہو گا تو اس کے لیے ابتدا ہو جائیگی۔ لااول نہیں رہے گا۔ ابتدا ہو گی۔ اور جس شے کے لئے ابتدا ہو گی اس کا کوئی ابتدا کرنیوالا ہو گا تو وہ خالق نہیں رہنے کا۔ اس لئے وہ مرکب نہیں ہو سکتا۔ سیدھے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ مرکب ہو گا تو غیر کی طرف محتاج ہو گا اور جو محتاج ہو گا وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔

یہاں بڑی ذہنی بحث ہے اور اہم۔ یہ بات کہ اللہ عالم ہے، قادر ہے، سمیع ہے بصیر ہے۔ یہ جو صفات ہیں۔ اللہ عالم ہے۔ تو یہ جو عالم ہی بعینہٖ وہی اللہ ہے یعنی عالم کا تصور کریں اور اللہ کا تصور کریں تو دونوں کو ایک پائیں گے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ انسان ایک شے کا تصور کرے اور اس کے علم کا تصور اس میں نہ آئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اللہ کا تصور کرے اور اس کے عالم ہونے کا تصور اس کو نہ آئے تو اس سے پتہ چل گیا کہ اللہ ہونا اور شے ہے اور عالم ہونا اور شے ہے۔ تو اللہ کے ساتھ کوئی اور شے ملی تو وہ عالم ہوا۔ تو ترکیب لازم ہو گئی۔ یعنی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شے عالم ہے یا عالم نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے

کہ یہ ذات ہے یا ذات نہیں ہے۔ یعنی عالم ذات اور علم ان دو چیزوں سے مرکب ہے۔
اللہ مرکب ہو گیا۔ اور اوپر ہم نے بیان کیا کہ اللہ مرکب ہو نہیں سکتا کہ مرکب محتاج ہوتا ہے۔
اور ایک اور جماعت حکماء اور مسلمانوں کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ عالم نہیں ہے یعنی وہ مجموعہ نہیں
ہے اللہ اور علم کا۔ وہاں صفات کی نفی ہے۔ وہاں صفت نہیں ہے۔ جو اثر علم پر مرتب ہوتا ہے
وہی اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ انہوں نے دقت سے بچنے کیلئے یہ کہا لیکن اس میں
یہ دقت ہے کہ ہم کہیں کہ اللہ اللہ ہے اور کہیں کہ عالم عالم ہے۔ یہ ٹھیک ہے اللہ عالم ہے
اس کا مفہوم وہ نہیں ہے الگ ہے۔ اسلئے معلوم ہو گیا کہ اللہ اور شے ہے اور عالم اور شے ہے
تو حکماء اور معتزلہ کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ اللہ کو علم نہیں ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ عالم ہے
اس صورت میں مرکب ہونا لازم آتا ہے۔ عالم تو وہ بھی کہتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ مجموعہ نہیں ہے
ذات اور علم کا، بلکہ وہ ذات ہی عالم ہے تو اس پر اعتراض یہ ہے کہ جب ذات کا تخیل کریں
تو عالم ہونے کا تخیل ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ذات کے تخیل سے عالم کا تخیل نہیں ہوتا۔ یہ دلیل
سے ثابت ہو گا۔ تو ذات کا تصور بے دلیل ہو رہا ہے اور صفات کا تصور دلیل سے ہو رہا ہے۔
تو معلوم ہوا کہ صفات جو ہیں وہ عین ذات نہیں ہیں۔ ورنہ ذات کے ساتھ صفات کا تصور ہونا
چاہیئے۔ اس کا جواب صحیح معنوں میں مجھے نہیں ملا۔ اول تو ترکیب لازم آتی ہے۔ دوسری
صورت میں کہ شے واحد ہے تو مختلف صفات کے ساتھ متصف ہونا۔ یہ متصور نہیں۔ کوئی
جواب اس کا آئمہ کے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ قائل ہیں کہ صفات غیر ذات ہیں۔

یہاں دونوں گروہوں سے عظیم الشان غلطی ہوئی ہے۔ یہ ذات و صفات کی جو تقسیم
اس میں تمام حکماء کو دھوکہ لگا۔ تمام متکلمین کو دھوکہ لگا تمام علماء کو دھوکہ لگا۔ بالکل بات
کو نہیں سمجھے۔ یہ تقسیم تو محض ذہن میں ہے۔ واقع میں ہے کہاں۔ وہ تو ایک ہی شے ہے۔

چاہے اس کا نام ذات رکھو چاہے صفات رکھو۔ دودھ سفید ہے۔ یہاں جو دودھ ہے وہی سفید ہے۔ جو دودھ ہے وہ چیزیں نہیں ہیں کہ ایک سفید ہو ایک دودھ ہو۔ اور دونوں مل کر سفید دودھ بنیں۔ یہ تخیل کی قوت ہے کہ وہ کھینچتا ہے۔ اور اس کے تین ٹکڑے کر دیتا ہے دودھ سفید اور ان کے درمیان تعلق ہے تو یہ تین ٹکڑے واقع میں نہیں ہیں۔ حکایت میں ہیں تو صفت کی نفی کے باوجود حکایت میں ہونے کے واقع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ تو بعینہٖ وہی عالم ہے وہی علم ہے۔ وہ تم نے خدا کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ ساری کائنات میں ایک ہی چیز ہے۔ یہ بات میں نے ہی کہی ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ سب سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ ذات و صفت کی تقسیم صرف دماغ میں خیال میں ذہن میں ہے۔ واقع میں کہیں بھی نہیں ہے کہ سفیدی الگ ہو۔ دودھ الگ ہو۔ آگ الگ ہو۔ حرارت الگ ہو۔ سورج الگ ہو روشنی الگ ہو۔ اور پھر ان سے چپکا یا جائے۔ کہیں نہیں ہے انہوں نے مصنوعی رنگ جو کپڑے پر چڑھتا ہے اس سے پوری کائنات کو قیاس کیا۔ اور پھر اسی خدا کو قیاس کر لیا سرخ رنگا ہوا کپڑا۔ وہ سرخ نہیں ہے بلکہ ایک جسم دوسرے جسم کو چپکا ہوا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ تمہارا رب ان صفتوں (صفت ذات) سے پاک ہے جو یہ بیان کر رہے ہیں۔ تو واحد کے معنی سمجھ میں آ گئے کہ اللہ ایک ہے۔ یعنی غیر مرکب ہے۔ اب دوسرے معنی کہ الوہیت میں ایک ہے۔ تمام کائنات میں کوئی شئے الوہیت کے قابل نہیں ہے۔ سوائے اس کے وہی خالق ہے۔ اور کسی میں ایسا کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔ یہ معنی ہیں لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (انبیاء) اگر زمین و آسمان میں ایک کے علاوہ خالق ہوں گے تو زمین و آسمان انتظام سے نکل جائیں گے۔ یہ نظم جاتا رہے گا۔ اتنی بڑی دلیل ہے اس کا نام ہمارے علما نے برہان تمانعی رکھ دیا ہے

بڑے شرم کی بات ہے۔ اس سے بہتر تو کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور شے اس قابل ہوگی کہ اس پر نثار ہو تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ہر شے تو تمہارے اوپر نثار ہو رہی ہے۔ اگر تم اس میں سے کسی پر نثار ہو گئے تو وہ یوں تباہ ہوئی کہ وہ تمہارے اوپر نثار ہونے کے لئے بنی تھی اور تم اس پر نثار ہو گئے۔ اور تم یوں تباہ ہوئے کہ تم اس پر نثار ہونے کے لئے نہیں بنے تھے اور تم اس پر نثار ہو گئے تو تم بھی تباہ ہو گئے۔ اور وہ شے بھی تباہ ہو گئی۔ دونوں تباہ ہو گئے تو گویا تمام کائنات تباہ ہو گئی۔ اور سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اتنی اچھی دلیل ہے۔ بڑی اچھی تقریر کر دی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ۔ ۱۶۴)

زمین و آسمان اور ان کی پیدائش میں اللہ تبارک و تعالے کے وجود کی نشانیاں ہیں. تو اب ان نشانیوں کی شناخت کیونکر ہو ۔ یہ صانع کے وجود پر کیونکر دلیل بن رہی ہیں ۔ اہم بات ہے. پہلے اس بات کو دیکھیں. جو شخص اس کا قائل ہے. کہ یہاں کوئی شے موجود نہیں ہے۔ اس سے تو اس وقت بحث ہے نہیں ایسے آدمی کو سمجھانے کے لئے آگ کی چنگاری سے داغنا ہے. کہ اس کی جلن سے وہ یہ کہے کہ یہ کیا ہے یعنی وہ شے کے وجود کا قائل ہو گیا۔ اس کے علاوہ سب متفق ہیں کہ شے موجود ہے۔ جو شے موجود نہیں ہے۔ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا یا جو شے موجود ہے اور حواس سے محسوس نہیں ہے۔ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا. جو شے غیر حاضر ہے. اس کو حاضر کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس طریقہ ہی کا نام دلالت ہے۔ شے کا اس طرح ہونا کہ اس سے دوسری شے سمجھ لی جائے نا معلوم شے معلوم ہو جائے یہ دلیل ہے۔ پہلی شے دلیل دوسری شے مدلول یہ نام ہیں ان کے۔ غور کیجئے. بہت اہم ہے۔ تعالی یہ شے ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ اس کے خلاف ہو سکتا ہے یا نہیں. خلاف کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اس تعالی ہی کو معدوم کر دیا جائے اور ایک معنی یہ ہیں کہ اس کی طول عرضی شکل ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے ۔ یہ سب خلاف ہے. خلاف کی کئی صورتیں ہیں. گھٹانا. بڑھانا. معدوم کر دینا وغیرہ. پھر گھٹانے بڑھانے کی لاتعداد صورتیں ہیں۔ کم بڑھایا. زیادہ بڑھایا۔ اس سے زیادہ وغیرہ. جب اس کے خلاف ممکن

تو دراصل یہ بھی ان ہی چیزوں میں سے ایک ہے۔ جس کے خلاف ہو سکتا ہے۔
اس کے خلاف جتنی صورتیں ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے۔ تو جو شے ہو سکتی ہے
وہ ہو گی اور جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یہ ان میں شامل ہے۔ ان میں کا ایک فرد ہے
تو یہ "ہے" نہیں۔ بلکہ ہوئی ہے۔ تو یہاں جتنی اشیاء موجود ہیں وہ "ہیں" نہیں
بلکہ "ہوئی ہیں"۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہے تو
اس کے خلاف کوئی صورت ہونے کی ہی نہیں۔ ہوئی ہے کہ یہ معنی ہیں کہ پہلے
نہیں تھی پھر ہوئی۔ یہاں جتنی موجودات ہیں۔ زمین آسمان بادل جمادات
حیوانات تمام خالق پر دلالت کر رہی ہیں۔ کس طرح وہ میں نے آپ کو نکال کر بتلا
دیا۔ یہ استخراج نیا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ ہر شے کے ہونے پر نظر ڈالنی
ہے۔ کہ آیا اس کے خلاف ممکن ہے یا نہیں۔ اگر ممکن ہے تو یہ درحقیقت خود بھی
ان ممکنات میں شامل ہے۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں ہے۔ جس کے خلاف ممکن نہ
ہو۔ تو یہ سب اشیاء ہوئی ہیں۔ اور خالق کائنات کو یہ نہیں کہیں گے کہ ہوا ہے بلکہ
وہ "ہے"۔ اس کا خلاف ممکن نہیں ہے۔ ہم کل تھے۔ ہم کل ہوں گے۔ مگر خالق
کائنات کو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ تھا یا وہ ہو گا بلکہ وہ "ہے"۔ ازل سے ابد تک پورے
دائرہ میں ہے۔ یہ نکتہ ہے۔ یہ جامع ہے۔ اب اس کو جاری کیجئے۔ آسمان میں نشانی
ہے۔ اب نکالیے کہ یہ آسمان جتنی مقدار بھی اس کی ہے اس سے ایک انچ زیادہ بھی
ہو سکتا تھا۔ اور کم بھی ہو سکتا تھا۔ کمی بیشی کی دونوں صورتیں ممکن ہوئیں۔ پھر یہ
موجود مقدار کے ساتھ مقدر ہوا تو معلوم ہوا کہ موجودہ مقدار اس ذات کا تقاضہ نہیں
ہے۔ کیونکہ اگر تقاضہ ہوتا تو اس کے خلاف ممکن نہیں ہوتا اور خلاف ممکن ہے۔ تو

معلوم ہوا کہ اس کی ذات سے باہر کسی طاقت نے اس موجودہ تعین کے ساتھ معین کر دیا۔ زمین کی حرکت دو قطبین کے درمیان ہے ان قطبین سے گزرتے ہوئے سینکڑوں دائرے بن سکتے ہیں اور ہر دائرہ پر دو متقابل بے شمار نقطے بن سکتے ہیں۔ اور ہر ایک ان میں قطبین ہیں۔ ہر قطبین میں حرکت ممکن تھی۔ مگر ان ہی دو قطبین میں حرکت ہوئی۔ دوسروں میں نہیں ہوئی۔ اشیاء کے رنگ ہیں۔ ان کے خلاف رنگ ہو سکتے ہیں۔ حرکت تیز اور ہلکی ہو سکتی ہے۔ مگر ہر شے کے ساتھ اس کی خصوصیات مقدر کر دی گئی ہیں وہ ان کی ذات کا خاصہ نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے خلاف ممکن ہے۔ اجسام فلکی کی حرکت بعض کی تیز اور بعض کی سست ہیں۔ اگر حرکت ان کی ذات کو لازم ہوتی۔ تو سب کی حرکت ایک ہی ہوتی۔ تو معلوم ہوا کہ کسی اور نے اس کو لازم کر دیا ہے۔ ذات کو لازم نہیں ہے وہ اور کوئی ہی خالق ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ مختلف حرکتیں کرانیوالا کوئی اور ہے۔ جو اشیاء کی ذات سے باہر ہے۔ اب آپ غور کر کے دیکھئے کہ یہاں جتنی اشیاء ہیں جسم سب میں مشترک ہے۔ سب میں لمبائی چوڑائی اور عمق پایا جاتا ہے تو اگر خاصیت جسم کا تقاضہ ہوتی تو ہر جسم کی خاصیت ایک ہی ہوتی۔ مگر خاصیتیں جدا جدا ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی مخصوص کرنے والے نے ہر جسم کو اس کی انفرادی خاصیتوں سے مشخص کر دیا ہے ان کی ذات کا تقاضہ نہیں ہیں۔ یہ اصولی چیز بیان کر دی۔ اب جتنے چاہیں دلائل نکال لیں۔ فلک متحرک ہے۔ یہ ثابت ہو گیا ہے۔ تو اب یہ حرکت یا ازلی ہے۔ یا ازلی نہیں ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ ازل کہتے ہیں غیر مسبوق کو جو کسی سے پیچھے نہ ہو اور حرکت ہے ایک مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا یعنی ایک دوسرے سے پہلے ہے اور دوسرا ایک کے پیچھے ہے۔ یعنی اس میں پیچھا پن موجود ہے۔ لہٰذا یہ ازلی

نہیں رہی۔ ازل اور حرکت کا اجتماع ناممکن ہے۔ اب دو ہی صورتیں رہ گئیں
یا تو جسم موجود ہی نہیں ہو گا یا اگر ہو گا تو ساکن ہو گا۔ اگر موجود تھا اور ساکن تھا۔ تو
اب کسی حرکت دینے والے نے حرکت دیدی اور اگر موجود نہیں تھا تو اس کو پیدا کیا
پھر حرکت دیدی دونوں صورتوں میں تخلیق کی نشانی موجود ہو گئی۔ زمین و آسمان
میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ سمجھیں گے بے عقل لوگوں کو سمجھنے میں
دیر لگے گی۔ یا سمجھ میں نہیں آئے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر موجود میں ایک ایسی خصوصیت
ہے۔ جو دوسرے موجود میں نہیں ہے۔ اگر امتیازی خصوصیت نہ ہو تو وہ سب
ایک ہو جائیں گے۔ مبتدو امتیاز ہر ایک میں موجود ہے۔ تو یہ امتیازی خصوصیت
جو موجود میں ہے وہ موجودیت کا تقاضہ نہیں کیونکہ موجودیت ہر شے میں مشترک ہے
مثلاً زیدیت اگر انسانیت کا تقاضہ ہوتی تو جہاں انسان ہوتا زید ہی ہوتا۔ تو یہ
خصوصیت متعین کی ہوئی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس تعین کا پیدا کرنے والا کوئی ہے۔
وہ کیسا ہے؟ وہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا ہو گا۔ تو جس طرح اس کو بنانے
والے کی ضرورت ہوئی۔ اس کو بھی بنانے والے کی ضرورت پڑے گی۔ تو معلوم ہوا کہ
بنانے والا بننے والے کا غیر ہے۔ بننے والے کے کیا معنی کہ وہ پہلے نہیں تھا۔ پھر
ہوا تو بنانے والا کیسا ہو گا۔ وہ ایسا نہیں ہو گا۔ کہ جو پہلے نہ ہو پھر ہو۔ بہت آسانی
سے میں نے سمجھا دیا۔ پھر وہ کیسا ہے۔ زبان قاصر ہے۔ ادا نہیں کر سکتی۔ یوں
لوگ کہدیتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے لیکن ہمیشہ دلالت کر رہا ہے زمانہ پر اور زمانہ
میں اس کی قابلیت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود نو پید ہے۔ بہر حال وہ سمجھایا
نہیں جا سکتا۔ اگر سمجھایا جا سکتا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اس

جیسی کوئی شے ہو تو کہا جائے کہ وہ ایسا ہے تو ایسی کوئی شے نہیں۔ یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہو جیسے مگرمچھ کو کہیں کہ چھپکلی کو بہت بڑا تصور کرو یا شیر کو کہیں کہ گدھے کی برابر بلی تصور کرو۔ تو ایسی بھی کوئی شے نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اس سے ملتی جلتی تصور کرو۔ اس لئے اس کا صحیح شعور نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے موٹر ہے۔ اس کا امکان ہے کہ صاحب موٹر مٹی بن کر لوہا بن جائے اور پھر وہ لوہا موٹر یا اس کا کوئی جز بن جائے تو یہ موٹر صاحب موٹر سے اتنی گھٹیا نہیں ہے۔ جتنے آپ اللہ تعالیٰ سے ہیں کہ آپ اللہ کبھی نہیں ہوسکتے، تو یہ موٹر جب صانع موٹر کو نہیں جان سکتی تو آپ اپنے صانع کو کیونکر جان سکتے ہیں۔ جتنا وہ بتا دے گا اتنا جان جائے گا حقیقت کو نہیں جان سکتا بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ - ۱۱) اس جیسی کوئی شے ہے ہی نہیں تو اب وہ کیسے پہچانا جائے۔ یہاں مصنوعی صانع موجود ہیں۔ ان صنعتوں سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی بنانے والا ہے لیکن وہ بنانے والا کیسا ہے۔ لمبا ہے۔ کالا ہے۔ گورا ہے۔ دبلا ہے، بوڑھا ہے۔ جوان ہے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اسی طرح اصلی خالق کا پتہ اس کی مخلوق سے چلے گا۔ مگر وہ کیسا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوسکتا۔ اسی لئے قرآن میں مصنوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ان صنعتوں پر غور کرو تو صانع کا پتہ چل جائے گا۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ وہی جو اوپر بیان ہوچکا ہے۔ باوجود یہ معلوم ہو جانے کے کہ خالق موجود ہے۔ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کے کان کیسے ہیں۔ آنکھ کیسی ہے۔ ہاتھ کیسے ہیں۔ کیا قابلیت ہے۔ صرف اتنی قابلیت سمجھ میں آتی ہے۔ جو مصنوعات سے ظاہر ہے۔ وہ بھی ان مصنوعات جو اس عالم میں ہیں۔ اس کے علاوہ جو مصنوعات ہیں۔ ان کا بھی پتہ

نہیں وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (مدثر-۳۱) اپنے رب کے لشکروں کو کوئی نہیں
جانتا سوائے اس کے۔ ایک لشکر جو سامنے ہے۔ اس کی صناعی کو جان سکتے ہیں
باقی لشکروں کا کچھ پتہ نہیں کہ اس میں کتنی صناعیاں ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ہر شے مرکز میں
واقع ہے۔ لمبائی۔ چوڑائی، کمی۔ زیادتی۔ حسن اور قبح۔ اچھائی برائی۔ خواہ موجودات
کی کتنی ہی قسمیں ہوں۔ وہ جو پیدا ہوئی ہیں۔ وہ دونوں لائن کے بیچوں بیچ میں آئی
ہیں۔ ہر شے جو پیدا ہوئی ہے وہ اس سے کم بھی ہو سکتی تھی اور زیادہ بھی۔ اور
اس کمی بیشی کی لائنیں دونوں طرف لا انتہا چلی گئی ہیں۔ یہ بالکل بیچوں بیچ ہے۔
لہٰذا قدرت کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ پتہ چلنے کے معنی محدود ہونے کے ہیں۔
وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ-۲۵۵) یہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے
الا یہ کہ جتنا وہ چاہے۔ تو حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ یہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ
آسمان زمین میں بے شمار دلائل ہیں۔ ایک مرکب کو لیجئے۔ اس کا ایک ننھا سا جز
لیجئے۔ وہ جز جس جگہ ہے وہ اس کے خلاف جگہ بھی آ سکتا تھا۔ اور یہ جگہیں بیشمار
ہیں۔ تو ہر ذرہ بے شمار دلائل اپنے صانع کے وجود پر پیش کر رہا ہے۔ ایک
جز لا انتہا مرتبہ پر دلالت کر رہا ہے۔ مگر اس کا صحیح ادراک نہیں ہو رہا ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ حس کمزور پڑ گئی ہے۔ جس طرح میعادی بخار میں منہ کا مزہ بدل
جاتا ہے۔ ہر میٹھی چیز کڑوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جب تک صفرہ نہیں اترے گا
میٹھا اس محسوس نہیں ہو گی۔ آنکھ میں ابتدائے نزول ماء کے وقت ایسے ایسے عجائب
غرائب نظر آتے ہیں۔ اور ایسے عجیب خیال پیدا ہوتے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں
ہوتی۔ یہ حاسے کی خرابی ہے کہ ان کو سننے اور معلوم کرنے کے بعد متاثر نہیں ہوتا

رسول اللہ نے فرمایا 'ویل' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ افسوس ہے اس شخص پر جو ان آیات کو سنے اور غور نہ کرے۔ عاقل لوگوں کے لئے فرمایا۔ کیا اب آپ کہیں گے کہ ہم نے غور کیا۔ مگر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تو یہ حاسہ کی خرابی ہے۔ وہ خرابی وہ ٹائیفائڈ کیا ہے۔ طلب دنیا۔ دنیا کی طرف التفات۔ جب تک دنیا کی طرف نظر رہے گی۔ خالق کائنات کو نہیں دیکھ سکتا۔ سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ادھر سے نظر پھیرے ادھر نظر آجائے گی۔ اور دنیا کی طرف جو نظر ہے۔ وہ بھی اسی کی عنایت ہے۔ ورنہ اس کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایسا ہے جیسے چاند تالاب میں۔ چاند کو تالاب میں دیکھ رہا ہے اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ تو دنیا جو ہے یہ تالاب ہے۔ جب تک اس کی چمک پڑ رہی ہے۔ اس کو دیکھ رہا ہے۔ جب چمک ہٹ جائے گی تو بیوی سے بچوں سے اور دنیا کی جتنی شے ہیں۔ سب سے منہ پھیر لے گا۔ کوئی بیماری ہو جائے۔ دکھ ہو جائے اور اس وقت کوئی کہے کہ لو یہ چابیاں دکان جاؤ تو کہے گا کہ میں مر رہا ہوں تمہیں چابیوں اور دکان کی پڑی ہے۔ جس مثال سے میں نے بہت اچھی طرح سمجھا دیا۔ چاند کی تلاش میں تالاب میں کود گیا وہاں چاند وا ند کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈوب گیا۔ اسی طرح دنیا کی محبت میں جب چھلانگ لگائے گا ڈوب جائے گا۔ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ چمک عارضی تھی دھوکا تھا وہ چمک کیا ہے۔ یہ لذت یہ محبت۔ وہاں ڈوب جائے گا۔ یہاں ہلاک ہو جائے گا۔ وہاں پانی اور گہرائی ہے۔ یہاں آگ اور گڑھا ہے۔ دراصل شدت ظہور حجاب بن رہا ہے۔ آپ ظل کو دیکھیں روشن ہے۔ صاف نظر آرہا ہے۔ دھوپ میں جائیں زیادہ روشن زیادہ صاف نظر آئے گا۔ سورج کو دیکھیں۔ چاہیے کہ اور زیادہ نظر آئے کہ بہت

زیادہ روشنی ہے۔ نہیں وہاں اندھیرا آجائے گا۔ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اس طرح ہر ہر شے دلالت کر رہی ہے خالق کی موجودگی پر اتنے ظاہر و باہر دلائل کے باوجود اس پر نظر نہیں جاتی۔ اس کی وجہ شدت ظہور ہے۔ سورج کی روشنی کو آڑ میں سے دیکھنا چاہیئے۔ اسی طرح یہاں آڑ میں سے دیکھنا چاہیئے۔ خالق نظر آجائے گا۔ بالکل چھوڑ دے کھانا پینا تو ہلاک ہو جائے گا۔ یہاں کبھی بازار میں کھانے پینے، چارپائی بچھا کر لیٹنے کو جی چاہتا ہے؟ نہیں چاہتا یہ اس کی جگہ نہیں ہے۔ اگر کوئی چارپائی بچھا کر سو گیا تو شام کو خالی ہاتھ گھر جائے گا۔ اسی طرح یہ دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے جو یہاں ٹھہر گیا۔ وہاں جو اس کا اصل گھر ہے خالی ہاتھ جائے گا۔ تھوڑا تھوڑا دنیا کو لینا چاہیئے۔ جس طرح چلتے چلتے تھک گیا۔ ذرا دیر آرام کر لیا پھر آگے بڑھ گیا۔ اگر ٹھہر گیا تو پھر منزل مقصود کو نہیں پہنچے گا۔ اسی طرح دنیا بالکل ترک کرے گا۔ تب بھی ہلاک ہو جائے گا۔ نہیں تھوڑا تھوڑا دنیا کو بھی لینا چاہیئے۔ جنت مومن کا گھر ہے۔ وہاں سیدھا چلا جائے گا اور اپنے گھر کو پہچان لے گا۔ یہاں تو کبھی کبھی بھول جاتا ہے۔ میرے ساتھ ہوا۔ دوسرے کے گھر میں گھس گیا۔ وہ نہیں بھولے گا۔ سیدھا اپنے گھر میں جائے گا۔ بتانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا
يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ
حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ (البقرہ ۱۶۵)

ہر وہ شے جو دل کو اللہ سے روکدے اور غیر اللہ میں مشغول کردے وہ غیر اللہ میں مشغول کرنیوالی شے ہی انداد ہے۔ یا انداد سے مراد اصنام ہیں انداد کی ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ رؤسا مراد ہیں جن کے کہنے پر یہ کافر چلتے ہیں۔ ہر وہ خواہش جو دل کو اللہ سے پھیر دے۔ وہ انداد ہے۔ قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ (جاثیہ-۲۳) بھلا دیکھا تو نے اس شخص کو کہ اس نے خواہش نفسانی کو اپنا معبود بنالیا۔ صوفیاء کرام نے انداد سے خواہش نفسانی مراد لی ہے۔ اس میں ذراسی باریک بات ہے یہ بات صوفیوں کی کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ اگر عقائد میں خواہش نفسانی کو معبود بنایا ہے۔ تو بے شک صحیح ہے۔ یعنی عقیدہ اپنی خواہش کے مطابق کرلیا۔ لیکن اگر عقیدہ صحیح ہے اور عمل اپنی خواہش کے مطابق کئے ہیں۔ نفس پرستی کے شہوت پرستی کے حرام اور غیر مشروع کو مشروع کیا ہے۔ تو یہ انداد نہیں ہے۔ وہ فسق ہے اور بدعملی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ ظالم لوگ جب عذاب دیکھیں گے تو عذاب ان ہی لوگوں کو ہوگا۔ جن کے عقائد درست نہیں ہوں گے۔ جن کے عقائد درست ہوں گے۔ ان کو دائمی عذاب نہیں ہوگا۔ بس یہ ذراسی کمزوری ہے۔ باقی وہ چیز بہت نفیس ہے کہ ہر وہ شے جو اللہ سے دل کو پھیر دے انداد ہے۔ یہی تین تفسیریں میرے علم میں آئی ہیں۔ چوتھی علم میں نہیں ہے۔

اب غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وہ اصنام سے یا وسائے کفر سے یا اپنی خواہشات نفسانی سے محبت کرتے ہیں ایسی محبت جیسی اللہ پاک سے کرنی چاہیئے۔ تو اصنام تو پتھر کے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے محبت کی جائے بلکہ ان کی اطاعت اور عبادت میں ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کی اطاعت میں کرنی چاہیئے یُحِبُّوْنَهُمْ کے معنی یُحِبُّوْا طَاعَتَهُمْ کے ہیں۔ اب یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محبت چیز کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ کی محبت کیا ہے۔ محبت پر بڑا زور دیا گیا ہے حدیث شریف میں ہے:- لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بخاری کتاب الایمان - باب حب رسول)

اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہ ہو اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اگر اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے یہ دنیا کی تمام چیزیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں تو تَرَبَّصُوْا (توبہ ۲۴) تم ٹھہرو تحدید اجمالی ہے۔ یعنی عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا اور تم اس کا مزہ چکھ لوگے۔ سب اس پر متفق ہیں کہ اللہ سے محبت فرض ہے۔ اور کسی سے محبت نہیں ہونی چاہیئے اور رسولؐ کی محبت اور کتابوں کی نسبت جو ہے وہ اللہ ہی کی محبت ہے۔ ایک ہی چیز ہے۔ اس میں غیریت نہیں ہے۔ اللہ کی محبت رسولؐ کی محبت ہے اور رسولؐ کی محبت درحقیقت اللہ ہی کی محبت ہے۔ تامل اور غور کی دو باتیں ہیں کہ محبت کیا چیز ہے اور دراصل اللہ کی محبت کیا چیز ہے امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ ایک چیز تیرے دل کو اچھی لگے اور تجھ کو اس سے رغبت ہو اور طبیعت کا میلان اس طرف ہو تو اس میلان کا نام محبت ہے۔ اور جو شے بری لگے اور طبیعت کا رجحان بھاگنے کا ہو وہ عداوت ہے۔ عداوت

کی یہ تعریف تو قطعی غلط ہے۔ کیونکہ پیشاب ہے یا خانہ ہے، جتنی نجاستیں ہیں۔ ان سے طبیعت بھاگتی ہے۔ مگر ان سے عداوت نہیں ہے۔ یہاں عداوت سے بحث نہیں ہے۔ وہ تو جب عداوت کا مسئلہ آئے گا تو بیان کر دوں گا۔ یہاں بحث محبت سے ہو رہی ہے۔

پہلے آپ طلب کے معنی سمجھ لیں طلب جو ہے وہ حرکت کا نام ہے حرکت کہتے ہیں۔ جسم کا ایک مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا۔ اور ایک مکان ہی میں رہنا یہ سکون ہے۔ ایک مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا یہ حرکت ہے اور اسی کو طلب کہتے ہیں۔ تو زندگی کی جتنی طلبیں ہیں۔ وہ محبت نہیں ہیں۔ کیونکہ کھانا ہے پینا ہے اور جتنی حرکتیں ہیں۔ وہ انسان اپنے بنانے کے لئے کر رہا ہے۔ اب جب وہ بن گیا تو اب کیا؟ آپ کی ساٹھ برس ستر برس کی عمر ہے اس کا کیا نتیجہ ہوا کچھ نہیں آئندہ کا پتہ نہیں جو کچھ ہے وہ یہ آن ہے تو اب اس آن میں آپ نے کھا لیا پی لیا ننگے بھی نہیں اور کبھی کوئی حاجت نہیں لیکن یہ سب کیا ہے۔ جیسے ستر برس گزر گئے یہ آن بھی گزر جائے گا اور زائل ہو جائے گا۔ لیکن زائل ہونا مقصود نہیں۔ یہی دھوکا لگا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ شیطان تمام بداعمالیاں اور بداعتقادیاں سکھاتا ہے کہ بس یہی زندگی ہے جو کچھ ہے انسان کی زندگی بننے کے بعد کیا ہے؟ یعنی انسان کس لئے ہے۔ یہ تمام حرکتیں اور کاروبار جو ہو رہے ہیں۔ وہ تو انسان کی زندگی بنانے کے لئے ہو رہے ہیں۔ اب انسان کس کام کے لئے ہے۔ وہ مقصود بالذات تو ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ ایک آنی چیز ہے۔ جو عمر گزر گئی اس کا تو کچھ معلوم ہی نہیں کہاں گئی اور آئندہ

زندگی کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ آئے گی بھی یا نہیں اور اگر آئی کبھی تو یوں ہی گزر جائے گی تو وہ بھی دونوں نہ ہونے ہی کے برابر ہو گئے۔ اب جو کچھ ہے وہ یہی آن ہے اور وہ بھی گزر جائے گی۔ اور بالآخر ختم ہو جائے گی۔ تو نہ اس زندگی کو بقاء ہے نہ دوام ہے اور نہ جس لئے تھی وہ اس کو لازم ہے کہ پتہ چل جائے کہ بننے کے بعد وہ یہ ہے۔ تو یہ پہلی حرکت جو ہے اس میں دھوکا لگا ہے کہ بس یہی ہے مقصد۔ سارے عالم کو یہی دھوکا لگا ہے یہ جتنی حرکتیں ہیں۔ اور طلبیں ہیں زندگی کو بنانے کے لئے ان کا نام محبت نہیں ہے۔ اس کا نام ہے خواہش اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ اگر یہ ایسی خواہش ہے کہ اگر نہ ملے تو ہلاک ہو جائے تو اس کا نام ہے ضرورت۔ اور اگر ایسی خواہش ہے کہ ہلاک تو نہ ہو مگر دکھ میں رہے گا پریشانی میں رہے گا اور پریشانی کسے کہتے ہیں۔ کہ دکھ تو نہ ہو مگر دکھ کا تصور ہو لوگ کہتے ہیں پریشانی ہے۔ تو اس کی معنی یہ ہے کہ آنے والے دکھ کا تصور ہے۔ اور اگر اس کا تحقق ہے تو وہ دراصل دکھ ہے ہی۔ مرنے کا تصور رہے یہی پریشانی ہے۔ جب تحقق ہو گیا مر گیا۔ پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر نہ مرتا تو پریشانی باقی رہتی۔ اس کو حاجت کہتے ہیں۔ جیسے کھانا ہے پینا ہے یہ ضرورت ہے کیونکہ اگر نہ ملے تو ہلاک ہو جائے۔ اور نکاح ہے یہ حاجت ہے کہ اگر نہ ملے تو دکھ میں رہے گا۔ ہلاک نہیں ہو گا۔ تو یہاں جتنی طلبیں ہیں وہ یا ضرورتیں ہیں یا حاجت ہیں۔ اور ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ مل جائیں تو آدمی بن جائے اب بننے کے بعد انسان کس کام کا ہے۔؟ بہت باریک بات ہے اور غور طلب ہے۔ ایک تو ہے مقصود کی طلب اور ایک ہے ذرائع کی طلب۔ یہ سب چیزیں اس کے بنانے

میں مصروف ہیں اور بننے کے بعد بگڑ گیا تو بیکار ہو گیا۔ مکان بن رہا تھا۔ بن رہا تھا جب تیار ہوا اسی وقت ڈھے گیا۔ تو یہ بری بات ہے۔ نہیں بلکہ بننے کے بعد وہ اس قابل ہونا چاہیئے کہ رہا سہا جائے۔ تب تو ٹھیک ہے یہ ہے مقصود بالذات تو بننے کے بعد جو بنی ہوئی چیز ہے وہ ذریعہ ہے مقصود کے حاصل کرنے کا۔ تو مقصود بالذات تک پہنچنے کے جو ذرائع ہیں ان کی بھی طلب ہوتی ہے، جیسے ترکاری بنانا ہے۔ تو چھری کی طلب ہوگی۔ لیکن اتنی دیر جتنی دیر ترکاری بنائی جائے۔ اس کے بعد اس کی طلب ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی ذریعہ ہے کس اور مقصود کا۔ اتنی ہی دیر اس کی بھی طلب رہے گی۔ یعنی کھانا تیار ہو گیا۔ اب یہاں سوال نہیں ہوگا۔ کہ یہ کس لئے کیونکہ وہ مقصود بالذات ہے۔ تو مقصود بالذات کی جو طلب ہے۔ اس کا نام ہے محبت۔ اور مقصود بالذات کے ذرائع کی جو طلب ہے۔ اس کا نام ضرورت اور حاجت ہے۔ محبت کے معنی کی نئی تحقیق ہے جو کسی کتاب میں نہیں ہے۔ نہ کسی اہل علم کی زبان سے نکلی۔ بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور وہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے سبزہ ہے۔ موسم بہار ہے۔ مو تی ہے۔ خوش رنگیاں ہیں۔ خوشبوئیں ہیں۔ ان سب کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ مگر محبت نہیں ہوتی ایک اور بات ہے یہاں وہ یہ کہ یہ سب عرض ہیں۔ عرض اس شے کو کہتے ہیں۔ جو دوسری شے کے ساتھ قائم ہو۔ لمبائی چوڑائی موٹائی رنگ یہ تنہا کہیں نہیں ملیں گے کسی دوسری شے میں ملیں گے۔ تو یہ جتنی حسین اور خوش رنگ چیزیں ہوتی ہیں۔ ان سے محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کا جو محل ہے۔ ان سے محبت

ہوتی ہے۔ ذات سے محبت ہوتی ہے۔ غرض سے نہیں۔ ذات مقصود ہوتی ہے۔ تو مقصود بالذات جو شے ہے اس کی طلب کا نام محبت ہے۔ اور جو شے مقصود بالعرض ہے۔ اسی کو ذریعہ کہتے ہیں۔ اور اس کی طلب کا نام حاجت اور ضرورت ہے وہ سب عرض ہوں گے جوہر اور ذات نہیں ہوں گے۔

بعض مفسرین نے محبت کے معنی تعظیم کے بتائے ہیں۔ اور اطاعت کے یعنی وہ ان کی ایسی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں۔ جیسے اللہ کی تعظیم اور اطاعت کرنی چاہیئے۔ یہ معنی غلط ہیں۔ کیونکہ ایسی صورتیں ہیں کہ ان سے محبت ہوتی ہے تعظیم نہیں ہوتی۔ باپ کی تعظیم ہوتی ہے۔ بیٹے سے محبت ہوتی ہے۔ دونوں میں بین فرق ہے۔ محبت کے معنی اطاعت کبھی غلط ہے۔ کیونکہ اطاعت فرع ہے حکم کی اگر آپ کو حکم دیا جائے اور اس حکم کے مطابق آپ عمل کریں تو اس حکم کے مطابق عمل کرنے کا نام اطاعت ہے۔ بتوں نے کوئی حکم نہیں دیا کہ ہماری عبادت کرو۔ اس لئے بتوں کی عبادت ان کی اطاعت نہیں ہے۔ اور تم نے محبت کے معنی اطاعت کے بتائے تو ان سے محبت کبھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں محبت ثابت ہے تو محبت کے معنی نہ اطاعت کے ہیں نہ تعظیم کے ہیں نہ میلان طبع کے ہیں بلکہ محبت کے یہ معنی ہیں کہ ایسی شے کی طلب ہو کہ جو مقصود بالذات ہے اور جو شے مقصود بالعرض ہو وہ اس کی صفت ہوتی ہے۔ اس کی طلب کا نام حاجت اور ضرورت ہے۔ عام زبان میں اردو والے اس کو خواہش کہتے ہیں۔ اور عربی والے شہوت کہتے ہیں۔ یہ فرق ہے محبت اور شہوت میں تو اللہ کی محبت کسے کہتے ہیں کہ دراصل اللہ کی طلب ایسی ہے کہ اللہ مقصود بالذات

ہے۔ اب دو گروہ ہیں ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ چونکہ اللہ غیر جنس ہے۔ اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت ہمیشہ ہم جنس سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال ناقص ہے۔ ایک جماعت متکلمین کی یہ کہتی ہے کہ محبت کے معنی ہیں اطاعت کے بالارادہ بجالانے کے اور وہ غیر جنس ہے اس لئے اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن محقق سب اس پر متفق ہیں کہ اللہ محبت کے قابل ہے۔ اور محبوب بالذات ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ یہ آپ کے سمجھ میں جب آئے گا جب آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ محبت کن بنیادوں پر ہوا کرتی ہے۔

پہلی چیز ہے اپنا آپا۔ انسان کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ وہ جاگزیں ہو گئی ہے۔ ہمیشہ عارضی محبتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ذاتی محبت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بیٹا ہے۔ اس کی محبت کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ جاگزیں ہو چکی فطری چیز بن گئی۔ حال میں کوئی محبت ہو وہ عارضی ہوگی اس کا اظہار ہو گا۔ اور چرچا ہو گا۔ کہ فلاں شخص کو فلاں شخص سے محبت ہو گئی۔ بیٹے سے ہر باپ محبت کرتا ہے مگر اس کا کبھی ذکر نہیں ہوتا کہ فلاں شخص اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ عارضہ نہیں ہے۔ جو محبت عارضی ہوگی۔ اس کا چرچا ہو گا۔ یہ بڑی نکتہ کی بات ہے۔ اگر اپنا اور بیٹے کا دونوں کا ہاتھ جلے تو پہلے اپنا ہاتھ نکال لیتا ہے۔ خواہ کتنی ہی اپنے بیٹے سے شدید محبت ہو۔ تو ذاتی محبت کا اظہار عمل سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاص جذبہ نہ ہو اور دونوں کی موت آئے تو پہلے اپنے آپ کو بچائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جذبے کے تحت اپنی جان نثار کر دے بیٹے پر۔ اور بیٹے سے بھی جو تعلق

ہے وہ۔ کبھی اس لئے ہے کہ میں تو باقی نہیں رہوں گا تو کوئی ایسی شے باقی رہے جو میرے مناسب اور مشابہ ہو۔ تو زیادہ سے زیادہ مشابہ اس کا بیٹا ہوتا ہے۔ تو اس کی بقا کا خواہشمند رہتا ہے۔ اور اگر اپنی بقا کا یقین ہو جاتا تو کبھی بھی اپنے بیٹے سے محبت نہ کرتا۔ تو سب سے زیادہ محبت اپنی ذات سے ہے۔ دوسری درجہ پر محبت ان چیزوں سے ہوتی ہے جو اس کی ذات کے لئے نافع اور کارگر ہیں۔ وہ ذریعہ ہیں اس کی بقا کا۔ جیسے کھانا ہے پینا ہے۔ راحتیں ہیں یہ سب ذریعہ ہیں اس کی زندگی بنانے کا۔ اگر یہ اس کو پہنچ رہی ہیں کسی اور ذریعے سے تو اس ذریعہ سے بھی اس کو محبت ہو جائے گی۔ اگر کسی سے آپ کو فائدہ پہنچ جائے اور آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں اس کی کوئی غرض نہیں ہے۔ تو آپ کو اس سے لازوال محبت ہو جائے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ
اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَ
اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ
وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ
اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(بقرہ۔ ۲۲۶۔ ۲۲۸)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلا کرتے ہیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے۔ اور اگر تم نے طلاق دینے کی نیت سے ایلا کیا ہے تو جان لو کہ اللہ پاک سمیع اور علیم ہے طلاق شدہ عورتیں اپنے نفس کو روکتی ہیں تین قروء اور یہ حلال نہیں ہے ان کے لئے کہ وہ چھپائیں جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے ان کے رحموں میں اگر ان کو اللہ اور روز جزا کا یقین ہے اور اگر وہ رجوع کر لیں تو وہ زیادہ حقدار ہیں ایام عدت میں اگر نیت اصلاح کی ہو اور ان کے لئے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے رواج کے مطابق اور مردوں کے لئے ان پر فضیلت ہے اللہ پاک غالب اور حکمت والا ہے۔

للذین یؤلون من نساء هم تربص اربعة اشهر

جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلا کرتے ہیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت ہے

فان فاء و فان الله غفور الرحیم ٥ وان عزموا الطلاق

اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ مغفرت اور رحمت کرنیوالا ہے۔ اگر ایلا طلاق دینے کی نیت

فان الله سمیع علیم ٥

سے کیا ہے تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ایلا شرع میں اس قسم کو کہتے ہیں جو شوہر اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی کھا لیتا ہے۔ یہ طریقہ اسلام سے قبل عرب میں جاری تھا اور اس کو بمنزلہ طلاق سمجھا جاتا تھا اور اس سے مقصد عورت کو پریشان کرنا ہوتا تھا کہ نہ طلاق دیتے نہ رجوع کرتے تھے۔ اور اس کی کوئی مدت مقرر نہ تھی جس مدت کی چاہتے قسم کھا لیتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد بھی لوگ ایسا کرتے رہے۔ اس پر یہ حکم آیا کہ مدت ایلا چار ماہ زیادہ سے زیادہ ہے۔ احناف کا مسئلہ یہ ہے کہ چار ماہ پورے گذرنے کے بعد اس کو طلاق ہو جائے گی۔ اور شافعی مذہب میں یہ ہے کہ عورت مرد سے کہے کہ یا رجوع کرو یا طلاق دو۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی بات پر تیار نہ ہو تو حاکم کو چاہیئے کہ اس کو طلاق دلوا دے۔ اور اگر وہ رجوع کرلیں قسم پوری ہونے کے بعد یا اس سے پہلے تو اللہ معاف کرنے والا ہے یعنی کسی نے تین ماہ کا ایلا کیا تو تین ماہ سے پہلے اگر وہ رجوع کرلے یا تین ماہ پورے ہونے کے بعد رجوع کرلے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ میں اس کو معاف کر دیتا ہوں۔ اگر انہوں نے ایلا طلاق دینے کی نیت سے کیا ہے تو ان کی نیت اللہ پاک سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ سب کچھ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

والمطلقات یتربصن بانفسهن ثلاثه قروء ۔ عورتیں اپنے آپ کو تین قرء روکتی ہیں انتظار کرتی ہیں یعنی جس عورت کو طلاق ہو جائے اس کو تین

قرء عدت کرنی چاہیئے۔ خبر کے الفاظ میں حکم دیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے عورت کو معلوم نہیں ہوتا اور مرد طلاق دے دیتا ہے ایسی صورت میں ایک مدت گذر جانے کے بعد اگر اس کو طلاق کا علم ہو تو جو مدت گذر چکی ہے وہ شمار ہو جائے گی اگر الفاظ حکم کے ہوتے تو عورت پر علم ہونے کے بعد طلاق کی مدت گذارنی واجب ہوتی۔ قرء کے معنی میں اختلاف ہے۔ قرء لغت میں طہر اور حیض دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر حیض کے معنی لئے جائیں تو عدت کی مدت تین حیض شمار ہوگی اور اگر طہر مراد لی جائے تو عدت سے تین طہر پورے گذرنے پر خارج ہوگی عورت۔ یہ حکم اس عورت کا ہے جس کو حیض آتا ہو اور مرد سے اس کا تعلق ہو گیا ہو۔ جس عورت کا تعلق نہیں ہوا ہے اس پر عدت نہیں ہے۔ اور ایسی عورت جس کو حیض نہ آیا ہو۔ مثلاً کم عمر اور جو حیض سے مایوس ہو چکی ہو مثلاً بوڑھی اسکی مدت تین ماہ ہے۔ وہاں قرء کا حساب نہیں ہے۔ اور حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے یہ تینوں قسم کی عورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ قرء سے مراد طہر لیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ حیض مراد لیتے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں ہم ان دلائل پر غور کریں گے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے ایک دلیل تو یہ دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن ۔ اے نبی مراد پوری قوم سے ہے اے مسلمانوں جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے وقت طلاق دو۔ طلاق دینے کے لئے عدت کے وقت کی قید لگا دی اور حیض کے وقت طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ طلاق دے گا تو مجرم گردانا جائے گا۔ طہر میں طلاق دینی چاہیئے تو قرء سے مراد طہر ہے۔ دلیل کی تقریر یوں ہوگی۔

اس پر اجماع ہے کہ وقت طلاق طہر ہے۔ اور اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ وقت طلاق عدت ہے لہذا طہر عدت ہے۔ لیکن اس میں ایک غلطی ہے وہ میں بتاتا ہوں کہ اگر طہر عدت ہوگا تو طہر کا ہر ہر جز ساعت الحہ، عدت ہوگا تو اس کا آخری لمحہ بھی عدت ہوگا اب اگر آخر لمحہ میں طلاق دی تو طہر باقی نہ رہا طلاق دیتے ہی حیض کا وقت شروع ہوگیا۔ تو اب مدت عدت حیض ہی سے شروع ہوئی طہر سے شروع نہ ہوئی۔

احناف مجتہدین اس آیت کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ایسی حالت میں طلاق دو کہ وہ استقبال کریں (انتظار کریں) عدت کے وقت کا۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ ہم کہیں کہ ابھی تو مہینہ شروع ہے آخر ہفتہ میں ملنا تو تمہارا کام ہوجائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری ہفتہ کا استقبال کرو یعنی انتظار کرو۔ تو معنی یہ ہوئے کہ اوقات طہر میں ایسے وقت طلاق دو جب وہ تین قرء کا استقبال یعنی انتظار کریں تو اب انتظار حیض کا ہوگا طہر کا نہیں ہوگا۔

دوسری دلیل امام شافعیؒ نے یہ دی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ اقرء اطہار ہیں۔ قرء کی جمع اقرء اور قروء دونوں آتی ہیں۔ ساتھ ہی امام صاحب نے یہ فرمایا کہ عورتیں ان باتوں کو زیادہ جانتی ہیں لیکن اس میں بھی ایک بات ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قول اس بارہ میں کافی تھا اگر اس کے خلاف کوئی حدیث نہ ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو مخاطب کرکے فرمایا کہ دع چھوڑ دے الصلوٰۃ اپنی نماز کو ایام اقرئک اقرء کے زمانہ میں۔ تو نماز طہر میں نہیں حیض کے ایام میں چھوٹتی ہے تو معلوم ہوا کہ اقرء سے مراد حیض کی مدت ہے۔ اور یہ جو انہوں نے فرمایا کہ عورتیں اس بارہ میں زیادہ جانتی ہیں تو بے شک طہر اور حیض کے حالات سے عورتیں زیادہ واقف ہوتی ہیں۔ لیکن قرء کے معنیٰ طہر کے ہیں یا حیض کے یہ بات

عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جس نے بھی حضورؐ کا یہ بیان سنا ہوگا وہ معتبر ہے۔

تیسری دلیل انہوں نے یہ فرمائی کہ لغت میں قرء کے معنی جمع ہونے کے ہیں تو طہر کے زمانہ میں خون پورے جسم میں جمع ہوتا ہے تو لفظ کا تقاضہ یہ ہے کہ قرء سے مراد طہر ہی ہونا چاہیئے۔ اس دلیل میں بھی گفتگو ہے کیونکہ ایام حیض میں خون جمع ہوتا ہے رحم میں کیونکہ اگر جمع نہ ہوتا اور وہاں موجود نہ ہوتا تو نکلتا نہیں۔ پہلے جمع ہوا تب ہی تو نکلا۔

چوتھی دلیل امام شافعیؒ نے یہ دی کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کو اس کے جائز حق سے محروم کردے۔ اگر قرء سے مراد طہر ہوگی تو ایک ٹکڑا اس طہر کا اور دو طہر اور مل کر مدت چھوٹی بنے گی۔ بمقابلے اس کے کہ تین حیض شمار کئے جائیں تو حیض مراد لینے کی صورت میں شادی کرنے کا وقفہ بمقابلہ طہر مراد لینے کے بڑھ جائے گا۔ یہ عورت کو اس کے حق سے روکنا ہوا اور حق روکنا جائز نہیں ہے۔ تو حق روکنے کے گناہ سے بچنے کے لئے طہر ہی مراد لینی چاہیئے۔ احناف نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ درحقیقت حق سے روکنا ہے ہی نہیں کیونکہ پہلے یہ طے ہوجائے کہ قرء سے مراد طہر ہی ہے اور پھر حیض مراد لی جائے تب تو یہ حق سے روکنا ہوگا۔ اس سے قبل تو حق ثابت ہی نہیں ہے۔ ابھی تو یہ کوشش ہی ہو رہی ہے کہ اس کو عقد کا حق تین طہر کے بعد ہوگا یا تین حیض کے بعد۔ جب اس کا حق ثابت ہوجائے اس کے بعد اگر روکا جائے گا تب اس کو اس کے حق سے روکنا ہوگا۔

(اور چوتھی دلیل میں) یہ فرمایا ہے کہ حیض مراد لینے سے حق تلفی ہوتی ہے اس لئے طہر مراد لی جائے مگر طہر مراد لینے کی صورت میں طہر کے ختم ہوتے ہی عدت سے تو خارج ہوجائے گی مگر ایام حیض شروع ہوجائیں گے اور جب تک وہ حیض سے

فارغ نہ ہوا استفادہ نہیں کر سکتی تو جس سے بچنے کی کوشش ہو رہی تھی وہ (حق تلفی) تو ہو گئی۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

پانچویں دلیل یہ بیان فرمائی کہ قرء کے معنی طہر اور حیض دونوں ہیں تو اب اس کو اختیار ہے کہ عدت تین طہر کر کے خارج ہو جائے یا تین حیض کے بعد خارج ہو۔ اگر طہر مراد لی جائے تو تین طہر کے بعد وہ خارج ہو گئی اب حیض کا اس کو اختیار رہا خواہ وہ انتظار کرے چاہے انتظار نہ کرے۔ تو جس شے میں اختیار ہو وہ واجب نہ رہی. جب حیض کی مدت واجب نہ رہی تو طہر ہی مراد ہوئی۔ بڑی دقیق دلیل ہے۔

احناف نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں کہ پچھلی دلیل سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ جس شے میں اختیار دیا جاتا ہے واجب مقید ہوتا ہے اس میں سے کوئی ایک ادا کرنے کے بعد سب متفق ہوتے ہیں کہ ادا ہو گیا۔ جیسے قسم کا کفارہ ہے یا دس آدمیوں کو کھانا کھلا دو۔ یا دس آدمیوں کو کپڑا پہناؤ۔ یا دس غلام آزاد کراؤ۔ ان میں سے ایک کے ادا کرنے کے بعد پوری قوم متفق ہے کہ بری الذمہ ہو گیا۔ لیکن تین طہر گذارنے کے بعد عدت کی مدت پوری ہو جاتی ہے اس پر پوری حنفی قوم متفق نہیں ہے لہذا یہ واجب مقید نہیں ہے۔ اسکی موٹی سی مثال سمجھ لیں کہ آپ کو میرے سو روپے دینے ہیں میں آپ کو اختیار دیتا ہوں کہ چاہے پچاس پچاس کے دو نوٹ دیدیں یا دس دس کے دس نوٹ دیدیں یا پانچ پانچ کے بیس نوٹ دے دیں۔ اب آپ جو نوٹ بھی دیں گے قرضہ ادا ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ قرء سے مراد حیض لیتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ رسول پاکؐ نے عورتوں کو ہدایت فرمائی کہ قرء کے زمانے میں نماز چھوڑ دیں تو نماز ایام حیض میں چھوڑی جاتی ہے نہ طہر میں لہذا قرء سے مراد حیض کا زمانہ ہے کیونکہ جو مفہوم حدیث میں ہے وہی مفہوم قرآن میں سمجھا جائے گا۔

دوسری دلیل امام ابوحنیفہؒ نے یہ فرمائی کہ اگر طہر مراد لی جائے تو طلاق دینے کے بعد جو طہر کا حصہ بچے گا وہ پورا طہر نہیں ہوگا۔ تو طہر تین پورے نہیں ہوں گے بلکہ ڈھائی یا پونے تین ہوں گے اور تین کا لفظ پورے تین میں نص ہے اس لئے طہر مراد نہیں ہے حیض ہی مراد ہے۔ تین میں حقیقت ہے پونے تین میں مجاز ہے مجاز کے مقابلہ میں حقیقت کو ترجیح دی جائے گی لہذا قرء تین پورے ہونے چاہئیں لہذا حیض ہی مراد ہونی چاہیئے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا الحج اشہر معلومات (بقرہ-۱۹۷) حج کے مہینے معلوم ہیں۔ وہ ہیں شوال پورا۔ ذلیقعد پورا اور ذی الحجہ کے دس یوم۔ اشہر جمع کا صیغہ ہے جو کم ازکم تین پر بولا جاتا ہے۔ تو جمع بول کر مراد سوا دو لئے اسی طرح یہاں تین بول کر ڈھائی یا پونے تین مراد لئے۔ لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے۔ وہاں دلیل موجود ہے کہ تین سے مراد تین ہی نہیں ہیں یہاں دلیل موجود نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وہاں مدت میں اتصال ہے۔ اگر دو تین دن کم کرے گی تو پوری ناقص ہو جائے گی اور یہاں اتصال نہیں ہے اگر چند یوم چھوڑ کر حج کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تو یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ عدت میں پورے تین قرء مل کر ایک مدت ہے حج میں یہ بات نہیں ہے مقررہ مدت میں چاہیے جب حج کرلے۔

علمائے شافعیہ نے یہ بھی فرمایا ہے تم کہتے ہو کہ طہر مراد لینے سے مدت گھٹ جاتی ہے تو اگر حیض مراد لی جائے تو مدت تین سے بڑھ جائے گی کیونکہ تین حیض میں ایک ٹکڑا طہر کا زائد ہوگا۔ احناف علماء نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میرے خیال میں ایک بات آتی ہے کہ یہاں مدت کے گھٹنے بڑھنے سے بحث ہی نہیں ہے مثال اس کی یہ ہے کہ ہم کسی کو اگر یہ بتائیں کہ فلاں جگہ سے بالکل قریب تین مکان کے بعد ہمارا مکان ہے تو مکانوں کے درمیان جو گلیاں آئیں گی ان کا خیال

نہیں کیا جائے گا۔ صرف مکان گنے جائیں گے۔ اسی طرح یہاں تین حیض گنے جائیں گے۔ بیچ میں اگر کوئی شے آتی ہے تو اس کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ طہر کی گنتی نہیں ہے صرف حیض شمار کئے جائیں گے خواہ وہ کسی طرح واقع ہوں۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایک دلیل یہ فرمائی کہ جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہیں ان کی عدت تین ماہ ہے یہ تین ماہ قرء کا بدل ہیں۔ بدل جب پورا ہے تو یہ بھی پورے تین ہی ہونے چاہئیں اور طہر پورا ہوتا نہیں لہذا حیض ہی مراد ہے۔

ایک دلیل انہوں نے یہ بھی دی کہ لونڈی خریدی جاتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ حاملہ ہے یا نہیں تو یہ پتہ طہر سے نہیں چلتا حیض ہی سے معلوم ہوتا ہے تو وجہ شناخت حیض ہے طہر نہیں ہے۔ اور یہاں بھی مقصد یہی ہے کہ حمل کا پتہ چل جائے۔ اس لئے قرء سے مراد حیض ہے۔

ایک دلیل ان کی یہ بھی ہے کہ اصول یہ ہے کہ حلال کے ٹوٹ جانے سے یہ بہتر ہے کہ حرام سے بچ جائے تو اگر جواز اور عدم جواز کا مقابلہ ہو تو عدم جواز کو ترجیح دی جائے گی احتیاطاً۔ اب اگر طہر مراد لی جائے تو ایام حیض میں وہ خارج ہوگی اور عقد نہیں کر سکے گی اور اگر حیض مراد لی جائے تو ایام حیض میں خارج نہیں ہوگی اور عقد کر سکے گی۔ تو اب احتیاط اسی میں ہے کہ حیض مراد لی جائے۔

مطلقہ عورت وہ ہے جو حاملہ نہ ہو۔ باکرہ نہ ہو۔ غیر مسوس نہ ہو جیسے چھوا نہ ہو سب خارج ہیں۔ ان کے احکام الگ ہیں۔

دونوں اماموں کے دلائل اور اپنا خیال میں نے ظاہر کر دیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ دونوں مجتہد ہیں جو غلطی کرے گا اس کو اکہرا ثواب اور جو حق پر ہوگا اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ چاروں مجتہد حق پر ہیں جاہے جس کے پیچھے چلا جائے اللہ تک پہنچ جائے گا۔ دلیل سے ان کی اگر غلطی ثابت نہیں ہو جائے تب

بھی وہ حق پر ہیں۔ مسجد کے چار دروازے ہیں چاہے جس دروازے سے داخل ہوں امام کے پیچھے پہنچ جائیں گے مسلمانوں کے امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ چاروں امام چار دروازہ ہیں جن کے پیچھے چلے جائیں رسولؐ اللہ تک پہنچ جائیں گے۔ چاروں دین کے بہت بڑے عالم ہیں اتنے کہ باقی تمام علماء کا مجموعی علم ان کے علم کے برابر نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ جیسے ایک لاکھ عالم ہوں تب بھی ان میں سے کسی ایک کے علم کو نہیں پہنچ سکتے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ پوری نسل انسانی میں آدم علیہ السلام سے آج تک کسی قوم میں ایسے قانون ساز نہیں ملیں گے۔ جتنے قوانین بنے ہیں سب امام ابو یوسفؒ کے قانون سے ماخوذ ہیں۔ یہ یورپ والے کیا جانتے ہیں سمجھ بھی نہیں سکتے اتنی باریک باتیں ہیں۔

اصول الفقہ۔ اصول جمع اصل کی معنی ہیں قانون۔ فقہ معنی سمجھنا تو اصول الفقہ کے معنی ہوئے قوانین فہم۔ یعنی متکلم کے کلام کے سمجھنے کے قوانین متکلم کوئی ہو انسان ہو، نبی ہو یا خدا ہو ہر ایک کے کلام کو سمجھنے کے قوانین وضع کئے ہیں اور ان چاروں میں سب سے بڑے موجد اور واضع امام ابو حنیفہ ہیں۔ اعلےٰ قسم کے جتنے مجتہد ہیں سب ان ہی کے شاگرد ہیں۔ آپ میرا بیان سنتے ہیں میرا علم ان کے علم کے مقابلے میں دریا میں قطرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا سلسلے میں یہ نواسی درجہ اوپر میرے استاد ہیں۔ کم ہوتے ہوتے علم اتنا سا رہ گیا ہے۔ میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن یہ عالموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں عام آدمی اس کو نہیں سمجھ سکتا۔

ایک شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے اپنے باپ کی دہلیز پر قدم رکھا تو تجھ پر طلاق ہے۔ اب وہ رکشا میں اپنے باپ کے گھر گئی اور رکشا میں بیٹھے بیٹھے پاؤں نکال کر دہلیز پر رکھدیا اب اس کو خیال آیا اور واپس چلی آئی۔ طلاق ہوئی یا نہیں۔ استاد شاگرد کی بحث ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ طلاق ہو گئی۔ امام ابو یوسفؒ

کہتے ہیں نہیں ہوئی۔ کیونکہ قدم رکھنے کے دو معنی ہیں ایک تو پاؤں ٹکانا اور ایک رہنا سہنا امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ پاؤں ٹکانا حقیقت ہے رہنا سہنا مجاز ہے جب دونوں کا مقابلہ ہوگا تو حقیقت کو مجاز پر ترجیح دی جائے گی۔

امام ابویوسفؒ نے کہا کہ رہنا سہنا گو مجاز ہے مگر مشہور ہے پیر ٹکانا گو حقیقت ہے مگر غیر مشہور ہے جب دونوں کا مقابلہ ہوگا تو مشہور پر عمل ہوگا غیر مشہور پر نہیں ہوگا مجھے اس قسم کی چیزوں میں بڑی دلچسپی ہے مگر زمانہ میں اس فن کی بہت ناقدری ہوگئی ہے۔ اگر حلوائی کی دوکان پر جاکر جلیبی کی طرف اشارہ کرکے کہے کہ یہ موتی پاک مجھ کو دے دے۔ تو اب حلوائی کیا سمجھے گا۔ لفظ کا تقاضہ ہے کہ موتی پاک دے اشارہ کا تقاضہ ہے کہ جلیبی دے۔ حلوائی کیا دے گا۔ بہت باریک اور دقیق فن ہے۔

ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامھن

اور یہ حلال نہیں ہے کہ عورتیں چھپائیں وہ چیز جو اللہ پاک نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ وہ چیز بچہ بھی ہوسکتا ہے اور حیض بھی دونوں کو چھپانے میں خرابی اور خلل کا اندیشہ ہے۔ حیض کو چھپائیں گی تو حساب میں غلطی ہوجائے گی اور بچہ کو چھپائیں گی تو دوسرے سے عقد کرنے کی صورت میں وہ دوسرے شوہر سے منسوب ہوجائے گا۔ اس لئے بڑی سخت وعید کی ہے کہ ان کن یؤمن باللہ والیوم الآخر ط اگر ان کو خدا اور روز جزا پر ایمان ہو تو حیض یا بچہ جو بھی ان کے رحم میں ہے نہ چھپائیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن ہو تو مت چھپاؤ اگر ایمان نہیں ہے تو چھپالو نہیں بلکہ یہ شدید تہدید اور سخت ڈانٹ ہے۔ مطلب یہ کہ ہرگز نہ چھپانا۔

وبعولتھن احق بردھن فی ذالک ان ارادوا اصلاحا ۱۰ اگر ایام عدت میں رجوع کرلیں تو پہلے شوہر زیادہ حقدار ہیں لیکن نیت اصلاح کی ہونی چاہئے کہ صلح صفائی سے رہیں۔ عورت کو پریشان کرنے کی نیت نہ ہو کہ عدت ختم ہونے لگی

تو رجوع کرلیا اور پھر طلاق دیدی تاکہ عدت کی مدت لمبی ہو جائے اور عورت پریشان ہو جائے۔ عدت کے ایام میں شوہر کا حق باقی رہتا ہے اور عورت کی نیت ہوتی ہے کہ دوسرے کسی مرد سے نکاح کرے عدت کے بعد تو اب شوہر کے علاوہ وہ دوسرا مرد بھی حقدار ہو گیا اس لئے فرمایا 'احق' زیادہ حقدار ہے۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف ۔ عورتوں کے بھی رواج اور دستور کے مطابق مردوں پر ایسے ہی حق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں۔ دونوں برابر ہیں کوئی فرق نہیں ہے۔ معروف کے معنی رواج اور دستور کے ہیں۔

وللرجال علیھن درجۃ ۔ درجہ بمعنی فضیلت، فوقیت، مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے یہ وہ مقام ہے کہ ایک جماعت گمراہی میں پڑ گئی۔ الرجال قوامون علی النساء مرد عورتوں کے مدبر اور منتظم ہیں۔ ولیس الذکر کالانثیٰ (آل عمران ۳۵) مرد عورت کی طرح نہیں ہیں یہ اور اس قسم کی آیات سے مرد کا عورت پر تفوق ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ تفوق انتظام عالم میں ہے۔ اللہ کے نزدیک تو فضیلت کی بنا تقویٰ ہے۔ اگر عورت زیادہ متقی ہے تو اس کو فضیلت ہے۔ جیسے فرعون کی بیوی کو فرعون پر فضیلت ہے اور اگر مرد زیادہ متقی ہے تو اس کی فضیلت ہے حضرت فاطمہ، حضرت مریمؑ، امہات المومنین رضی اللہ عنہم سب مرد مومنین سے افضل ہیں۔ واللہ عزیز حکیم۔ اللہ پاک ہر شے پر غالب ہے اور حکیم ہے۔ حکمت والا ہے ۔ اس لئے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ
اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا
افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ
يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ
طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ
يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَّ
لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ
الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

الطلاق مرتان عدد یہاں محذوف ہے۔ تعداد طلاق مرتان، اشان دری ہیں ایسی طلاق جس میں مرد رجوع کر سکتا ہے۔ اس کے دو ہی درجہ ہیں۔ ایام جاہلیت میں طلاق مرد عورتوں کو دے دیا کرتے تھے اور عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ پھر طلاق دیتے۔ یہ عورت کو پریشان کرنے کا طریقہ بنا رکھا تھا۔ پھر ابتدائے اسلام میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ ایک عورت حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور یہ واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے آپؐ سے عرض کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ دو مرتبہ اگر صریح الفاظ میں کہہ دے کہ میں نے تجھے طلاق دی۔ میں نے تجھے طلاق دی تو رجوع کر سکتا ہے۔ دو مرتبہ میں کر سکتا ہے۔ تین مرتبہ میں یا زیادہ میں رجوع نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ جاہلیت میں دستور تھا۔ ایک مرتبہ یا دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد عورت کو واپس بغیر نکاح کے لے سکتا ہے۔ اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں خواہ وہ یہ زبان سے کہہ دے کہ میں نے رجوع کر لیا یا ایسا فعل کرے جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد کیا کرے۔ اس کے دو۲ طریقے بتلائے۔ فامساك بمعروف یا تو دستور کے مطابق ان کو روک لے یا اگر دل پسند نہیں کرتا۔ او تسریح باحسان راضی خوشی خوش وخرم طریقہ پر اس کو رخصت کر دے۔ یا رجوع کر لے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دے۔ بھلائی کے ساتھ چھوڑنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے جو حقوق ہیں مالی وہ ادا کر دے۔ اور اس کے بعد ایسی باتیں نہ بیان کرے کہ لوگوں کو اس سے رغبت نہ ہو۔ اور اس سے شادی نہ کر سکیں۔ تو تسریح کے معنی

یہ ہو سکے کہ چھوڑ دے۔ پھر عدت گذر جانے کے بعد وہ بائن ہو جائیگی۔ اور بالکل ہی ناپسند ہو تو تیسری بار طلاق دیدے۔ وہ مغلظہ طلاق ہو جائیگی۔ اس کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔ یہاں درمیان میں دو چیزیں آگئیں۔ یا تو اس کو دستور کے مطابق گھر میں رو کے یعنی کھانا کپڑا اکا انتظام کرے اور نقصان پہنچانے کی نیت سے نہ رو کے۔ حدود الٰہی قائم کرنے کے واسطے رو کے یا نہ رو کے۔ اور اس دور میں تم نے ان کو چڑھاوا وغیرہ جو کچھ بھی دیا ہے وہ ان سے نہ لو۔ وہ تمہارے لیے حرام ہے حلال نہیں۔ لوگ عورتوں کو اس طرح تنگ کیا کرتے تھے کہ وہ دیا ہوا مال واپس کر دے اس لیے یہ حکم نازل ہوا کہ دیا ہوا مال واپس مت لو۔ ایک عورت جمیلہؓ نام کی تھی وہ حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور انہوں نے اپنے شوہر کی برائی بیان کی۔ اور چاہا کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔ شوہر نے کہا کہ میں نے اس کو ایک باغ دیا ہے اگر وہ یہ واپس کر دے تو میں اسے چھوڑ دوں۔ وہ اس پر رضامند ہو گئی اور کہا کہ میں اس کے علاوہ بھی کچھ دینے کو تیار ہوں مگر یہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ بس جو اس نے دیا ہے وہ واپس کر دے۔ تیسری طلاق کے بعد تو کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اور دو طلاقوں کے بعد رجوع کر سکتا ہے اس لیے یہ دو باتیں درمیان میں بیان کر دیں۔

لیکن ایک صورت میں مال لے سکتے ہو کہ شوہر کو یہ خطرہ ہو کہ وہ اس کی اطاعت نہیں کریگی اور میں اس کو ایذا پہنچاؤں گا اور عورت کو یہ خیال ہو کہ یہ بدصورت ہے۔ یا اس کے ساتھ گذر نہیں ہو سکے گی۔ یا جو عورتوں کو خیال ہو تا ہے یعنی زن و شوہر اپنے حقوق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد ہیں حاصل نہیں کر سکیں گے اور فرائض پورے نہیں کر سکیں گے۔ تو ایسی صورت میں لے سکتا ہے۔ الا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ فان خفتم الا یقیما حدود اللہ۔ اگر تم کو یہ ڈر ہو یا گمان ہو کہ اللہ کے حدود قائم نہیں رہ سکیں گے تو

فلا جناح علیھما تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت فدیہ دیدے یعنی کچھ دیکر پیچھا چھڑا لے۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ یعنی علماء اسے طلاق بائن کہتے ہیں۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہ فسخ نکاح ہے۔ اگر یہ صورت ہو کہ ڈر ہو یا گمان ہو کہ حدود اللہ قائم نہیں رہ سکیں گے تو اس صورت میں دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے۔ کہ عورت فدیہ دے دے تو عام طور پر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں جتنا دیا ہے لے لے اس سے زیادہ نہ لے کیوں کہ اس کی سختی سے ممانعت ہے اور علماء کے دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ اگر وہ راضی خوشی سے دیدے تو زیادہ بھی لے سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ آیت ہے۔ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

اگر وہ اپنی خوشی سے اپنے مہر میں سے کچھ دیدیں تو کھاؤ پیو۔ وہ تمہیں رچتا پچتا ہے اس آیت کی رو سے راضی خوشی سے بھی خلع ہو سکتا ہے اور ایک جماعت علماء کی یہ کہتی ہے کہ خلع صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یہ ڈر ہو یا گمان ہو کہ مار پیٹ ہوگی۔ کھٹ کھٹ ہوگی معاشرے کا نظام نہیں بن سکے گا۔ اور دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ بات نہ بھی ہو اور محض راضی خوشی سے بھی طلاق ہو سکتی ہے۔ اور دلیل اس کی وہی آیت ہے جو اوپر آئی ہے ـ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ فَلَا تَعْتَدُوْهَا تم ان حدود سے آگے نہ بڑھو۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور جو لوگ اللہ کی حدود قائم نہیں کرتے اور ان سے تجاوز کرتے ہیں پس وہی لوگ ظالم ہیں۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ اور ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (ہود-۱۸) اس آیت کی رو سے جو لوگ ستاتے ہیں۔ ایذا پہنچاتے ہیں اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں یہی لوگ در اصل لعنت کے مستحق ہیں۔ یہاں تک مضمون دو طلاقوں کے متعلق ہے۔ آگے تیسری طلاق کے بارے میں

فرمایا۔ فان طلقها فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہٗ اگر تیسری طلاق دیدے تو اس کے بعد حلال نہیں ہے۔ اس کے لئے یہاں تک کہ دوسرے سے نکاح نہ کرے۔ یہ شرط لگادی۔ اب یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ امام شافعی کی رائے تو یہ ہے کہ اگر الگ الگ وقت میں تین طلاقیں دیں تب تو یہ طلاق سمجھی جائیگی ورنہ اگر ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو ایک ہی سمجھی جائے گی۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے ہاں اگرچہ ایک مرتبہ میں تین طلاقیں دینا حرام ہے۔ لیکن اگر کسی نے دیدی تو طلاق ہوجائیگی۔

یہاں ایک ننھی سی بات میری سمجھ میں آئی کہ تیسری طلاق کے بعد رجوع کے لئے پانچ شرطیں لگائیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ عورت عدت پوری کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ عدت پوری کرنے کے بعد اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ اس سے تعلق قائم کرے۔ چوتھی شرط ہے کہ پھر دوسرا شوہر از خود اس کو طلاق دیدے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ دونوں کی رضامندی ہو۔ جب یہ پانچوں شرطیں پوری ہوجائیں گی تب نکاح پہلا شوہر کرسکتا ہے۔ تو بڑی اکثریت یہی کہتی ہے کہ مرد عورت کا علاقہ ہو تب نکاح ہوسکتا ہے۔ اگر علاقہ نہ ہو تو نکاح نہیں کرسکتا۔ اس کو حلالہ کہتے ہیں یہ حلالہ اس وقت درست ہوگا جب مرد کا عورت سے صحیح تعلق ہوجائے۔ اگر صرف نکاح کرکے طلاق دیدی اور صحیح تعلق نہیں ہوا تو یہ حلالہ درست نہیں ہے۔ اور اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو یہ ناجائز ہے حرام ہے۔ ایسا کرنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔ ایسا حلالہ کرنا متعہ کے حکم میں ہے کہ وقت کا تعین کیا جاتا ہے اور متعہ حرام ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

یہاں جو بات میرے سمجھ میں آئی یہ ہے کہ اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ جب یہ کہیں کہ مرد نے عورت سے نکاح کیا تو اس کے معنی ہیں کہ عقد نکاح کیا۔ یعنی قاضی نے نکاح پڑھایا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی سے نکاح کیا تو بیوی ہونا تو پہلے سے ثابت ہو گیا
اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قاضی نے نکاح پڑھایا۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مرد نے عورت سے
تعلق قائم کیا۔ تو یہاں جو ہے حتیٰ تنکح زوجاً غیرہٗ یعنی اس شوہر کے علاوہ دوسرے
شوہر سے جو نکاح ہو وہ اس عمل اور فعل کے معنیٰ میں ہوا۔ اس لئے یہ قید لگائی۔ یہ عام مجتہدین
کی رائے ہے۔ زوج سے جو نکاح ہو گا تو زوجیت تو ثابت ہو گئی پہلے عقد نکاح سے تو نکاح
کے دو معنیٰ ہوئے ایک عقد نکاح اور ایک فعل۔ تو زوج کی طرف جب نکاح منسوب ہو تو
اس کے معنیٰ فعل کے ہیں۔ اور اگر سادہ آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنیٰ عقد نکاح کے
ہیں۔ اسی بنیاد پر عمل اور وطی کی قید لگائی ہے۔ یہاں ذرا سی نئی بات میرے خیال میں آئی اگر
دماغ صحیح ہو تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی نئی بات نکل آتی ہے۔ یہاں جو زوج سے نکاح کا فرمایا تو
نکاح جو ہے وہ مرد کرتا ہے عورت سے اور عورت جو نکاح کرتی ہے وہ درحقیقت عقد ہے
وہ یہ کہہ سکتی ہے مرد سے کہ میں تجھ سے نکاح کرتی ہوں۔ لیکن عمل جو ہے وہ عورت نہیں کرتی
مرد سے۔ بلکہ مرد کرتا ہے عورت سے یعنی عورت یہ کسی مرد سے جا کے کہہ سکتی ہے کہ یہ دو گواہ
موجود ہیں میں تجھ سے نکاح کرتی ہوں۔ یہ تو عقد ہو گیا۔ AGREEMENT لیکن فعل جو ہے اس
کا مبداء مرد ہے عورت نہیں۔ نکاح بمعنیٰ فعل عورت مرد سے نہیں کر سکتی۔ مرد عورت سے
کر سکتا ہے۔ مرد تو ہے متحرک اور عورت ہے ساکن۔ اور سکون جو ہے وہ انجام ہے حرکت کا
وہ مقصود ہے۔ وہاں سے حرکت نہیں ہو گی۔ وہاں تو حرکت ٹھہرے گی جا کر۔ کسی وقت بھی اسکے
خلاف نہیں ہو گا۔ ورنہ جو مقصد ہے اس کا وہ مقصد فوت ہو جائیگا۔ عورت ساکن ہے
اس کے لئے ایک حرکت کافی ہے۔ سکون انجام حرکت ہے۔ سکون ایک حرکت کا ہی ہو گا۔ لیکن
حرکت مختلف جہات میں ہو سکتی ہے۔ یہ فلسفیانہ بات آ گئی۔ اس لئے عورت صرف ایک مرد

نکاح کر سکتی ہے۔ اور مرد متعدد عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ طفیل احمد صاحب ایک اچھے اہلِ علم بزرگ ہیں وہ اکثر مجلسیں کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی پہلے ان میں شریک ہوا کرتا تھا مجھ سے بے حد علاقہ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں اب تو بہت عرصہ سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تو ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ایک عورت نے امریکہ سے انہیں خط لکھا ہے کہ مجھے یہ سمجھا دیں کہ اسلام نے مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دی اور عورت کو صرف ایک یہ کیا بات ہے تو وہاں ایک بزرگ بیٹھے تھے انہوں نے فرمایا کہ حضرت ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں یہ مسئلہ چند عورتوں نے پیش کیا تھا تو امام صاحب کی لڑکی نے فرمایا کہ آپ ان کو میرے پاس بھیج دیں میں ان کو اس کا جواب دیدوں گی۔ انہوں نے ایک پیالہ ان عورتوں کو دیا کہ سب اپنا اپنا دودھ اس میں نکال دیں۔ سب نے تھوڑا تھوڑا دودھ اس میں نکال دیا۔ اب ان سے کہا کہ اپنا دودھ شناخت کریں۔ انہوں نے کہا وہ تو سب مل گیا اب شناخت نہیں ہو سکتا۔ تب انہوں نے کہا کہ بس یہی مصلحت ہے۔ اگر عورت چار مردوں سے شادی کرے تو یہ شناخت نہیں ہو سکے گا کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ میں یہ سب حکایت سنتا رہا جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو میں نے کہا کہ انہوں نے بڑی اچھی بات کہی۔ نکاح کا مقصد اولاد پیدا کرنا ہے۔

وابتغوا ما کتب اللہ لکم یہ نقل کرو اور تلاش کرو اس میں اپنے (بقرہ ۱۸۶)
لئے وہ چیز جو خدا نے تمہارے لئے مقدر کی ہے۔ یعنی اولاد نرمقصد اولاد ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی اور مقصد ہوگا تو اس میں فنائے تشخص ہے۔ تو بقائے تشخص کے لئے بقائے نوع پیش نظر رہی ہے۔ یعنی اگر یہ نقل ہوتا رہے تو تشخص فنا ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ بالکل فنا ہو جائیگا۔ تو فنا سے بچانے کیلئے بقائے نوع کا طریقہ اللہ پاک نے مقرر فرما دیا۔ اور فوری

بقاء کے لیے اس شخص کے طعام اور شراب اور یہ سب مقرر کیا ہے۔ یہ فعل اس لئے مقرر کیا کہ یہ جثہ باقی رہے اور یہ فعل اس لئے مقرر کیا کہ نوع باقی رہے۔ وہ خود تو باقی رہ نہیں سکتا تو کوئی ہونا چاہیئے جو اس کا قائم مقام ہو۔ اور وہ بیٹا ہی ہو سکتا ہے تو اگر عورت سو مردوں سے بھی شادی کرے تو ایک ہی بچہ دیگی۔ برخلاف اس کے مرد مختلف عورتوں سے شادی کر کے متعدد بچے جنوا سکتا ہے اور چونکہ مقصد ہے اولاد تو عورت کو اگر زیادہ مردوں سے نکاح کی اجازت دیدی جاتی تو مقصد فوت ہو جاتا۔ اس لئے صرف مرد کو ہم عورتوں سے نکاح کی اجازت ملی۔ عورت کو نہیں دی گئی۔ یہ جواب ہے اور فلسفیانہ جواب وہ ہے جو سکون کیلئے یہ نہیں ہے کہ متعدد حرکتیں تلاش کرے۔ البتہ حرکت اپنے لئے مختلف جہتیں تلاش کرے گی اس لئے کہ سکون مطلوب ہے اور حرکت طالب ہے۔ مطلوبیت میں طالبیت ہو ہی نہیں سکتی اس لئے کہ ایک ہی شے کافی ہے طالبیت کی

رہا مسئلہ انبیاء کی کثرتِ ازدواج کا۔ اس کو عام لوگ نہیں سمجھے غذا کی اور طلب اولاد کی جو لذتیں ہیں۔ یہ انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں تو اگر انبیاءؑ ازدواج کی کثرت نہ کرتے تو روحانیت جو قاب قوسین او ادنیٰ تک لے گئی تھی ان کی اس قدر شدت ہوتی کہ آپؐ ہمیں تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو رحمۃ اللعالمین بنایا تھا۔ (نجم - ۹) اس لئے اللہ پاک نے توازن قائم رکھنے کیلئے ان کو اجازت دی ورنہ استغراق کی یہ کیفیت ہوتی کہ رؤسائے صدیقین بھی ان سے استفادہ نہ کر سکتے اور نہ ہم تم تک یہ استفادہ پہنچتا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ (احزاب - ۹۱) ہمارے یہاں پہلے سے یہ طریقہ جاری ہوا ہے انبیاء میں یہ کوئی بات نہیں۔ ان کے تو گیارہ ہی بیویاں تھیں اور نبیوں کی نو ان سے زیادہ تھیں۔ یہ بات میں نے کہی ہے مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ یہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ جہاز پانی کا جب خالی ہوتا ہے تو اس میں

توازن قائم رکھنے کیلئے پتھر بھر دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسا شدید استغراق ہوتا کہ عوام الناس کو فائدہ نہ پہنچتا۔ اولیاء اللہ میں بھی آپ نے دیکھا کہ جو زیادہ استغراق میں ہوتے ہیں وہ صاحب ارشاد نہیں ہوتے ان سے عوام کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے روحانیت اور مادیت میں توازن قائم رکھنے کیلئے انبیاء کو یہ حکم دیا گیا۔ یہ حکم بمنزلہ عبادت کے تھا۔ جس طرح نماز کا حکم دیا گیا اور عبادات کا حکم دیا تبلیغ کا حکم دیا۔ اسی طرح اس کا بھی دیا کہ شادی کرو۔ دو دن میں ایک وقت کھاؤ۔ فقلت لا یارب ولکن اشبع یوماً و اجوع یوماً (مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۵۴) عاماً کا کرتے رہے اللہ ایک دن میں بھوکا رہوں اور ایک دن میرا پیٹ بھرے۔ بھوکا رہوں گا تو صبر کروں گا۔ پیٹ بھرے گا تو شکر کرونگا۔ تو صبر و شکر کی جامعیت کی وجہ سے توازن قائم رکھنے کے لئے یہ رکھا کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن پیٹ بھروں۔ بات وہی صحیح ہے جو مجتہد کہیں۔ میں جو کہوں غلط مگر یہاں ذرا سی بات ہے کہ یہاں حتیٰ تنکح مؤنث کا صیغہ ہے کہ یہاں تک کہ عورت نکاح کرے کس سے کرے۔ غیر زوج اپنے شوہر کے علاوہ دوسرے مرد سے۔ پہلے شوہر کے علاوہ جو دوسرے سے نکاح کریگی تو وہ عقد نکاح تو کر سکتی ہے وطی نہیں کر سکتی۔ وطی تو شوہر کر سکتا ہے۔ بیوی کے ساتھ تو وہ شرط پوری ہو گئی۔ اگر وہ طلاق دیدے تو وہ پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ لفظ یہ بتا رہے ہیں کہ وطی کی شرط نہیں ہے اگر حتیٰ ینکح ہوتا تب تو وہ بات ٹھیک ہو جاتی لیکن حتیٰ تنکح زوجاً غیرہٗ تو عورت نے عقد نکاح کر لیا۔ وطی کی شرط نہیں کیونکہ عورت شوہر سے وطی نہیں کرے گی۔ شوہر کرے گا وطی عورت سے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

پھر اگر وہ طلاق دیدے۔ پھر ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ یہ آپس کی رضامندی سے

ایک دوسرے سے آپس میں نکاح کرلیں۔ بات وہی صحیح ہے جو مجتہدین کہتے ہیں۔ اگر میری بات صحیح بھی ہو تو غلط ہے۔ یہاں رجوع کے معنی وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ گویا وہ رجوع کرنے کے بعد ویسے ہی ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ اگر ان کا یہ خیال ہو کہ اللہ کے حدود قائم کریں گے اور اس کے مقرر کئے ہوئے طریقہ پر زندگی گذاریں گے تب تو وہ نکاح کریں۔ اگر ان کا یہ خیال نہ ہو عورت کو تکلیف دینا مقصود ہو تو نکاح نہیں کرنا چاہیئے۔ حرام ہے اور یہ حرام عندالشریعت نہیں۔ عندالشریعت تو نکاح ہو جائیگا۔ عورت کو ستائیے، ماریئے پیٹئے جو چاہے کیجئے۔ نکاح تو ہو جائیگا۔ قانون کے اندر مگر طریقہ برا ہے۔ گرفتار ہو جائیگا۔ دوسرے قانون کے اندر جیسے کسی کو بیس روپے دینا ہے تو اگر اس کی پوٹلی بنا کر گانٹ کے روپیہ کی زور سے اس کے منہ پر مار دے۔ تو قرض تو ادا ہو جائیگا مگر ادائیگی کا طریقہ غیر مشروع ہے۔ اس میں گرفتار ہو کر معذب ہو جائیگا اور سزا پائیگا۔ اسی طرح نکاح تو ہو جائیگا مگر نکاح کا طریقہ وہ غیر مشروع ہے وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو بیان کر دی ہیں۔ عاقل لوگوں کیلئے۔ تاکہ وہ سمجھ لیں اور انجام تک پہنچا دیں۔ یہ باریکیاں ہیں۔ وہ علماء کے لئے ہیں اور علماء اپنے طریقہ سے جہلا کو سمجھا دیں۔ عوام کی سمجھ میں یہ نہیں آئیں گی اس لئے اجتہاد کے ذریعہ اور قیاس کے ذریعہ ان کو سمجھا دیں۔

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن اور جب تم ان کو طلاق دیدو تو اعادہ کیا اس کا کہ رجوع کر لو اور یا نہ رجوع کرو تو ان کو علیحدہ کر دو، دستور اور قاعدہ کے مطابق یعنی مالی حقوق ادا کر دو۔ اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ دو۔ کسی سے برائی نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔

بمعروف او سرحوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضراراً لتعتدوا

اور ان کو ستانے کے لئے نہ روکو تاکہ تم ظالم ہو۔ ایسا نہ کرو۔

وَلا تمسکوھن ضراراً لتعتدوا

جس نے ایسا کیا اس نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا۔

وَمن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ ولا تتخذوا آیت اللہ ھزواً

نکتہ کی بات ہے اسے سمجھ لو کہ اللہ کی باتوں کو ٹھٹھا اور مذاق اور لغو نہ قرار دو۔ طلاق دی حیلہ شرعی کر کے رجوع کیا۔ پھر طلاق دیدی۔ پھر رجوع کر لیا۔ ایسا نہ کرو۔

وذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ

اور یاد کرو اس نعمت کو جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے اور جو تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اسکو یاد کرو۔ وہ نعمت اور کتاب اور حکمت کیلئے آتاری اس کے ذریعہ تم کو پاک کرتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ یہاں نکتہ کی بات ہے اسے بھی سمجھ لو۔ یہاں کتاب اور حکمت دونوں دی ہیں۔ کتاب اور شے ہے اور حکمت اور شے ہے۔ کتاب ہے کلام اللہ اور حکمت ہے۔ سنت رسول صلعم دونوں سے وعظ کیا جائیگا۔ دونوں سے استدلال کیا جائیگا۔ واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بکل شیئٍ علیم (بقرہ ۲۳۱)۔ اور خوب جان لو کہ اللہ ہر شے کو جانتا ہے۔

ایک ضابطہ بتلاتا ہوں۔ اسے سمجھ لیں بہت مفید ہے۔ اور میں اس میں منفرد ہوں۔ مجھ سے پہلے یہ ضابطہ کسی نے نہیں بیان کیا۔ کہ مقصود ترکیب ہے اجزا نہیں ہیں لیکن ترکیب چونکہ موقوف ہے اجزاء پر اس لئے ان کو دیا کیا جاتا ہے۔ اجزا مقصود نہیں ہوتے بلکہ اجزا سے جو شے بنتی ہے وہ مقصود ہوا کرتی ہے۔ یہ اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے جو میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ یہ ترکیب جو ہے یہ اللہ کی نعمت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(بقرہ-۲۳۲)

اور جب ان کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو مت روکو ان کو اس بات سے کہ وہ نکاح کریں اپنے شوہروں سے کب جب کہ رضامندی ہو جائے آپس میں شرع کے مطابق یا دستور کے مطابق۔ معروف کے دونوں معنی ہیں۔ ایسا رسم و رواج جس کی شرع نے اجازت دیدی ہے وہ بھی شرعی چیز ہے۔ ان آیات سے جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں ان سے ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور روز جزا پر چوں کہ یہ گناہوں کے دور کرنے کا اور ثواب کا زیادہ موجب ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ ترجمہ ہو گیا آیت کا اس سے پہلے بھی الہٰی الفاظ کی آیت اوپر آئی ہے یہ اس کے آگے مضمون ہے واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف اوسرحوھن بمعروف کہ قانون کے مطابق ان عورتوں کو روک لو۔ یا ان کو رخصت کر دو۔ تو وہاں فبلغن اجلھن کے معنی یہ تھے کہ جب وہ اپنی

میعاد کو پہنچنے کو ہوں۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ عدت ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے بھی شوہر کو اختیار ہے۔ وہ اس کو روک سکتا ہے۔ اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں یا اسے چھوڑ دے چھوڑ دینے کے یہ معنی ہیں کہ اسے ترک کرے اور یہاں فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کے یہ معنی ہیں کہ جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں یعنی اپنی عدت گذار لیں تو اب ضرورت نہیں ہے کیونکہ عدت پوری ہونے کے بعد نہ روکنے کا حق نہ چھوڑنے کا حق ہے تو اس کا حکم بتایا کہ فلا تعضلوھن ان کو منع نہ کرو اس بات سے کہ وہ نکاح کریں اپنے شوہروں کے ساتھ جب کہ ان میں آپس میں رضامندی ہو جائے معروف طریقہ پر۔

یہاں ایک باریک بات ہے۔ میں بیان کرتا ہوں غور سے سنیں علمی مسئلہ ہے۔ شان نزول اس کا یہ ہے کہ بن یسار صحابی تھے۔ آپ نے اپنی بہن کی ایک آدمی سے شادی کر دی۔ اس کا نام جمیل تھا اس نے ان کو طلاق دیدی۔ پھر اس کو کچھ ندامت سی ہوئی۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھ سے نکاح کرلے۔ وہ رضامند ہو گئیں تو انہوں نے غصہ کیا اور ان کو روکا کہ ابھی تو اس نے طلاق دی ہے اور تو پھر اسی سے نکاح کرنے کو تیار ہو گئی دوسری روایت یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ نے اپنی چچا کی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ اس نے طلاق دے دی تو بعد پورے ہونے عدت کے اس نے دوبارہ نکاح کرنا چاہا۔ تو جابر نے انہیں نکاح کرنے سے روکا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ہے یہ مفسرین کا بیان ہے تو آیت کے معنی یہ ہونے کہ جب وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو مت روکو۔ یہ کس سے خطاب ہے شوہروں سے ہے یا اولیاء سے ہے۔ عدت پوری ہونے سے پہلے تو شوہر کو روکنے کا اختیار ہے لیکن عدت پوری ہونے کے بعد کا ذکر ہے تو یہاں مجتہدین کے دو گروہ ہیں زیادہ تعداد اس طرف ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خطاب عورت کے اولیاء اور سرپرستوں کیطرف ہے لیکن ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ خطاب شوہروں ہی کی طرف ہے اور دلیل ان کی یہ ہے کہ جب تم ان کو طلاق دے دو اور وہ

عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو روکو نہیں۔ تو یہ تو ہے مضمون صحیح یعنی شوہر جو طلاق دیدیں وہ نہ روکیں۔ اور اگر مطلب یہ ہوگا کہ اے سرپرستو تم نہ روکو تو آیت کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ اے شوہرو جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ عدت پوری کر چکیں تو اے سرپرستو تم ان کو نہ روکو تو یہ فقرہ بے ربط سا ہو جائیگا تو اللہ کے کلام میں کسی بے ربطی نہیں ہونی چاہیئے۔ اور یہ مستقل معنی ہیں کہ اے طلاق دینے والو! جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو اور وہ عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو نہ روکو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ عدت گذار دیں یہ شرط ہے تو تم "اے شوہروان کو منع نہ کرو" تو یہ تو جزا اس شرط کی ہو سکتی ہے" مگر اے سرپرستو تم منع نہ کرو" یہ ٹکڑا منفک ہو جائیگا۔ بے ربط ہو جائیگا۔ یہ اس کی جزا نہیں ہو سکتا۔ شرط و جزا میں ربط نہیں رہے گا اور خدا کے کلام کو بے ربطی سے محفوظ رہنا چاہیئے۔ اور ایک دلیل ان کی یہ ہے کہ اور بھی جو اس مضمون کی آیات ہیں ان میں بھی مراد شوہر ہی ہیں۔ شوہروں ہی کا ذکر ہے سرپرستوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اب جو یہ کہتے ہیں کہ خطاب سرپرستوں کی طرف ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ شان نزول جو ہے وہ سرپرستوں میں آیا ہے۔ بھائی نے بہن کو روکا کہ نکاح نہ کر تو شان نزول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس بھائی نے نکاح سے روکا تھا اس کی طرف خطاب ہے اور وہ سرپرست تھا حضورؐ نے معقل ابن یسار کو بلایا اور یہ آیت پڑھی۔ انہوں نے سن کر کہا کہ میں نے اپنی ناک کو خدا کے حکم کے آگے نیچا کر دیا۔ اور میں حکم ماننے کو تیار ہوں۔ اور اپنی بہن کا اسی شوہر سے نکاح کر دیا۔ اگر ایک یا دو طلاق دیدے تو دوران عدت وہ رجوع کر سکتا ہے۔ رضامندی یا نکاح کے بغیر بعد عدت وہ نکاح کر سکتا ہے بشرط رضامندی۔ اگر تین طلاقیں دے دے تو حلالہ کے بغیر نہیں کر سکتا۔ تو انہوں نے کہا کہ اس حدیث سے یہ پتا چلتا ہے کہ خطاب بھائی اور سرپرست کی طرف ہوا۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ یہ جو حکم ہے" نکاح سے نہ روکو" وہ عدت

گذرنے سے پہلے نہ روکو یا عدت گذرنے کے بعد نہ روکو کیا مراد ہے اس سے۔ اگر اس سے مراد
عدت گذرنے سے پہلے ہوگی تو اس کی ضرورت نہیں وہ نکاح کے بغیر اس کو اختیار ہے کہ
روک لے اور اگر اس سے مطلب ہے کہ عدّت گذرنے کے بعد نہ روکو تو آدمی نکاح تو جب کریگا
جب پہلے منگنی کریگا۔ اور مانگا ڈال نہیں سکتا جب تک کہ عدت ختم نہ ہو جائے۔ نکاح سے
پہلے منگنی کریگا اور منگنی سے پہلے عدت ختم ہونی چاہیئے۔ تو عدت گذرنے کے بعد جو نکاح
کریگی یہاں اس کا حکم ہے اس نکاح سے عورت کو نہ روکو انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ اگر
یہاں شوہر مخاطب ہوں گے تو معنی بالکل خبط ہو جائیں گے کہ اے شوہرو تم ان کو اپنے شوہروں
سے نکاح سے نہ روکو۔ وہ اپنے سے نکاح سے کیسے روکیں گے تو یہ معنی جو ہیں غلط ہیں۔
بلکہ اے شوہرو جب تم طلاق دے دو اپنی عورتوں کو اور عدت کا وقت گذر جائے تو اے
شوہرو تم مت روکو عورتوں کو اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے تو یہ بے معنی ہو گئے تو معلوم
ہوا کہ خطاب اولیاء کی طرف ہے اگر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اے شوہرو جب تم اپنی عورتوں
کو طلاق دے دو۔ اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو اے سرپرستو تم ان کو اپنے شوہروں سے
نکاح کرنے سے نہ روکو تو یہ معنی صحیح ہو گئے تو یہ اور پہلی دلیلیں دونوں غلط ہیں پہلی بات
تو یہ ہے کہ جس حدیث میں سرپرستوں کی طرف اشارہ ہے وہ ہے خبر واحد اور قرآن جو ہے
وہ قطعی الثبوت ہے۔ تو قرآن کی حفاظت زیادہ اہم ہے حدیث کی حفاظت سے۔ اگر
حدیث کی حفاظت کرتے ہیں اور اولیاء کو مخاطب بناتے ہیں تو قرآن کی حفاظت نہیں ہوتی
اور قرآن منفک ہو جاتا ہے اور اے شوہرو تم جب اپنی عورتوں کو طلاق دے دو تو اے
سرپرستو تم ان کو نہ روکو تو یہ بے معنی ہوا۔ کیونکہ اے شوہرو تم جب اپنی عورتوں کو طلاق دے
دو یہ شرط ہے اور اگلا جملہ جو ہے وہ جزا ہے۔ تو جو طلاق دے وہی روکے تو اس لئے دلیلی

سے قرآن کو بچانا حدیث کی حفاظت سے مقدم ہے۔ دوسری دلیل یہ بیان کی کہ جب وہ راضی خوشی سے اپنے شوہروں سے نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو مت روکو تو یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ ان شوہروں سے جنہوں نے ان کو طلاق دی ہے ان سے نکاح کرنا چاہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ دوسرے مردوں سے اگر وہ رضامندی سے نکاح کرنا چاہیں تو ان کو ایسا کرنے سے نہ روکو۔ یہاں لفظ شوہر سے دھوکا لگا۔ شوہر غیر مرد ہو نہیں سکتا تو وہ خود آپ ہی شوہر ہوگا تو یہ معنی مستقل نہیں ہیں گے تو یہاں مراد شوہر نہیں لی ہے تو اب مطلب یہ ہوا کہ اے شوہرو جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور انکی عدت پوری ہو جائے اور وہ رضامندی سے اور لوگوں سے نکاح کرنا چاہیں تو اے شوہرو تم ان کو دوسرے مردوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تم نہ روکو ان کو اپنے سے نکاح کرنے سے دونوں کا جواب ہو گیا۔ یہاں دو طلاقوں کا ذکر ہے تین طلاقوں کا نہیں۔ تین طلاقوں کا ذکر پہلے گذر چکا کہ اگر تم تین طلاقیں دے دو تو تم کو ان سے شادی کرنے کا حق نہیں ہے تاوقتیکہ حلالہ نہ ہو۔

فان طلقها فلا تحل لهم من بعد تو یہاں مخاطب شوہر ہی ہیں اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ یہاں مخاطب اولیاء ہیں۔ یہ اصول ان کا ہے اس پر غور کریں ورنہ مطلق سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ خطاب سرپرستوں کی طرف ہوا تو اولیاء سے کہا کہ تم ان کو نکاح کرنے سے نہ روکو۔ یہ کب ہو سکتا ہے جب وہ نکاح سے روکنے پر قادر ہوں۔ اور اگر وہ قادر نہ ہونگے تو ان کو نکاح کے روکنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ کیوں کہ جب وہ قادر ہی نہیں تو حکم دینا بے سود ہے اللہ پاک نے جب ان کو حکم دے دیا کہ ان کو نہ روکو تو معلوم ہوا کہ ان کو طاقت ہے کہ عورتوں کو نکاح کرنے سے روک دیں۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ عورت مجبور ہے اور اپنا نکاح کرنے پر

قادر نہ رہی۔ اور نکاح کرنا ضروری ہے۔ تو اس کو ولی کو وکیل کرنا ہوگا۔ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ بغیر ولی کے نکاح درست نہیں ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ بغیر ولی کے نکاح درست ہے۔

میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ولی کو نکاح سے روکنے کی قدرت ہے۔ قدرت کا اثبات انہوں نے اس بات سے کیا کہ اگر قدرت نہ ہوتی تو ممانعت نہ کی جاتی۔ کیوں کہ جس کو روکنے کی قدرت نہ ہو اس سے کیسے کہا جائے گا کہ نہ روک وہ تو جس کو روکنے کی قدرت ہوگی اس کو حکم دیا جائے گا کہ تو نہ روک۔ امام شافعیؒ نے یہ دلیل فرمائی۔ اول تو یہ اصول ہی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا کہ خطاب اولیاء سے ہے اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مخاطب ولی ہیں تب بھی اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ان کو روکنے کی قدرت ہے مگر حق نہیں ہے کیوں کہ کسی شے پر قادر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا حق بھی ہو۔ آدمی چوری کرنے پر قادر ہے لیکن اس قدرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا یہ فعل حق ہے یہ کسی حنفی نے نہیں کیا۔ بڑی عجیب بات ہے آدمی کو ہر برا فعل کرنے پر قدرت ہے لیکن قدرت کے ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ اس کو برا فعل کرنے کا حق بھی ہے۔ سرپرستوں کو شراب پینے پر قدرت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو شراب پینے کا حق بھی ہے۔ اسی طرح ان میں عورتوں کو نکاح سے روکنے کی قدرت کا ہونا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عند الشرع اور عند اللہ ان کو نکاح سے عورتوں کو روکنے کا حق ہے تو دلیل ختم ہوگئی۔ یہ بات تو کہی یہ تو بڑی بات تھی۔ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ روکنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم نکاح نہ کرو۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ نکاح جب کرے گی حبتی کی منگنی ڈالے گا۔ جب منگنی ڈالے گا تو عورت سرپرستوں سے مشورہ کرے گی۔ اب مشورہ دو تم

کا ہوگا۔ یا تو یہ ہوگا کہ نکاح کرے اور یا یہ ہوگا کہ نہ کر۔ تو وہ جو مشورہ ہے کرنے نہ کرنے
کا وہ ہے سرپرستوں کی طرف۔ وہ جو مشورہ دیں عورت قادر ہے اس کے خلاف کرنے
پر۔ وہ مشورہ دیں کہ نہ کر وہ کہے کہ میں تو کرتی ہوں اس کو اس کا حق ہے۔ یا وہ مشورہ دیں
کہ کرے تو وہ کہہ سکتی ہے کہ میں تو نہیں کرتی۔ تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ مشورہ دے
سکتے ہیں اور وہاں جو شوہروں سے کہا کہ ان کو غیر مردوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو تو اس
کا مطلب ہے کہ اے شوہرو تم غیر مردوں سے ان کی برائی نہ کرو کہ ان کو کراہت ہو یا انہیں
دھمکی مت دو کہ اگر اس سے شادی کر لی تو مار ڈالوں گا وغیرہ اس قسم کی باتیں نہ کرو یا یہ کہ
میاں میں نے طلاق نہیں دی۔ دوران طلاق رجوع کر لیا۔ ایسی باتیں کرکے اے شوہرو تم ان
کو شادی کرنے سے نہ روکو یہ ہے مطلب۔ یہاں دقّت یہ ہے کہ یہاں زوج کا لفظ آیا ہے
اور غیر مردوں سے شادی کی تو غیر مرد زوج نہ تھا۔ اور جو گذر گیا وہ بھی اب زوج نہ رہا۔
ان کا خیال غلط ہے۔ بلکہ دونوں کے لئے زوج کا لفظ آتا ہے جیسے شوہر کا لفظ دونوں
کے لئے آتا ہے۔ حَتّٰی تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ تین طلاقوں کے بعد وہ شادی نہیں کر سکتی
پہلے شوہر سے جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے شادی نہ کرے تو دوسرے مرد کے لئے
یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے زوج کا ہی لفظ استعمال کیا ہے یعنی ہونے والے شوہر کو بھی شوہر
کہہ سکتے ہیں اور جس نے طلاق دیدی اس کو بھی شوہر کہہ سکتے ہیں۔ ان کو کھٹکا لگا تو میں
نے یہ کہا کہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ اولیاء اور سرپرستوں کو قدرت ہے روکنے
کی یہ ٹھیک ہے۔ روکنے کی قدرت تو ہر شخص کو ہے مگر حق کسی کو نہیں ہے۔ ماں بہن
بھائی چچا وغیرہ کو یہ قدرت ہے کہ عورت کے ہاتھ پیر باندھ دے کوٹھڑی میں بند کرے
لیکن یہ قدرت ہے حق نہیں ہے۔ تو وہ روک سکتا ہے تو روک سکنے کی قدرت

ہونا اور چیز ہے اور اس کا حق ہونا یہ اور چیز ہے۔ عورت کو حق حاصل ہے کوئی روکے نہ روکے وہ کر سکتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے یہ فرمایا کہ عورت کو نکاح کرنے سے نہ روکو۔ یعنی نکاح کرنے کی نسبت اللہ پاک نے عورت کی طرف کی یہی معنی اس کے حق ہونے کے ہیں یہ دقیق بات ہے۔ اگر نکاح کرنا بری بات ہوتی تو اس فعل کو کرنے سے روکنا ناجائز ہوتا۔ یعنی اگر بغیر ولی کے عورت کا نکاح کرنا قبیح ہوتا تو ولی کا اس کو روکنا اچھی بات ہوتی۔ اور ان سے کہا کہ نہ روکو تو معلوم ہوا کہ یہ فعل قبیح نہیں ہے بلکہ اچھا ہے کیونکہ اچھی بات سے نہ روکنا اچھا ہے۔ اگر بری بات ہوتی تو روکنے کا حق دیا جاتا۔ نہ روکنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کی دلیل ہے۔ نکاح کرنے کی نسبت عورت کی طرف ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عورت اس کی فاعل ہے یعنی اس کو نکاح کرنے کا حق ہے اور اسکی شرعی دلیل یہ ہے کہ حتیٰ ینکح زوجا غیرہ

اگر کوئی مومن عورت اپنے آپ کو پیش کردے تو نبی کو اختیار ہے کہ وہ اگر چاہے تو اس سے نکاح کرے تو وہاں ولی کا ذکر ہی نہیں ہے۔ عورت کو نکاح کرنے اور پیش کرنیکا حق ثابت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی شرعی دلیل اور عقلی دلیل وہ جو اوپر بیان ہوئی کہ اگر عورت کا بغیر ولی کے نکاح کرنا شرعاً ناجائز فعل ہوتا تو اس ناجائز فعل کو روکنا حق ہوتا۔ اگر اس کا روکنا حق ہوتا۔ اگر اس کو روکنا حق ہوتا تو اس کو کہنا کہ نہ روک یہ ناحق ہو جاتا۔ لیکن خدا کہہ رہا ہے کہ نہ روک تو پتہ چلا کہ عورت کا بغیر ولی کے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔

جب ان میں رضامندی آپس میں ہو جائے تو آپس میں رضامندی کے

معنی ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ رضامندی شرع کے مطابق ہو۔ اور مہر مثل ہو۔ لیکن اگر وہ کم سے کم مہر پر رضامند ہوگئی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ نکاح درست ہے اب جوان ہے کم مہر پر نکاح پر رضامند ہوگئی کہ ولی اور سرپرست کو اعتراض کرنے کا حق ہے کہ تو نے تو ہماری ناک کاٹ ڈالی۔ اب اور لڑکیوں کا جب مہر بندھے گا تو وہ کہیں گے کہ فلاں کا تو اتنے کم کا بندھا ہے تو اعتراض کرنے کا حق تو ہے مگر نکاح درست ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ کچھ نہ لے اور کم سے کم مہر لے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ اس سے ان لوگوں کو نصیحت کی تخصیص کی جا رہی ہے جو اللہ پر اور روز جزا پر ایمان لائے اس سے پتہ چلا کہ ان احکام کے مکلف اہل ایمان ہیں، جو لوگ ایمان نہیں لائے وہ ان احکام کے مکلف نہیں ہیں۔

جہاں حکم عام ہے وہاں مطلب یہ ہے کہ اے لوگو! عبادت کرو۔ قبل اس کے کہ تم ایمان لاؤ۔ اور یہاں حکم مومن کو ہے یعنی پہلے ایمان ہوگا پھر حکم نافذ ہوگا۔ یا اس لیئے فرمایا کہ فائدہ اٹھانے والی جماعت چونکہ مومنوں ہی کی ہے اس لیئے مومن کی تخصیص کر دی متقی لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔ حالانکہ قرآن ہدایت متقی غیر متقی دونوں کے لئے ہے۔ اسی طرح یہاں مومن کی تخصیص کر دی۔ حالانکہ فائدہ اٹھائیں گے مومن باللہ اور من بالاخرہ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ نصیحت جب کی جائے گی وہ مؤثر اس وقت ہوگی جب نتیجہ پیش نظر ہو۔ فعل کرنے کے بعد اسکی اچھائی اور برائی پیش نظر ہونی چاہیئے۔ تو جب تک فعل کے کرنے کے انجاموں پر نظر نہیں ہوگی نصیحت اس کے لیئے بے کار ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ نصیحت جب کارگر ہوگی جب اس بات کا پختہ یقین ہو کہ برا فعل کرونگا تو یہ سزا اور اچھا فعل کرونگا تو یہ جزاء ملے گی۔ اور چونکہ سزا اور جزا کا دینے والا خدا ہے اس لئے کہا کہ پہلے اللہ پر ایمان ہوگا کہ اگر اس کے حکم

کے خلاف کیا تو یہ سزا ملے گی اور اگر حکم کے موافق کیا تو یہ انعام ملے گا۔ اس لئے یہ قید لگائی کہ اس سے فائدہ ان لوگوں کو ہوگا جن کا اللہ پر اور روزِ جزا پر ایمان ہوگا کیونکہ اس قسم کے جو اعمال ہیں یہ درحقیقت انتظام عالم میں دخیل ہیں۔ معاشرہ بگڑ جائیگا اور اگر عورتوں عورتوں کا یہ قصہ چلا تو انتظام عالم بگڑ جائیگا۔ اور جب نظام بگڑ گیا تو عبادت کے لئے وقت نہیں ملے گا۔ بیوی کچھ کہتی ہے بہن کچھ کہتی ہے۔ ماں کچھ کہتی ہے۔ ہر وقت گھر میں جھگڑا رہتا ہے۔ ہر وقت کی کل کل سے دل تنگ آگیا۔ حالانکہ ان کی آواز میں نے سن لی تھی۔ مگر اس جھگڑے فساد کیوجہ سے میں نہیں آسکا جماعت قضا ہوگئی تو اس طرح نظام جب گھر کا بگڑ گیا تو نہ عبادت میں دل لگے گا اور نہ صحیح وقت پر نماز ادا ہوگی۔ لیکن گھر کا نظام درست ہے تو قلب کو سکون رہے گا اور عبادت میں دل لگے گا۔ اس لئے کہا کہ جو اللہ پر اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں ان کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ بڑی سخت وعید ہے۔ بڑی کڑی ڈانٹ ہے تہدید ہے اس میں کہ گھر کے نظام کو باقی رکھو۔ جو نظام عالم کو باقی رکھیں۔ وہ کام کرو جو نظام عالم میں مخل ہیں وہ کام نہ کرو۔ نظام عالم میں جو مخل ہیں وہ گناہ کبیرہ ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ کسی عالم یا مفسر نے گناہ کبیرہ کی یہ تعریف بیان نہیں کی۔ کبیرہ اس جرم کو کہتے ہیں جو نظام عالم میں مخل ہو۔ اور گناہ صغیرہ اس کو کہتے ہیں جس سے نظام عالم تباہ تو نہ ہو لیکن تباہ ہو سکے۔ جیسے بوری میں سے ایک دانہ گیہوں چرالیا۔ تو یہ گناہ صغیرہ ہے۔ اس سے بوری میں کمی نہیں آئیگی کھانے والوں کے لئے کوئی کمی واقع ہوگی لیکن اگر ایک ایک دانہ سب چرالیں تو بوری ختم ہوجائیگی۔ نظام عالم خراب ہوجائیگا۔ تو ایک دانہ چرانا تو ہوا گناہ صغیرہ اور بوری چرانا ہوا گناہ کبیرہ اور نظام الوہیت تباہ کرنے والی جو چیز ہے وہ کفر ہے کیونکہ جب خالق کا انکار کر دیا۔ اور خالق ہی مؤثر تھا تمام

کائنات میں جب اثر نہیں رہا تو یہ کائنات بے مالک کی لونڈی رہ گئی۔ اور سارا نظام بگڑ گیا۔ نظام الوہیت تباہ کرنا کفر، نظام عالم تباہ کرنا گناہ کبیرہ اور جو استعداد پیدا کرے نظام عالم تباہ کرنے کی وہ گناہ صغیرہ ذٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ ازکی معنی بڑھنا۔ بے شمار بڑھنا اگر تم اس کو کروگے تو تمہارے ثواب بڑھتے بڑھتے بے شمار ہو جائیں گے۔ بے انتہا ثواب ملے گا تم کو غلطی یہ لگتی ہے کہ یہاں کے رحیموں کریموں کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ دو آنے چار آنے دیتے ہیں وہ دو چار روپے دیدے گا۔ ہزار دو ہزار دے دے گا۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کا فعل ہے متناہی اور وہ ہے لامتناہی تو لامتناہی کی طرف سے جو بھی جھٹکا لگے جو کچھ ادھر سے ملے گا وہ بھی لامتناہی ہی ہوگا۔ تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تمہارا نیک عمل اتنا بڑھے گا کہ سارے عالم میں وہ نہیں سما سکتا۔ 'واطہر' اور تمہیں پاک کردے گا۔ جتنے گناہ تم نے کئے ہیں جب تم یہ کام کروگے تو وہ بھی معاف ہو جائیں گے۔ سب سے زیادہ تو نظام عالم کو باقی رکھنے کیلئے اور تم کو ثواب بھی ملے گا۔ اور گناہوں سے بھی تم کو پاک کردیگا۔

اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے وہ جانتا ہے کہ تم نے جو عمل کیا ہے اس کا کتنا انعام ہے لا انتہا اور اس کی سزا بھی لا انتہا ہے۔ یہاں بھی دیکھ لیجئے۔ ایک پہلوان اگر دھکا دے تو کتنی دور جا گرے گا۔ اور بڑا پہلوان دھکا دے اور دور جا گرے گا۔ جوں جوں طاقت بڑھتی جائیگی دور جا گرے گا۔ ریل کا انجن یا موٹر کا اگر دھکا لگے تو کتنی دور جا گرے گا۔ اسی سے اندازہ لگاؤ کہ اگر لا انتہا کا طمانچہ لگے گا تو کیا انجام ہوگا۔ اور لا انتہا کا انعام ملے گا تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ تو اس نے کہا کہ واللہ یعلم اللہ خوب جانتا ہے کہ اس نیکی کا کتنا بڑا انعام ہے۔ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ تم نہیں جانتے۔ تم تو صرف اتنا ہی جانتے ہو جتنا تمہیں بتا دیا۔ عقلی دلیل سے بھی آپ کو سمجھا دوں۔ میں نے بیان کیا تو آپ خوش ہوئے۔ آپ کی

خوشی سے مجھے خوشی ہوئی فرض کرو ایک آنہ۔ اب اگر آپ سے بڑا کوئی آجائے اور وہ خوش ہو جائے تو مجھے چار آنے خوشی ہوگی۔ اور اس سے بھی بڑا کوئی سیکرٹری وزیر یا صدر آجائے اور وہ خوش ہو جائے تو اور زیادہ خوشی ہوگی۔ فرض کرو آٹھ آنہ تو ایسے ہی بڑھتے بڑھتے کوئی ایسا بڑا آجائے کہ اس سے بڑا کوئی نہ ہو تو اتنی خوشی ہوگی کہ اس سے بڑی کوئی خوشی نہ ہوگی۔ تو اللہ کی رضا کے حاصل کرنے سے جو خوشی ہوگی اس کی کوئی انتہا نہیں ہے تو ہم کو چاہیئے کہ اللہ پاک کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اب اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۞ (بقرہ-۲۳۴-۲۳۵)

اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو گئے ہیں اور انہوں نے بیویاں چھوڑی ہیں تو ان بیویوں کو چاہیئے کہ چار ماہ دس دن تک اپنے آپ کو روکے رکھیں. پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملہ میں معروف طریقہ پر شرع اور عقل کے مطابق کریں۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

والذین یتوفون منکم جو لوگ تم میں سے وفات پا گئے ہیں اور بیویوں کو چھوڑا۔ یہاں ذرا سی دقت ہے کہ اس جملہ کی خبر کیا ہونی چاہیئے. وہ حالت یہاں مذکور نہیں ہے. یعنی جو لوگ وفات پا گئے اور بیویوں کو چھوڑ گئے ان کا کیا ہوا یہاں مذکور نہیں ہے. ایک گروہ تو یہ کہتا ہے چونکہ بیویوں کا ذکر ہے اس لئے شوہروں کا ذکر یونہی چھوڑ دیا. تو یہ تو بالکل غلط بات ہے کہ مبتدا بیان کرے اور خبر نہ ہو اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ والذین یتوفون منکم کے یہ معنی ہیں کہ ازواج الذین یتوفون منکم یعنی جو لوگ مر گئے ہیں ان کی بیویاں اپنے آپ کو روکیں ازواج الذین محذوف ہے یعنی مبتدا ہو گئیں پھر ان کی خبر یہ ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں عدت پوری کریں الخ۔ اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ آگے چل کر ھم محذوف ہے ازواجًا یہاں ازواجھم ہے۔ ان کی بیویوں کو چاہیئے کہ چار مہینے دس دن تک اپنے آپ کو روکے رکھیں عدت پوری کریں الخ۔ اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ازواجًا کے بعد ھُم کا لفظ محذوف ہے

جو لوگ مر گئے اور بیویاں چھوڑ گئے ان کے بعد ان کی بیویاں اپنے آپ کو روکیں تو بات صحیح ہو گئی۔ یہ چار رائے ہیں مفسرین کی کہ محذوف نکالنے کے بعد عبارت مستقیم ہو گئی۔ اور معنی سمجھ میں آ گئے ورنہ معنی سمجھ میں نہیں آتے کہ جو لوگ مر گئے ان کی خبر کیا ہوئی۔ خبر جو بیان ہے وہ ان کی بیویوں کی ہے گویا تو آگے پیچھے بیویوں کا لفظ محذوف ہے اور اس قسم کے حذف قرآن شریف میں جگہ جگہ ہیں۔ جیسے لا یغرنك تقلب الذین کفروا فی البلاد متاع قلیل (عمران - ۱۹۶) ان لوگوں سے جو شہر میں اپلے گیلے پھرتے ہیں ان سے دھوکے میں نہ آنا۔ یہ متاعِ قلیل ہے۔ یہاں متاعِ قلیل کا مبدا محذوف ہے یعنی ان لوگوں کی چلت پھرت لیلے گیلے پھرنا معمولی سی بات ہے۔ معمولی سا فائدہ اٹھانا ہے۔ قل افانبئکم بشرمن ذلکم۔ النار کہہ دے کہ میں آگاہ کر دوں اس چیز سے جو اس سے زیادہ بری ہے۔ (حج - ۷۲) النار یعنی ہو النار۔ وہ بدترین چیز ہے تو اس قسم کے حذف قرآن مجید میں جگہ جگہ ہیں تو لفظوں کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ ورنہ قرآن کے معنی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اور جو لفظوں کے صحیح معنی نہیں جانتا وہ ترجمہ صحیح نہیں کرے گا۔ یتوفون منکم کے معنی لغت میں مرنے ہی کے ہیں۔ یعنی جو لوگ مر گئے تم میں سے لغت میں اور عام طور پر قرآن میں یتوفون کے معنی موت ہی آئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ قادیانی کہتے ہیں کہ فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم اللہ جب پوچھے گا عیسیٰ سے کہ تو نے تثلیث کی تبلیغ کی تھی تو وہ کہیں گے کہ جب (مائدہ - ۱۱۰) تو نے مجھے وفات دیدی موت دے دی۔ تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ تو میرے مرنے کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ ان کا کیا ہوا۔ تو قادیانی فلما توفیتنی سے استدلال کرتے ہیں کہ جب تو نے مجھے موت دیدی کنت انت الرقیب تو تو نگہبان کا نگہبان تھا۔ تو موت کے بعد مجھے پتہ نہیں انہوں نے کیا کیا تین خدا کہے یا کیا کیا۔ اور ہمارے یہاں یہ ہے کہ وفات کے معنی یہاں رفع کے ہیں یعنی جب تو نے

مجھے آسمان پر اٹھا لیا۔ وان من اھل الکتب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ کوئی اہل
(النساء-۱۵۹)
ایسا نہیں ہے جو عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے۔ تو اب دو ہزار سال ہو چکے عیسیٰ
کو اور اب تک یہودی اہل کتاب موجود ہیں جو عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے۔ تو اس آیت سے پتہ چلا
کہ عیسیٰؑ ابھی تک زندہ ہیں۔ جب اس آیت سے ان کی زندگی ثابت ہو گئی تو فلما توفیتنی سے
استدلال کرتے ہیں کہ جب تو نے مجھے آسمان پر زندہ سلامت اٹھا لیا تو میرے آسمان پر اٹھا
لینے کے بعد تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا کیا۔ یہ مسئلہ میں نے آپ
کو بتا دیا۔ آیت پڑھ کر سنا دی بہت مفید چیز ہے۔ اسے یاد رکھیئے۔ جب اہل کتاب ان کی وفات
سے پہلے ان پر ضرور ایمان لے آئے گا اور اب تک ایمان نہیں لایا تو پتہ چلا کہ ان کی وفات
ابھی نہیں ہوئی وہ زندہ ہیں۔ تو فلما توفیتنی کے معنی ہیں فلما رفعتنی
جب تو نے مجھے اٹھا لیا۔ منکم تم میں سے۔ امام ابو حنیفہؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ منکم کی قید
اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ احکام شرعیہ جو ہیں ان کے مخاطب مسلمان ہی ہیں غیر مسلم مخاطب
نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ مسلم غیر مسلم سب مخاطب ہیں یہ دو مجتہدوں کا اختلاف ہے
ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لائے وہ مخاطب نہیں ہیں اس
لئے کہ اگر وہ ان احکام پر عمل کریں گے۔ والذین کفروا اعمالھم کسراب (نور ۳۹) کافروں کے
اعمال مثل سراب کے ہیں اور اللہ کے حکم کے مطابق روزہ نماز وغیرہ اعمال کی جزا جنت اور
دائمی راحت ہے تو جب ان کے اعمال صالحہ کی جزا نہیں ہے تو پتہ چل گیا کہ غیر مسلم اعمال
صالحہ کے ساتھ مکلف ہی نہیں ہیں۔ اگر وہ مکلف ہوتے تو ان کے اعمال صالحہ کا ان کو بدلہ
ملتا۔ چونکہ بدلہ نہیں ملے گا اس لئے وہ اعمال صالحہ کے ساتھ مکلف نہیں ہیں۔ صرف
انسان پہلے ایمان کے ساتھ مکلف ہے۔ پھر جب وہ ایمان لے آئے تب وہ اعمال صالحہ

کے ساتھ مکلف ہے۔ جب تک یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس عمل کا بدلہ ملے گا تو کیا عمل کریگا
اور جب یہ معلوم ہو کہ کوئی بدلہ دینے والا ہے اس وقت تک کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ کیا ہے اور
کچھ فائدہ نہیں ہوگا جب تک توحید اور رسالت پر ایمان نہ ہو اس وقت تک کوئی عمل کافی
نہیں ہوگا اور جب کافی نہیں ہوگا تو اس کی تکلیف دینی بے سود اور عبث ہوگی پہلے کلمہ طیبہ
لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی تبلیغ ہوگی۔ جب اس پر ایمان لے آئے گا اور
عمل نہیں بھی کرے گا تب بھی یہ کافی ہوگا کیوں کہ ایمان لانے کے بعد اگر عمل نہیں کرے گا
یا خلاف کرے گا تب بھی ابدی عذاب سے بچ جائیگا۔ یا بالکل ہی بچ جائے کسی سفارش یا
صرف خدا کی رحمت سے تو سب سے مقدم لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے۔
ہر انسان اس کے ساتھ مکلف ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی معبود نہیں ہے اللہ کے
علاوہ۔ یہاں ایک ذرا سی ذنت ہے۔ اس کا ذکر کسی مجتہد عالم نہیں کیا۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر
فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کلمہ توحید ہے اور یہ
حق ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں تو یہاں ایک نہیں دو کلمے ہیں کلمہ توحید صرف لا الہ الا اللہ ہے
کوئی معبود نہیں ہے اللہ کے علاوہ اور محمد الرسول اللہ جو ہے یہ کلمہ توحید نہیں ہے بلکہ کلمہ رسالت
ہے کلمہ توحید اور کلمہ رسالت کو ملا کر اس کا نام کلمہ توحید رکھا تو اس کی وجہ اب تک معلوم نہیں
ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے اللہ کے علاوہ اور معبود مشتق ہے عبادت سے
تو معنی یہ ہوئے کہ کوئی شے اللہ کے علاوہ اس قابل نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے۔ اب
یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ عبادت کیا شے ہے۔ اس کے معنوں میں اختلاف ہے۔ اس کے معنی عظمت
اطاعت، انتہائے تذلل اور اللہ کی خوشنودی بتائے ہیں لیکن یہ تینوں میرے خیال میں
صحیح نہیں ہیں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میری تحقیق یہ ہے کہ عبادت کے معنی اپنے

آپ کو قربان کر دینے اور نثار کر دینے کے ہیں۔ تو اب معنی یہ ہوئے کہ کوئی ذات اس قابل نہیں ہے کہ انسان اس پر نثار ہو۔ سوائے ذات باری تعالیٰ کے تو اب آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ یہاں عبادت ہوتی ہے۔ جن کی بتوں کی شمس و قمر کی تو مان لیا کہ یہ گھٹیا چیزیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ اس پر نثار ہوا جائے۔ مگر محمد رسول اللہ تو ان سب سے بہت بڑھیا ہیں۔ آیا وہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر نثار ہو لیا جائے تو کہا کہ نہیں وہ بھی اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر نثار ہوا جائے۔ وہ بھی الہ بننے کے قابل نہیں وہ بھی اللہ کے رسول بننے کے قابل ہیں۔ تو جب سب سے بڑھیا شئے کی نفی ہو گئی تو اس سے گھٹیا جتنی اشیاء ہیں ان کی نفی خود بخود ہو گئی۔ تو محمد رسول دلیل ہے لا الہ الا اللہ کی اس لئے اس کے ساتھ چسپاں کیا ہے رسالت دراصل دلیل الوہیت ہے۔ رسول نہیں ہوگا تو اللہ کو جان نہیں سکے گا۔ تو ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ نماز ہے روزہ ہے اور جتنے بھی احکام شرعیہ ہیں یہ سب اہل ایمان کے لئے ہیں جو ایمان نہیں لائے وہ مکلف نہیں ہیں اور امام شافعی اور ان کے جو مقلدین ہیں ان کے نزدیک یہ ہے کہ یہ براہ راست خطاب ہے انسان کو اور ان کی دلیل یہ آیت ہے ماسلککم فی سقر (مدثر ۴۲-۴۶) جہنمیوں سے پوچھا جائیگا کہ تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا تو وہ کہیں گے لم نک من المصلین ہم نماز نہیں پڑھتے تھے لم نک نطعم المسکین ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ سب کے ساتھ فرج کیا کرتے تھے اور آگے انہوں نے چھوڑ دیا۔ وہاں ایمان آ گیا۔ وکنا نکذب بیوم الدین حتی اتٰنا الیقین اور ہم روز جزا کی تکذیب کرتے تھے۔ اب ہم نے روز جزا دیکھ کر یقین کر لیا کیسی عجیب بات ہے دین سے رو نکل آیا۔ تو ان تمام احکام سے اس وقت مکلف ہے جب مومن ہو اور جب مومن نہیں تو اس سے کوئی خطاب نہیں۔

ازواج جمع ہے زوج کی کبھی اس کے آخر میں ت آتی ہے جوہ کی آواز دیتی ہے
زوجۃ تو زوج اور زوجۃ دونوں استعمال ہوتے ہیں۔

یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّعَشۡرًا وہ روکے رکھیں
(بقرہ-۲۳۴-۲۳۵)
اپنے کو چار مہینہ دس دن یعنی ان کی عدت کی مدت ۴ ماہ دس دن ہے۔ اب یہاں ایک
بات ہے۔ یہاں عشر کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ دن کیلئے عشرہ آنا چاہیئے تھا۔ تو اس کی وجہ
یہ ہے کہ چونکہ ایام شروع رات سے ہوتے ہیں اس لئے عشر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو ترجمہ
یہ ہوا چار مہینہ دس رات۔ اصل جو ہے وہ لیل ہے دن جو ہے وہ بعد کی چیز ہے اس لئے عشر
کا لفظ بولا گیا۔ لیکن یہ حکم عدت کا جو ہے اس کی دو صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ یہ صورت اس وقت
ہے جب حاملہ نہ ہو۔ اور حمل کی صورت میں عدت وضع حمل ہے اور لونڈی اگر کسی سے نکاح
کرے اور اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کی عدت آدھی ہے۔ آزاد عورت کے
مقابلے میں۔ تو یہ دو صورتیں مستثنیٰ ہیں اس حکم سے۔ حاملہ اور لونڈی وضع حمل کی صورت
میں خواہ ایک گھنٹہ بعد ہو یا چھ ماہ بعد وضع حمل کے ساتھ ہی یہ عدت ختم ہو جائے گی۔
حضرت علیؓ نے یہ فرمایا کہ جو مدت لمبی ہو وہ اختیار کیا جائے۔ یعنی اگر ۴ ماہ دس دن سے پہلے
وضع حمل ہو تو مدت وہی رہے گی۔ اور اگر وضع حمل اس مدت کے بعد ہو تو مدت عدت وضع
حمل ہو گی۔ ان کے علاوہ باقی قوم کی یہ رائے ہے کہ وضع حمل جلدی ہو یا دیر میں ہر صورت
وضع حمل ہی مدت عدت ہے ان کی دلیل وہ حدیث ہے کہ ایک عورت نے بچہ جن لیا تھا۔ اور
وہ نکاح کیلئے تیار ہو گئی تو لوگوں نے کہا کہ تو چار مہینہ ۱۰ دن کی مدت پوری کر تو اس نے
کہا کہ نہیں میں نے رسول اللہ سے دریافت کر لیا ہے انہوں نے فرمایا کہ جب تو نے بچہ جن لیا
تو تیری عدت ختم ہو گئی۔

ایک مجتہد کا خیال ہے کہ لونڈی کی عدت بھی چار ماہ دس دن ہے آدھی نہیں ہے کیونکہ اربعہ اشھر وعشرا یہ آیت دلالت کر رہی ہے ۴ ماہ دس دن پر خواہ آزاد ہو خواہ لونڈی۔ ان کا نام ابو بکر اصم ہے انہوں نے ایک دلیل بیان کی جو وضع حمل ہے۔ یہ بدل ہے ۴ ماہ دس دن کا اور وضع حمل جو ہے وہ مشترک ہے آزاد اور لونڈی میں۔ تو عدت کی مدت اس کو مبدل کہتے ہیں وہ بھی مشترک ہوگا۔ یعنی لونڈی کے لئے بھی چار مہینے دس دن ہونے چاہئیں۔ تو فقہانے تو یہ جواب دیا ہے کہ ۴ ماہ دس دن تو آدھے ہو سکتے ہیں لیکن وضع حمل آدھا نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے بدل کے مشترک ہونے سے مبدل کا مشترک ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ دو چیزوں کا بدل ایک شے ہو اور وہ دونوں شے ایک دوسرے کے خلاف ہوں متحد نہ ہوں مثلاً تیمم بدل ہے وضو کا اور غسل کا۔ تو بدل کے ایک ہونے سے وضو اور غسل ایک نہیں ہوں گے۔ کہ صرف وضو سے غسل کا فائدہ ہو جائے اور فلسفیانہ طریقہ پر بھی بدل کے ایک ہونے سے مبدل کا ایک ہونا لازم نہیں آتا۔ جیسے دودھ ہے وہ بدل ہے کھانے کا اور پینے کا، پانی کا اور غذا کا یعنی کوئی بھی غذا کھائیں، پانی پینے کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایسی غذا ہے کہ پانی کا بھی کام کرے گی تو دونوں کا بدل ہو گیا۔ دودھ آپ سالوں پیتے رہیں پانی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مگر کھانا اور پانی دونوں الگ الگ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ حدیث شریف ہے کہ لونڈی کا آدھا ہے۔ لونڈی کی مدت آدھی ہے۔ تو جس طرح تم نے وضع حمل مشترک کر کے لونڈی کی مدت کو ۴ ماہ دس دن کر دیا۔ بالکل اسی طرح دو ماہ ۵ دن کا بدل قرار دیکر آزاد عورت کی مدت ۲ ماہ ۵ دن کیوں نہ کر دی۔ کیونکہ جس طرح یہ ۴ ماہ ۱۰ دن کا بدل ہے اسی طرح حدیث سے ثابت ہے کہ یہ ۲ ماہ ۵ دن کا بھی بدل ہے تو تم نے الٹا کیوں نہیں کر دیا۔ یہ تین دلیلیں ہیں

نے اپنی طرف سے بیان کر دیں۔ اصل میں ہمارے پاس کوئی کتاب تو ہے نہیں اور یہ جزوی مسائل ہیں عقل سے تو سمجھ میں آتے نہیں تو جو بات خیال میں آجاتی ہے بیان کر دیتا ہوں اللہ پاک غلط بیانی کو معاف کرنیوالا ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں اور برابر اس سے مدد مانگتا ہوں بہت کافی بیان کر دیا تفسیروں میں آپ کو اتنا نہیں ملے گا۔

اب آپ اپنے آپ کو روکے رکھیں کاہے سے نکاح کرنے سے۔ بیوہ عورتوں کو چاہیئے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے نکاح نہ کریں۔ اور بلا ضرورت باہر نہ نکلیں۔ یعنی جان کا خوف ہو، عزت کا خوف ہو یا ایسی ہی ناگزیر بات جب تک نہ ہو نہ نکلیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ زینت جیسے خوشبو لگانا یا گہنا پہننا وغیرہ نہ کریں۔ تو ان دو باتوں پر اجماع ہے کہ بلا ضرورت باہر نہ نکلیں، اور تیسری چیز کے بارے میں حدیث شریف ہے کہ۔ لاتحد المرأة فوق ثلاث الاعلی زوج فانها تحد علیه اربعة اشهر وعشرًا ولا تلبس ثوبا مصبوغًا الاثوب عصب ولا تکتحل ولا تمس طیبا الا ادنی طهرتها اذا طهرت من محیضها بنبذة من قسط و اظفار۔ (عن ام عطیہ۔ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ المصابیح باب العدۃ)

عورتیں کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ کریں۔ سوائے اپنے شوہروں کے اس کی مدت چار ماہ دس دن ہے تو اب زینت جو ہے وہ سوگ کی ضد ہے۔ لہٰذا زینت عدت کے دوران نہ کرنی چاہیئے۔ تو یہ تین باتیں عدت میں واجب ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے استاد بہت بڑے عالم ہیں۔ تابعی وہ فرماتے ہیں زینت نہ کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث شریف میں تحل کا لفظ ہے۔ حلال نہیں ہے یعنی سوگ حلال ہے۔ تو کسی شے کا حلال ہونا اس کا واجب ہونا نہیں ہے۔ جس طرح گوشت کھانا حلال ہے واجب نہیں ہے کہ آپ گوشت نہ کھائیں گناہ ہو۔ جس طرح نماز نہ پڑھیں تو گناہ ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ کے استاد تابعی کا قول ہے

فاذا بلغن اجلهن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسهن بالمعروف ؕ

جب وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ جو عورتیں اپنے نفسوں کے بارے میں معروف طریقہ پر کریں۔ معروف منکر کی نقیض ہے۔ منکر اس چیز کو کہتے ہیں جو بری ہو۔ تو معروف اس چیز کو کہیں گے جو اچھی ہو۔ اب اچھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقلاً اچھی ہو اور ایک شرعاً اچھی ہو۔ تو عام رائے یہ ہے کہ جو عقلاً اچھی ہو مگر میری رائے میں شرعاً اچھی چیز ہو۔ وہ کر سکتی ہے تو نکاح شرعاً اچھی چیز ہے لہٰذا وہ نکاح کر سکتی ہے لیکن اس آیت سے اگر آپ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سوگ واجب ہے۔ جب وہ عدت پوری کر چکیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ ان معاملات میں جو وہ اپنے نفسوں کے بارہ میں کریں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ منفرد ہیں اس فعل کے ساتھ اور نکاح جو ہے اس میں وہ منفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک آدمی اور یعنی شوہر اور ہونا چاہیئے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں مراد محض نکاح نہیں ہے۔ بلکہ زینت وغیرہ ہے۔ اور اگر تم ان کو زینت وغیرہ کرتے ہوئے دیکھو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کب جب وہ عدت گذر جانے کے بعد ایسا کریں تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ یعنی اگر عدت گذرنے سے پہلے کریں تو گناہ ہے تو جب زینت گناہ ہو گئی تو سوگ واجب ہو گیا۔ بہت اچھی بات ہے

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا فلا جناح علیکم۔ علیکم یعنی اے مومنین اے حکام۔ علیکم میں سب آ گئے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بمعروف کے معنی میں نے آپ کو بتائے شرع کے مطابق اور نکاح جو ہے وہ شرع کے مطابق ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اپنے آپ وہ نکاح کر سکتی ہیں۔ تو اب ولی کی ضرورت نہ رہی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہے۔ اسے یاد رکھیئے۔ رائے امام ابو حنیفہؒ ہی کی صحیح ہے یہ بڑی اہم چیز ہے۔ دنیا کے نظام کا دارومدار اس پر ہے۔ اس لئے بڑی تحدید کی گئی ہے۔ واللہ بما تعملون خبیر۔

اللہ تمہارے اعمال سے واقف ہے۔ یہ تخفیفاً جمالی کہلاتی ہے۔ سخت ڈانٹ ہے خبردار اس کے خلاف نہ کرنا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِىٓ أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّآ أَن تَقُولُوا۟ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ط

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم تعریض کرو اور ان کے ساتھ خطبہ کے معنی منگنی ایک تو منگنی ہوتی ہے اور ایک بات ڈالی جاتی ہے۔ تعریض جو ہے تصریح کے مقابلہ کی چیز ہے یعنی ایک تو یہ ہے کہ آپ تصریحاً یہ کہہ دیں کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایک یہ کہ ایسی بات کہے جو اس مضمون پر دلالت کرے کہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور دوسرے مضمون پر بھی دلالت کرے، مقصود اور غیر مقصود دونوں کی طرف دلالت کرے اور مقصود کی طرف زیادہ رجحان ہو جیسے کوئی شخص سیٹھ صاحب کے پاس آئے اور جب ان سے پوچھا جائے کہ کیسے آنا ہوا تو کہے کہ میں نے سوچا کہ چلوں ذرا سیٹھ صاحب کو سلام کر آؤں۔ زیارت کر آؤں۔ تو حالانکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں سلام کو آیا ہوں۔ لیکن مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ کچھ طلب کرنے کیلئے آیا ہے۔ یہ تعریض ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں بھوکا ہوں کچھ دیدو تو یہ تصریح ہوگئی۔ اور کنایہ کہتے ہیں کسی شے کے لازمہ کو بیان کرنا۔ جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کے ہاں کبھی چولہا بجھتا ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتنے یہاں آتے ہیں کہ ہر وقت کھانا پکتا رہتا ہے۔ یہ کنایہ ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عدت کے دوران تم ان سے بالتصریح منگنی نہیں کر سکتے تو منگنی کی کئی صورتیں ہیں۔ انہیں آپ سمجھ لیں۔ ایک تو صورت یہ ہے کہ عورت عدت اور شوہر دونوں سے

خالی ہے۔ تو ایسی عورت سے تو تصریحاً منگنی کر سکتا ہے بلکہ نکاح کر سکتا ہے۔ خواہ وہ عورت کنواری ہو۔ مطلقہ ہو یا بیوہ ہو۔ اور ایک صورت اس میں یہ ہے کہ منگنی نہیں کر سکتا یعنی کسی کی منگنی اس پر گئی ہو تو منگنی پر منگنی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کی منگنی ٹھہر گئی اس پر بات توڑنے کے لئے اپنی منگنی بھیجنا یہ حرام ہے۔ تو ایک صورت تو یہ ہے کہ منگنی منظور کر لی۔ ایک صورت یہ ہے کہ منگنی کا انکار کر دیا۔ جہاں منگنی کا انکار کر دیا وہاں منگنی دوسرا آدمی بھیج سکتا ہے۔ تیسری صورت تو یہ ہے کہ خاموش ہو گئی۔ ایسی صورت میں دو گروہ ہیں ایک کی رائے تو یہ ہے کہ خاموشی ناراضی ہونے کی دلیل ہے تو منگنی بھیج سکتا ہے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے جس طرح وہ ناراض ہونے کی دلیل نہیں ہے اسی طرح وہ راضی ہونے کی دلیل بھی نہیں ہے تو منگنی نہیں بھیج سکتا۔ میں کہتا ہوں کنواری لڑکی کے پاس دو گواہ جاتے ہیں شادی کے وقت پوچھنے کے لئے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ تو اس کی خاموشی پر نکاح ہو جاتا ہے تو جب نکاح خاموشی پر ہو سکتا ہے تو منگنی بھی خاموشی پر ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ تو ایک عورت تو یہ ہے کہ عدت اور شوہر دونوں سے باہر ہے۔ اس سے تعریضاً اور تصریحاً دونوں طرح منگنی کر سکتا ہے اور ایک عورت وہ ہے جس سے نہ تعریضاً نہ تصریحاً کسی طرح بھی منگنی نہیں کر سکتا۔ دونوں حرام ہیں یعنی جس کا شوہر زندہ ہو۔ کیونکہ وہاں سارا نظام بگڑ جائے گا۔ اب ایک عورت عدت میں ہے۔ اس سے تعریض کر سکتا ہے یعنی اشارۃً کہہ سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہے کہ فلاں فلاں لوگ تو آپ کی برائی کرتے ہیں مگر میری نظر میں تو آپ سے اچھی عورت نہیں گذری۔ یا کہ میرا گھر مدت سے اجڑا ہوا ہے۔ اگر کوئی اچھی عورت مل جائے تو میرا ارادہ ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ تو فرمایا ایسی تعریض کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

یا تم اپنے دل میں چھپائے رکھو کہ جب عدت گذر جائے تو ہم اس عورت سے نکاح کرلیں گے۔ اس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کیوں کہ اللہ پاک جانتا ہے کہ عنقریب تم اس سے نکاح کروگے۔ اس لئے اگر تم دل میں اس کا خیال کرلوگے اور ظاہر نہ کرو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بڑا کرم ہے اس کا وہ تو بڑا غفور اور حلیم ہے لیکن ان سے کوئی پرائیویٹ وعدہ وعید نہ کرو۔ یہ ذرا باریک بات ہے پوشیدہ وعدہ نہ کرو۔ یا کسی پوشیدہ چیز کا وعدہ نہ کرو۔ یعنی یہ کہ چپ چپاتے ان سے وعدہ کرلو کہ میں تم سے نکاح کرلوں گا یا اس فعل کا وعدہ کرو۔ اس کا ذکر تک نہ کرو اس کے سامنے البتہ جو شرعاً درست ہے۔ معروف بات ان سے کرسکتے ہو کہ میں گوشت ترکاری لادیا کروں گا۔ بچہ اگر ہے تو اس کا دودھ میں لادیا کروں گا یا روپیہ پیسہ کی ضرورت ہو تو پریشان نہ ہونا میں دے دیا کروں گا۔ اس قسم کی بات کہہ سکتے ہو۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ؒ

کتنی احتیاط ہے ولا تعزموا عقدۃ النکاح جب تک عدت کی مدت نہ گذر جائے نکاح کا قصد نہ کرو۔

واعلموا ان اللہ یعلم ما فی انفسکم فاحذروہ
خوب جانتا ہے جو تمہارے دل میں ہے۔ ڈرو اس سے ظاہر عمل کی بھی ممانعت اور برے خیال کی بھی ممانعت۔ واعلموا ان اللہ غفور حلیم۔

اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا حلیم ہے۔

حلیم اس کو کہتے ہیں۔ جو غلطی پر فوراً سزا نہ دے۔ دیر میں سزا دے۔ یہ بھی اس کی عنایت ہے تاکہ وقت مل جائے اور توبہ کرے تو گناہ معاف ہو جائے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ ۝
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (بقرہ۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳)

میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور میرا شکر کرو اور ناشکری مت کرو.

اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ سے امداد طلب کرو اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

یہاں فرمایا کہ تم میرا ذکر نہیں کرسکتے جب تک تم نماز اور صبر سے مدد نہ لو اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ غیر اللہ سے مدد طلب کرنا جائز ہے کیونکہ صبر و نماز اللہ نہیں ہیں غیر اللہ ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ مدد تو اللہ ہی سے طلب کی جاسکتی ہے کیونکہ غیر اللہ میں تو مدد کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہے۔ غیر اللہ تو خود محتاج ہے۔ وہ دوسروں کی کیا مدد کرے گا۔ اس آیت کی ترکیب وہی ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں۔ قینچی سے کپڑا کاٹ لو۔ تو کاٹنے والا کوئی اور ہے۔ قینچی تو صرف آلہ ہے ذریعہ ہے۔ جس کی مدد سے کاٹنے کا کام ہوتا ہے۔

اسی طرح صبر اور نماز آلہ ہیں اور ذریعہ ہیں۔ مدد کرنے والا اللہ ہے۔ امداد طلب کرو۔ کس سے طلب کرو اللہ سے طلب کرو۔ کس طرح مانگو۔ صبر و نماز کے ساتھ۔ استعینوا کے بعد 'باللہ' محذوف ہے۔ آیت یوں ہے۔ استعینوا باللہ بالصبر والصلوٰۃ۔ بات صاف ہوگئی۔

اب یہ بات سمجھ لیں کہ امداد اللہ ہی کرسکتا ہے۔ غیر اللہ نہیں کرسکتا۔ مدد وہی کرسکتا ہے جو خود مدد سے مستغنی ہو۔ مدد کی تین شرطیں ہیں۔

مدد کی پہلی شرط یہ ہے کہ مدد کرنے والے کو محتاج کی حاجت کا صحیح علم ہو۔ اگر علم نہ ہو تو محتاج کی مدد نہیں کرسکتا۔ مثال اگر مجھے علم نہ ہو کہ آپ بھوکے ہیں تو میں آپ کو کیا کھانا کھلاؤں گا۔

دوسری شرط ہے کہ حاجت کو پورا کرنے کی قدرت ہو۔ اگر مجھے علم ہو گیا کہ آپ بھوکے ہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک کوڑی بھی نہیں نکلی تو میں آپ کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔

تیسری شرط ہے رحمت۔

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں حاجت کا علم بھی ہو گیا۔ جیب میں پیسہ بھی ہے۔ مگر مدد نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمارا دل نہیں چاہتا۔ تو ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو حاجت کو پورا کرنے کی طرف لے آئے۔ اس قوت کا نام ہے رحمت، رافت ترس۔

جس میں یہ تینوں شرطیں جمع ہوں گی علم، قدرت اور رحمت وہ مدد کرسکتا ہے۔ دوسرا نہیں کرسکتا۔ یہ تینوں صرف اللہ تعالیٰ میں جمع ہیں اور کسی میں نہیں۔ جو غیر اللہ سے مدد طلب کرے وہ درحقیقت شرک کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی مدد کرسکتا ہے۔ اسکو پورا علم ہے پوری قدرت ہے اور پوری رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ سے مدد طلب کرو اور طلب کرنے کا طریقہ اور ذریعہ یہ بتایا کہ نماز اور صبر کے ذریعہ طلب کرو۔

بزرگان دین کا معمول رہا ہے کہ جب ان کو پریشانی لاحق ہوئی تو فوراً نماز کے لئے دوڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی پریشانی رفع فرمادیا کرتا تھا۔ حضور اکرمؐ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ آپؐ ایسے وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ صبر بہت بڑی چیز ہے۔ ایک موقع پر حضورؐ نے صبر کو نصف ایمان بتایا اور ایک اور موقع پر لفظ ایمان سے تعبیر کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بقیہ بدن سے ہے۔ اگر سر نہ ہو تو بدن بے کار ہے۔ اسی طرح اگر صبر نہ ہو تو ایمان بے کار ہے حضرت عیسےٰؑ کا قول ہے۔ جب تک نامرادی پر صبر نہیں کرے گا۔ مراد کو نہیں پہنچے گا۔ حضرت

داؤدؑ کو وحی ہوئی کہ اے داؤد میرے اخلاق کی پیروی کر اور میرے اخلاق میں سے ایک یہ ہے کہ میں صبور ہوں۔ سلطان الانبیاءؐ نے چند انصار سے دریافت کیا کیا تم مومن ہو؟ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں ہم مومن ہیں۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا تمہارے ایمان کی کیا دلیل ہے۔ انصار نے جواب دیا کہ ہم نعمت پر شکر کرتے ہیں۔ اور مصیبت پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم" تم مومن ہو"

صبر کی فضیلت پر اسی طرح کثرت سے احادیث آئی ہیں۔ اور قرآن شریف میں ستر یا اس سے زیادہ جگہ صبر کی تعریف آئی ہے۔ قرآن شریف میں کسی چیز کے لیے بے حساب اجر کا ذکر نہیں ہے سوائے صبر کے۔ انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا۔ (زمر ۱۰) آگے فرمایا:۔ وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم و رحمۃ اولئک ھم المھتدون۔

صابروں پر ہدایت اور درود ہے رحمت ہے۔ صبر ایسی بڑھیا فضیلت ہے کہ اللہ پاک نے رحمت، درود اور ہدایت کو موقوف کر دیا صبر پر۔ پھر فرمایا۔

ان اللہ مع الصابرین۔ (بقرہ ۱۵۳)

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ شہوت اور غضب کا وہ خود مقابلہ کر لیتا ہے۔ نہیں انسان خود مصائب و معاصی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ میں وہاں اس کی مدد کے لئے موجود ہوتا ہوں۔ اس لئے وہ مقابلہ کر لیتا ہے۔ یہ جملہ اسی قسم کا ہے کہ کوئی کہے کہ میں نے فلاں زبردست معرکہ سر کر لیا اور ایک شخص جابر کہے کہ جا جا تیری کیا جان تھی جو تو اس کا مقابلہ کر لیتا۔ وہ تو میں قسمت سے وہاں آ گیا تو مجھے دیکھ کر تیرا حریف دب گیا۔ ورنہ تو مار کھاتا۔ یہ بات میرے خیال میں آئی کہ میرے

آپ کو بتا دی۔

ہمارے یہاں کے ائمہ اور علماء نے صبر کی یہ تعریف کی ہے کہ جب باعث دینی اور باعث دنیوی یا باعث شیطانی کا مقابلہ ہو تو باعث دینی ہٹنے نہ پائے بلکہ جما رہے ڈٹا رہے۔ ثابت قدم رہے۔ اس ثبات کا نام ہے 'صبر' اور باعث شیطانی کو دھکیل دینے کا نام 'ظفر' ہے۔ اس پر حاوی ہو گیا اور کامیاب ہو گیا تو اس کا نام ظفر ہے۔ اور ڈٹا رہا تو ڈٹے رہنے کا نام صبر ہے۔

میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے وہ میں بیان کرتا ہوں۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ انسان دراصل چیز کیا ہے۔ عام طور پر اس جثہ کو انسان سمجھا جاتا ہے مگر یہ انسان نہیں ہے۔ یہ مٹ جاتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔ مگر انسان باقی رہتا ہے۔ جوں کا توں۔ یا ایک جوان آدمی ہے۔ اس کی ماں زندہ ہے تو اس کو "میرا بچہ" ہی کہہ کر پکارے گی۔ حالانکہ اس کا جثہ بچہ کے جثے سے بالکل مختلف ہے۔ مگر اس جثہ سے الگ کوئی اور شے ہے جو اس میں اور اس بچہ میں مشترک ہے۔ وہی شے دراصل انسان ہے۔ کسی قسم کا مسئلہ ہو اس کے حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے جب دو چیزوں کا مقابلہ ہو تو ہر ہر جز کی تحلیل کیجئے پھر مشترک اجزاء کو نکالتے جائیے مثلاً انسان شے ہے اور بھی بہت چیزیں ہیں جو شے ہیں۔ لہذا شے انسان نہیں ہے۔ موجود انسان کے علاوہ اور بھی بہت اشیاء ہیں۔ آسمان زمین چاند سورج تارے سب موجودات ہے لہٰذا موجود بھی انسان نہیں ہے۔ اسی طرح اور چیزوں کو لیتے جائیے ہر چیز مشترک ملے گی۔ لہذا ان میں سے کوئی بھی انسان نہیں ہے۔ انسان وہ شے ہوگی جو انسان میں ہو۔ اور انسان کے علاوہ کسی میں نہ ہو۔ جسم مشترک ہے تمام حیوانات نباتات اور جمادات میں۔ نمو کسی ایک جانب بڑھنے کو نہیں کہتے۔ یہ بیماری ہے ہر سہ جہات میں بڑھنے کو نمو کہتے ہیں۔ نمو مشترک ہے نباتات و حیوانات میں حس و حرکت بھی کثیر اشیاء

میں موجود ہے۔ یہ انسان نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر یہ انسان ہو گی تو سارے جانور انسان ہو جائیں گے۔

عقل بھی انسان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی ملائکہ میں مشترک ہے۔ عقل صرف ذریعہ ہے کمال حاصل کرنے کا۔ اس کے علاوہ غور کریں آپریشن سے قبل عقل کو زائل کر دیا جاتا ہے۔ یعنی انسان کی حفاظت کے لئے اس کو نثار کر دیا جاتا ہے۔ جو شے انسانیت پر نثار کر دی جانے وہ انسان نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ گھٹیا شے بڑھیا شے پر نثار کی جاتی ہے تو معلوم ہوا کہ انسانیت عقل سے اعلیٰ کوئی اور شے ہے عقل و شعور انسان نہیں ہے۔

نفس روحانیت بھی مشترک ہے۔ تمام ذی روح مخلوق میں لہذا روح بھی انسان نہیں ہے۔

صرف ایک ہی شے ہے جو صرف انسان میں ہے اور کسی مخلوق میں نہیں ہے۔ کائنات میں کسی شے میں نہیں ہے۔ اس کا نام ہے "اختیار"۔ اختیار کے معنی یہ ہیں کہ صاحب اختیار کو فعل کرنے اور فعل کو ترک کرنے پر نسبت برابر ہو۔ جس طرح وہ فعل کے کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ فعل کے نہ کرنے پر قادر ہو۔ وہ چاہے فعل کرے چاہے نہ کرے۔ یہی اختیار ہے جو انسانیت کا مصداق ہے یہی اختیار مخاطب رب العالمین ہے۔ اگر یہ اختیار کسی طرح زائل ہو جائے فنا ہو جائے تو خطاب ربانی اور خطاب انسانی دونوں ختم ہو جائیں گے۔ اگر کوئی قاتل مر جائے یا ایسا مضمحل ہو جائے کہ کسی قابل نہ رہے، اس پر کوئی عقاب یا عتاب نہیں ہو گا۔ ذرا سی بیماری اور سفر کی وجہ سے نماز روزہ میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اختیار ہی مرتا ہے۔ اور فنا ہوتا ہے۔ باقی اجزاء جوں کے توں باقی رہتے ہیں۔ جسم اس جہاں میں اور روح اس جہان میں برزخ میں موجود رہتی ہے۔ اختیار نہ یہاں باقی رہتا ہے نہ وہاں اپنے اختیار سے، نہ کچھ حاصل

ہر سکتا ہے۔ نہ کوئی عمل کر سکتا ہے۔ اختیار شروع ہونے سے پہلے یعنی بچہ مخاطب ربّ العالمین نہیں ہے۔ کیونکہ بچہ اگر کسی کو قتل کر دے تو اس کو اس دنیا میں بھی پھانسی نہیں ہوگی۔ جب اختیار ثابت ہو جائے گا تو جرم بھی ثابت ہو جائے گا۔ گولی ماری ہرن کے اتفاق سے لگ گئی آدمی کے تو پھانسی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے اختیار سے نہیں مارا۔ غیر اختیاری طور پر گولی لگ گئی۔ یہی صورت شریعت میں ہے۔

اختیار اور شے ہے جس کو فعل کرنے اور نہ کرنے کی طرف نسبت برابر ہو۔ اگر نسبت دونوں طرف برابر نہیں ہوگی۔ یکطرفہ ہوگی تو اسی کا نام جبر ہے۔ یعنی اگر علاقہ صرف سکون سے ہوگا یا صرف حرکت سے ہوگا تو یہ جبر ہے اور اگر علاقہ حرکت اور سکون دونوں سے ہے اور قدرت دونوں پر برابر ہے تو اس کا نام اختیار ہے۔ رعشہ والے کو علاقہ صرف حرکت سے ہوتا ہے وہ سکون پر قادر نہیں ہے۔ مردہ کو علاقہ صرف سکون سے ہے۔ وہ حرکت پر قادر نہیں ہے دونوں صورت میں جبر ہے۔ جبری شے ذات کو لازم ہوتی ہے۔ اختیاری شے ذات کو لازم نہیں ہے۔ وہ کبھی ہوگی کبھی نہیں ہوگی۔

جب نسبت فعل و ترک فعل دونوں کی طرف برابر ہے تو فعل کرنے کے لئے جب تک کوئی داعی سبب وجہ علت نہ ہوگی فعل صادر نہیں ہوگا۔ بھوک کھانا کھانے کا سبب ہے۔ پیاس پانی پینے کی علت ہے۔ جانوروں میں جو دواعی ہیں وہ انسانیت سے باہر ہیں۔ انسانیت سے نیچے کے جو مدارج ہیں "حیوانیت" ان میں ہی ہیں۔ وہ مادی خصلتیں ہیں یہ ان کو فعل کی طرف لاتی ہیں۔ اور مقابلہ پر کوئی ایسی شے نہیں ہے جو متصادم ہو اور اس فعل سے روکے۔ یعنی جب خواہش اس کو اس فعل کی طرف لاتی ہے تو وہ فوراً اس میں لگ جاتا ہے اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کو اس فعل سے روکے۔

اسی طرح ملائکہ ہیں کہ وہ خدا سے محبت کرنے اور اس کی عظمت کرنے پہ

مجبور ہیں اور وہاں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ان کو خدا کی عظمت اور تحلیل کرنے سے روکے۔ اس لئے صبر نہ ملائکہ میں ہوتا ہے نہ جانوروں میں۔ صبر وہاں ہوگا جہاں دو قوتیں ہوں اور دونوں میں مقابلہ ہو اور ایک کے مقابلہ میں دوسری قوت ڈٹی رہے۔

اختیار میں دو قوتیں ہیں ایک قوت حیوانی ہے جو فعل کے کرنے کی طرف لاتی ہے دوسری قوت اس کے مقابلہ پر ہے جو اس کو فعل کے نہ کرنے کی طرف لاتی ہے وہ قوت الٰہی ہے۔ قوت ملکی ہے یا خدا کی تائید ہے۔ بعض لوگ اس کا نام عقل بھی رکھ دیتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک وہ عقل نہیں ہے امر الٰہی ہے۔ اور کوئی شے نہیں ہے۔

دو قوتیں ہوگئیں انسان سے نیچے کی حیوانی طاقتیں جو ہیں وہ انسان کو فعل کرنے کی طرف لاتی ہیں اس کو فعل پر مجبور کرتی ہیں۔ امر الٰہی اسکو اس مجبوری سے روکتا ہے کہ ایسا فعل نہ کر۔ نفس یہ چاہتا ہے کہ کھیلیں کودیں۔ نماز نہ پڑھیں روزہ نہ رکھیں۔ نفس شہوت اور غضب کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقابلہ پر امر الٰہی اس کو روکتا ہے کہ یہ فعل نہ کر تو اب اگر امر الٰہی ثابت رہا مقابلہ پر ڈٹا رہا نفس کی خواہش سے نہ دبا تو اس ثبات کا نام صبر ہے۔ ورنہ وہ عمل شیطانی ہے۔

تو صبر کیا شے ہے؟ انسان کو انسان کے اختیار سے نیچے کی جتنی چیزیں ہیں وہ انسان کو فعل یا ترک فعل پر مجبور نہ کریں بلکہ اس کے فعل کا داعی امر الٰہی ہو۔ اور انسان اس پر ثابت قدم رہے۔ اس کا نام صبر ہے۔ یہ تمام عبادات اور مصائب کو شامل ہے۔ یعنی اگر کسی سے کسی کو تکلیف پہنچی تو نفس چاہتا ہے کہ اس سے بدلہ لو اور امر الٰہی کہتا ہے کہ اس کو معاف کر دو۔ تو اب اس نے بدلہ نہ لیا یہ صبر ہے اور معاف کر دیا راضی خوشی۔ تو اس کا نام شکر ہے۔

یہاں ایک باریک نکتہ ہے۔ اسے بھی سمجھ لیں۔

دونوں جانبوں میں جو مقابلہ ہوگا تو ایک جانب راجح ہے اور ایک مرجوح

یعنی ایک کو فوقیت ہے اور ایک کو نزکیت۔ تو مرجوح فعل کو نہ کرنا تو صبر ہے۔ اور
راجح فعل کو کرنا شکر ہے کہ جتنی توفیق تونے عنایت کی تھیں ان سب کو تیری مرضی یعنی
امر الٰہی پر نثار کر دیا اور اسی پر قائم رہا۔ بس اسی نثار کر دینے ہی کا نام شکر ہے۔
یعنی فعل اور ترک دونوں پر اختیار برابر ہے۔ اور ترجیح ہوئی فعل کو اور مرجح ہوا امر الٰہی
اور غیر اللہ یعنی شہوت اور غضب کے فعل کو مرجوح کر دیا نیچا کر دیا تو یہ نیچا کرنے کا نام
صبر ہے۔ اور اس کے بعد راجح فعل کو اختیار کر لیا۔ یہ شکر ہے۔

پھر فرمایا کہ صلوٰۃ و نماز کو ذریعہ بناؤ۔ نماز میں بھی صبر موجود ہے۔ جب صبر
صحیح ہو جائے گا نماز بھی صحیح ہو جائے گی۔ نماز میں جتنے اعضا ہیں سب یکسو ہو جاتے
ہیں۔ نہ دیکھ سکتا ہے۔ نہ بول سکتا ہے۔ نہ پلٹ سکتا ہے نہ کھا سکتا ہے نہ پی سکتا
ہے جتنے مادی افعال ہیں سب کو چھوڑ دینا ہے۔ نماز کو بھی سمجھ لیں۔ نماز کیا ہے۔

(۱) پہلے کانوں تک ہاتھ اٹھائے یہ کنایہ ہے اس بات کا کہ میں نے تمام مادی
علائق سے ہاتھ اٹھا لیا۔ بے تعلق ہو گیا۔ جب دونوں ہاتھ اٹھا لئے تو گویا دنیا اور
عقبیٰ دونوں سے بے نیاز ہو گیا۔ دونوں کی طرف سے بے اعتنائی ہو گئی۔ کیوں؟ اس لئے
کہ "اللہ اکبر" اللہ سب سے بڑا ہے۔ جب میں بڑے کی طرف متوجہ ہو گیا تو چھوٹی چھوٹی
تمام چیزوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بے اعتنا ہو گیا۔ مثال یہاں بھی آپ دیکھیں کہ جب
کوئی دشمن کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو وہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور کسی بڑے کی
پناہ لے لیتا ہے۔ وہ بڑا آدمی اطمینان دلاتا ہے کہ تم مطمئن رہو۔ اب اس کی کیا مجال
ہے جو تم کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ اسی طرح جب نماز میں کھڑا ہوا اللہ کی بارگاہ میں
پہنچ گیا۔ اس کی محفل میں شامل ہو گیا تو اس کو اللہ تعالےٰ کی استعانت حاصل ہو گئی
اب کوئی غیر اللہ کوئی شیطان اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(۲) جب اس کے دربار میں حاضر ہوا اس کی تجلی ہوئی تو اس کو برداشت نہ کر

فوراً جھک گیا۔ یہ رکوع ہوگیا۔ تو پہلی منزل میں شہوانی اور ہلاکت کے گڑھے سے نکل گیا جب رکوع کی حالت میں آگیا تو غضب کی ہلاکت کا دورہ تھا اس سے نکل گیا۔ کبر وغرور ختم ہوگیا۔ اب وہ حمد کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ مگر پھر برداشت نہیں ہوتا۔ اب رکوع سے اطمینان نہیں ہوتا بلکہ یکدم گر پڑتا ہے اور سجدہ میں چلا جاتا ہے۔ اب وہ ہوا کی گھاٹی سے بھی نکل گیا۔ یہ تین ہی مہلک گھاٹیاں تھیں تینوں سے نکل گیا۔ جب ہلاکت کے تمام دوروں کو عبور کر گیا تو اب سعادت ہی سعادت ہے۔ اطمینان ہے راحت ہے۔ چنانچہ بیٹھنے کی اجازت مل گئی یہ قعدہ ہوگیا۔ اس کی محفل میں جگہ مل گئی تو اس نے بٹھانے والے کی تعریف شروع کر دی۔ التحیات للہ والصلوٰۃ والطیبات

اب یہاں تو یہ صورت ہوئی کہ اسکی روح اس محفل میں پہنچ گئی اور اس کا عروج ہوا ادھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا نزول ہوا تو اس نے کہا السلام علیك ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جواب ملا السلام علینا وعلی عباداللہ الصالحین۔

فرشتوں کو تعجب ہوا اور اس سے دریافت کیا کہ تو اس عروج کو کیسے پہنچا تو اس نے کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اس نبی کی برکت سے تو یہاں تک پہنچ گیا اس کی خدمت میں تو نے کیا تحفہ پیش کیا اس نے دونوں درود پڑھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا درود اس لئے پڑھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دعا سے پیدا ہونے تھے۔ جب اس کو یہ عروج حاصل ہوا تو ملائکہ جوق در جوق اس کی زیارت کو آنے لگے کہ ایسا انسان جس کو یہ عروج حاصل ہوا ہے۔ اس کی زیارت کرنی چاہیئے۔ جب اس نے ملائکہ کا ہجوم دیکھا تو کہا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

تو یہ نماز ایسی استعانت والی شے ہے۔
اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ۔ (عنکبوت۔ ۴۵) نماز تمام منکرات اور فواحشات سے بچاتی ہے۔ جب گندی اور مضر چیزوں سے روک دیا تو اب پاک صاف اور مفید چیزیں ہی رہ گئیں۔

دوسری جگہ فرمایا۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (مؤمنون۔ ۱) مومن کامیاب ہو گئے۔ غور کریں کون سے مومن کامیاب ہو گئے۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خٰشِعُوْنَ۔ (مومنون۔ ۲) جو مومن اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اور عاجزی کرتے ہیں۔ تو کامیابی کی علت خشوع وخضوعِ صلوٰۃ ہوئی۔

مقید پر جب کوئی حکم لگایا جائے گا۔ تو قید جو ہے وہ اس حکم کی علت ہوگی۔ جیسے طبیب کہے کہ ٹھنڈا پانی مضر ہے۔ تو مضرت کی علت ٹھنڈک ہوگی۔ اسی طرح یہاں خشوع اور خضوع علت ہے کامیابی کی۔ آگے فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (مومنون۔ ۳) یعنی جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ لغو اس فعل کو کہتے ہیں جس سے نہ کوئی فائدہ ہو نہ نقصان ہو جس فعل کے کرنے میں نقصان ہو وہ مضر کہلاتا ہے۔ تو جو شخص لغو فعل نہیں کرے گا وہ مضر فعل ہرگز نہیں کرے گا۔ تو جب مضر بھی نکل گیا لغو بھی نکل گیا۔ تو اب کیا رہ گیا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ نماز بہت بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو اور مجھ کو دونوں کو توفیق عطا فرمائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کو ایک مرتبہ نصف ایمان فرمایا ایک اور موقع پر ایمان فرمایا۔ اور ایک جگہ یہ فرمایا کہ یہ جنت کے خزانوں میں ایک خزانہ ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب پر رحم فرمائے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ
اَوْ تَفْرِضُوْا لَھُنَّ فَرِیْضَۃً ج صلے وَّ مَتِّعُوْھُنَّ ج عَلَی الْمُوْسِعِ
قَدَرُہٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ ج مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ج حَقًّا
عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (بقرہ-۲۳۶)

کچھ حرج نہیں ہے تم پر اگر تم عورتوں کو طلاق دو بشرطیکہ تم نے چھوا نہ ہو یہ حرج اس وقت تک نہیں ہے جب تک تم ان کے لئے مہر مقرر نہ کر دو۔ اور تم ان کو متاع دو۔ امیر پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے اور مسکین پر اس کی استطاعت کے مطابق اور یہ متاع کیسا ہے وہ معروف اور شرع کے مطابق ہو اور یہ کیسا متاع ہے کہ حق ہے ان لوگوں پر جو احسان کرتے ہیں۔ مطلقہ کی چار قسمیں ہیں ایک وہ مطلقہ ہے جس کا مہر مقرر ہو گیا اور پھر میاں بیوی کا علاقہ ہوا اور علاقہ کے بعد طلاق دی۔ تو ایسی مطلقہ کو پورا مہر دیا جائے گا اور تمام سامان بھی جو وہ ماں باپ کے یہاں سے ساتھ لائی ہے یا شوہر کی طرف سے اسے دیا گیا ہے۔ اور اس کی عدت ۳ حیض ہے جو گذشتہ آیات میں گذر چکی۔ دوسری قسم مطلقہ کی وہ ہے۔ کہ نکاح بغیر مہر کے ہو گیا پھر میاں بیوی کا صحیح تعلق ہوا۔ اولاد ہوئی یا نہ ہوئی۔ پھر اس کو طلاق ہوئی تو اس کو مہر وہ دیا جائے گا جو اس کی پھوپھی یا باپ کے رشتہ داروں میں عورتوں کا ہو گا۔ اس کو مہر مثل کہتے ہیں۔ اس کی بھی عدت ۳ حیض ہے۔ تیسری قسم وہ ہے کہ نہ مہر مقرر کیا گیا ہو نہ اس سے تعلق ہوا ہو۔ اور پھر طلاق ہو گئی۔ اس مطلقہ کا حکم اس آیت میں ہے کہ نہ اس کے لئے مہر ہے نہ عدت ہے۔ اور ایک مطلقہ وہ ہے کہ اس کے لئے مہر مقرر ہوا لیکن میاں بیوی کا علاقہ نہیں ہوا اور پھر اس کو طلاق دیدی گئی۔ اس کے لئے آدھا مہر ہے۔ اگلی آیت میں اس کا ذکر آرہا ہے۔ اب ضابطہ میں اس کو لے لیں ایک مطلقہ ایسی ہے جس سے

تعلق ہوا اور ایک ایسی ہے جس سے تعلق نہیں ہوا۔ دو صورتیں ہوگئیں۔ اب جس کا
تعلق ہوا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ اس کے لئے مہر مقرر ہوا اور
ایک قسم ایسی ہے جس کے لئے مہر مقرر نہیں ہوا۔ دوسری قسم جس کا تعلق نہیں ہوا اس
کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جس کے لئے مہر مقرر ہوا اور ایک وہ جس کے لئے مہر مقرر
نہیں ہوا۔ یہ حصر عقلی ہوگیا۔ ویسے عقلی طور سے بھی اس کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ مگر بات
آسان ہے سمجھ میں آگئی۔ یہاں اس مطلقہ کا ذکر ہے جس کا مہر مقرر نہیں ہوا۔ اور
تعلق بھی نہیں ہوا۔ کہ لاجناح علیکم ان طلقتم النساء تم پر کوئی حرج یا کوئی گناہ
نہیں ہے (جناح کے دونوں معنی آتے ہیں) اگر تم طلاق دیدو۔ مطلق طلاق مشروع
ہوگئی۔ یعنی وہ شرعی چیز ہوگئی۔ ذرا باریک بات ہے غور کریں۔ تم پر کوئی گناہ نہیں
اگر تم طلاق دیدو اس پر ایک شرط لگائی کہ مالم تمسوھن اس شرط سے کہ تم نے
ان کو چھوا نہ ہو۔ اگر تم چھولوگے تو پھر گناہ ہوگا۔ یعنی اس شرط سے یہ قید لگائی۔ چھونے
کی حد کہاں تک ہے اور او تفرضوا لھن جب تک ان کا مہر مقرر کیا نہ ہو یعنی اگر تم نے
مہر مقرر نہ کیا ہو اور ان کو چھوا نہ ہو تو یہ طلاق مشروع ہے۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں
ہے۔ تم ان کو طلاق دے سکتے ہو۔ ایک بات تو یہ کھلی ہے کہ اس آیت سے ایک تو
مطلق طلاق مشروع ہوگئی۔ جائز ہوگئی۔ فقہ میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ جائز
اور صحیح یعنی واقع ہونا۔ ان دونوں میں فرق ہے جائز اس کو کہتے ہیں جو خدا کے
حکم کے مطابق ہو۔ اور صحیح اس کو کہتے ہیں جو اپنے ارادے سے ہو اور جس کو شرع
واقع قرار دیدے۔ حالانکہ وہ حکم کے مطابق نہ ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حیض کی
حالت میں اگر طلاق دے گا تو یہ حکم الٰہی نہیں ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔ طلاق نہیں

دینی چاہیئے۔ حیض کی حالت میں یا اس طہر کی حالت میں جس میں میاں بیوی کا علاقہ ہوا ہو۔ تعلق ہوا پھر اسی طہر میں طلاق دیدی تو یہ غیر مشروع اور غیر جائز قرار دی جائے گی۔ لیکن واقع ہو جائے گی۔ صحیح ہو گئی یعنی شرع نے تسلیم کر لیا۔ طلاق کے احکام جاری ہو جائیں گے۔ لیکن دوسرے جرم میں پکڑا جائے گا۔ اس کی مثال ایسی سمجھیں کہ مجھے آپ کے ۲۰ روپے دینے ہیں۔ تو میں نے گلٹ کے روپے کی گڈی بنا کر اور ایک پوٹلی میں باندھ کر وہ پوٹلی آپ کے منہ پر یا سر پر مار دی تو قرضہ تو ادا ہو گیا مگر یہ طریقہ ناجائز ہے۔ تو ادائیگی تو ہو گئی مگر دوسری دفعہ لگے گی اس جرم کی سزا ملے گی۔ تو جائز اور صحیح کے معنی میں نے بتا دیئے۔ جس پر اکثر علمار کرام غور نہیں فرماتے۔ تو حیض میں طلاق غیر مشروع ہے ناجائز ہے۔ مگر واقع ہے اسی طرح جس طہر میں تعلق ہو لیا ہے۔ اس میں اگر طلاق دیدی تو وہ جائز نہیں ہے۔ گو صحیح ہے۔ احکام جاری ہوں گے۔ عدت ہو گی۔ عدت ختم ہونے کے بعد دوسرے سے نکاح کرے گی۔ اب یہاں طلاق کی قسمیں تین ہیں۔ ایک دو تین، تین کے بعد کوئی طلاق نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک تین طلاقوں کا جمع کرنا جائز ہے۔ یعنی ایک شخص یہ کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی۔ میں نے تجھے طلاق دی میں نے تجھے طلاق دی۔ یہ تین طلاقیں جائز اور مشروع ہیں۔ شافعیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ کے یہاں تین طلاقوں کا جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک طلاق ہی گنی جائے گی۔ بعد کی جو دو طلاقیں ہیں وہ پہلی طلاق کی تاکید سمجھی جائیں گی۔ تو یہاں جو اللہ پاک نے طلاق کو مشروع قرار دیا تو یہ تینوں طلاقوں کو شامل ہے ایک طلاق دو طلاق دو یا تین طلاق دو۔ دلیل انہوں نے یہ دی کہ یہ جو کہا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر تم طلاق دو تو اس میں سے یہ استثنیٰ ہو سکتا ہے کہ علاوہ دو کے یا تین کے۔ یعنی سوائے اس کے کہ

تم دو طلاق دو یا تین طلاق دو یہ صورتیں مستثنیٰ ہوسکتی ہیں۔ ان صورتوں کا مستثنیٰ ہوسکنا دلیل ہے اس بات کی کہ جن صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے وہ اس میں شامل ہیں ۔ چونکہ استثنیٰ نہیں کیا اس لئے سب طلاقیں مراد ہیں۔ خواہ ایک ہو دو ہوں یا تین ہوں. لیکن یہ استدلال غلط ہے۔ اس لئے کہ حکم دیا نماز پڑھو، روزہ رکھو اس میں سے استثنیٰ ہو سکتا ہے کہ عید کے دن کا روزہ نہ رکھو سورج کے طلوع وغروب اور زوال کے وقت نماز نہ پڑھو یہ استثنیٰ ہوسکتا ہے۔ تو اگر استثنیٰ ہونے کی بنا پر پورا مجموعہ شامل ہوجائے گا تو وہ سب ناجائز ہوجائے گا. حالانکہ ایک روزہ رکھنے سے امتثال امر ہوجائے گا۔

ایک جماعت مجتہدین نے یہ استدلال کیا ہے کہ لاجناح کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دینا شرعی چیز ہے جائز ہے طلاق فرع ہے نکاح کی کیونکہ طلاق نکاح کے بعد ہی ہوگی تو یہ شرعی چیز نہیں ہے. نکاح صحیح ہے اور یہ نکاح کے بعد ہوئی تو طلاق صحیح ہوئی جائز ہوئی اور صحیح ہونے کو یہ لازم نہیں ہے کہ وہ مشروع بھی ہو۔ اس لئے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا صحیح ہے اور جائز نہیں ہے تو یہ استدلال غلط ہے کیونکہ نکاح مشروع ہے تو نکاح مشروع ہونے کی وجہ سے طلاق مشروع ہوئی ہے۔ تو طلاق جب مشروع ہوئی تو وہ جائز ہوئی۔ صحیح نہیں ہوئی حالانکہ جائز کو صحیح لازم ہے۔ صحیح کو لازم نہیں ہے کہ جائز ہو ۔ جو طلاق جائز ہوگی وہ صحیح ہوگی۔ اور جو طلاق صحیح ہوگی وہ لازمی نہیں ہے کہ جائز ہو. یہاں تو اس کا جائز ہونا لازم آرہا ہے۔ تو مجتہدین سے یہاں بھول ہوئی۔ لاجناح علیکم ان طلقتم النساء کوئی حرج نہیں ہے۔ تم پر کہ تم طلاق دو۔ اس شرط پر کہ تم نے چھوا نہ ہو مس کا لفظ ہے۔ مس کے کیا معنی ایک تو مس محض چھونا ہے اور ایک مس کنایہ ہے اس فعل

سے جو موجب اولاد ہے۔ تو یہاں مس کے معنی خالی چھونے کے نہیں ہیں بلکہ یہاں مراد وہ علاقہ ہے جو موجب اولاد ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی ہے کہ اس قسم کے شرمناک الفاظ جو ہیں وہ اس قسم کے مہذب لفظوں میں ادا کیے جائیں۔ وہاں معنی تو یہ ہیں مالم تجامعوھن لیکن اس لفظ کو ادا کرنا پسند نہیں فرمایا۔ تو ایسے الفاظ استعمال کرو جو ناشائستہ معنی پر دلالت نہ کریں۔ یہاں مراد مس سے وہ فعل ہے جو موجب اولاد ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ لم یمسسنی بشر جب جبریل علیہ السلام نے مریم علیہا السلام سے کہا کہ میں تمہیں ایک بیٹا ھبہ کرتا ہوں۔ عنایت کرتا ہوں۔ (مریم ۲۰) تو انہوں نے تعجب کیا اور کہا یہ کس طرح ممکن ہے کیونکہ لم یمسسنی بشر مجھے کسی بشر نے مس نہیں کیا۔ یعنی وہ فعل جو موجب اولاد ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مس سے مراد وہ فعل ہے۔ یہ دلیل ہے۔ اس کی میں اس سے بھی زیادہ بیان کر سکتا تھا۔ مگر جتنی خدا توفیق دے گا میں بیان کردوں گا۔ آج یہاں ایک اور دقت ہے وہ میں بیان کردوں گا۔ یہ شرط لگائی ہے کہ ان کو چھوا نہ ہو تو کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ اگر چھو بھی لے اور طلاق دیدے تب بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہاں شرط یہ لگائی کہ چھوا نہ ہو۔ تو کوئی گناہ نہیں۔ بڑا مشکل مقام ہے۔ طلاق بغیر چھوئے بھی اور چھونے کے بعد بھی دونوں صورتوں میں طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کے متعلق مجتہدین کو بہت دشواری ہے۔ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ حیض اور طہر جس میں علاقہ ہوا اس میں طلاق دینے میں حرج ہے۔ اس صورت میں کہ چھو لیا جائے۔ اور نہ چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی چھونے کی فلاں شق میں حرج ہے۔ پھر سمجھیں یہاں یہ ہے کہ نہ چھونے کی حالت میں گناہ نہیں ہے اور اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ چھونے کی حالت میں گناہ ہوگا۔ مگر چھونے کی حالت

مں بھی گناہ نہیں ہے تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ چھونے کے بعد بعض ایسی حالتیں ہیں کہ ان میں اگر طلاق دی جائے گی تو وہ گناہ ہے وہ کونسی حالتیں ہیں۔ چھونے کے بعد علاقہ ہوا پھر حیض آیا اور حیض کی حالت میں طلاق دیدی تو یہ جناح ہے یا چھونے کے بعد طہر ہوا اس طہر میں علاقہ ہوا اور اس طہر میں طلاق دیدی تو اس میں جناح گناہ حرج ہے۔ تو یہ بھی بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ سب طلاقیں چھونے ہی کے بعد ہوا کرتی ہیں۔ عموماً طلاق کا جو سبب ہے وہ باہمی نا اتفاقی ہے اور وہ نا اتفاقی عموماً تعلق کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔ تو ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض مجتہدین نے یہ فرمایا ہے کہ مالم تمسوھن میں جو یہ ما ہے وہ اسم جامد ہے اور اَلَّذِی، اَلَّتِی کے معنی میں ہے اگر تم نے طلاق دی ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا نہیں ہے یہ معنی ہیں۔ جن عورتوں کو تم نے چھوا نہیں ہے اگر ان کو تم نے طلاق دی تو اس میں حرج نہیں ہے۔ تو وہ اعتراض اٹھ گیا۔ جن عورتوں کو چھوا نہیں ہے یہ ان عورتوں کی صفت اور قید واقع ہو گئی۔ ایسی عورتوں کو طلاق دینے میں حرج نہیں ہے۔ تو میں نے کہا کہ جن عورتوں کی یہ صفت نہیں ہے اور اس قید سے مقید نہیں ہیں ان کو طلاق دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ۔

اور ایک بڑا جم غفیر مجتہدوں کا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ یہاں جناح کے معنی گناہ کے ہیں ہی نہیں بلکہ یہاں جناح کے معنی مہر کے ہیں لاجناح علیکم کے معنی لا مہر علیکم تمہارے اوپر کوئی مہر نہیں ہے۔ اگر تم عورتوں کو طلاق دو۔ اس شرط پر کہ تم نے ان کو چھوا نہ ہو یا ان کا مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ ان دونوں صورتوں

یں تمہارے اوپر کوئی مہر نہیں ہے۔ یہ ذرا باریک بات ہے اور مشکل ہے۔ تو یہ بات تو صحیح ہے کہ مہر نہیں ہے۔ اس صورت میں لیکن یہ بات کہ جناح کے معنی مہر کے ہیں اس کا ثبوت مشکل ہے۔ اس کو انہوں نے اس طرح ثابت کیا ہے کہ لغت میں جناح ثقل کے معنوں میں ہے۔ اور مال کا ادا کرنا یہ بھی انسان کی طبیعت پر بوجھ ہے۔ اور یہ ایک بھاری چیز ہے اس لیے جناح سے مراد مہر ہو گئی۔ ویسے جناح گناہ کو کہتے ہیں تو گناہ میں بھی بوجھ ہے لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً (النحل۔۲۵) سب اپنے اپنے بوجھوں کو اٹھائیں گے۔ تو بوجھ کیا اٹھائیں گے۔ گناہ کو اٹھائیں گے تو گناہ کو بھی بوجھ کہا۔ جناح کے معنی بوجھ کے ہیں اور مہر کا ادا کرنا یہ بھی ایک بوجھ ہے تو جناح کے معنی مہر کے محتمل ہو گئے۔ تو ہو سکتا ہے کہ جناح کے معنی مہر کے ہوں۔ تو اب یہاں جناح کے معنی مہر ہی کے مراد ہیں۔ دوسرے معنی جو جناح کے ہیں یہاں وہ معنی مراد نہیں ہیں۔ اس کی کیا دلیل ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہارے اوپر جناح نہیں ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ تم نے ان کو چھوا نہیں ہے اور مہر مقرر نہیں کیا ہے۔ یہ محدود ہے نہ چھونے پر۔ تم پر جناح نہیں ہے کب تک نہیں ہے جب تک چھوا نہیں ہے۔ نہ چھونا اس کی غایت ہوئی۔ چھونا جو ہے وہ جناح ہوا۔ چھونے سے پہلے تک تو جناح نہیں ہے۔ چھونا جو ہے وہ جناح ہے اور چھونے میں جو جناح ہے وہ مہر ہے۔ تو پتہ چل گیا کہ جو جناح یہاں ثابت ہے وہی جناح وہاں منفی ہے۔ وہاں مہر ثابت ہے تو یہاں مہر کی نفی ثابت ہو گئی مطلب یہ ہے کہ یہ فرمایا کہ عورتوں کو طلاق دو تم پر جناح نہیں ہے۔ کب تک جناح نہیں ہے جب تک تم نے چھوا نہیں ہے۔ اور چھونے کے بعد جناح ہے اور چھونے کے بعد

جو جناح ہے وہ درحقیقت مہر ہے۔ تو وہاں مہر مراد ہوا۔ تو مہر تک اس کی غایت ہوئی اور جس جناح کا وہاں ثبوت ہے یہاں وہی جناح ہے جس کی یہاں نفی ہے تو وہاں جس کا ثبوت ہے وہ مہر ہے تو یہاں جس کی نفی ہے وہ بھی مہر ہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات انہوں نے اور بھی کہی کہ اگلی آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ اگر نہیں چھوا اور مہر مقرر ہو گیا اور تم نے طلاق دیدی تو نصف مہر ہے۔ یہ ایک مطلقہ ہے۔ اور ایک مطلقہ وہ ہوئی کہ جس کو چھوا بھی نہیں اور مہر بھی مقرر نہیں ہوا۔ یہ دوسری قسم کی مطلقہ ہے۔ تو یہ ایک قسم کی مطلقہ دوسرے قسم کی مطلقہ کے مقابلے میں ہے۔ جب دوسرے کے مقابل ہو گئی تو وہاں مہر مرجوب ہے اور یہ ہے اس کے مقابل تو یہاں مہر نہیں ہونا چاہئیے۔

اب ذرا سی غور کرنے کی بات ہے کہ اس میں غلطی ہوئی۔ بھول ہوئی۔ بات کا خیال نہیں کیا کہ مفہوم مخالف جو ہے۔ وہ معتبر نہیں ہے۔ یعنی ایک مضمون نے بیان کیا۔ اس عبارت سے ایک مضمون سمجھ میں آگیا اور وہ مضمون سمجھنے کے بعد ایک خلاف مضمون بھی سمجھ میں آیا۔ تو وہ خلاف مضمون جو سمجھ میں آیا ہے وہ متکلم کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ جیسے یہ کہا کہ لا تشتروا بایات اللہ ثمنا قلیلا (بقرہ - ۴۱) اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زیادہ قیمت پر بیچو یا جیسے لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ (آل عمران) سود دو چند چو چند نہ کھاؤ۔ اس سے یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ ایک چند کھاؤ حالانکہ وہ بھی حرام ہے۔ تو امام شافعی کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر ہے اور اس کا نام انہوں نے رکھا ہے دلیل خطاب

حنفی مذہب میں مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے تو میں نے ان کی طرف سے حنفی مذہب کے رد میں یہ کہا کہ زید زندہ ہے۔ اس کے قطعی یہ معنی ہیں کہ وہ مرا نہیں ہے۔ یا یہ کہ زید مر گیا تو اس کا قطعی مفہوم ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے آج سے چالیس برس پہلے یہ میں نے بیان کیا تھا جب شافعی حنفی کا جھگڑا چل رہا تھا۔ تو میں نے ایک ضابطہ بنا دیا تھا کہ اگر مفہوم مخالف مفہوم موافق کی نقیض ہوگی تو وہاں مفہوم قطعی معتبر ہے۔ اور اگر مفہوم مخالف مفہوم موافق کی نقیض نہیں ہے تو وہ مفہوم مخالف غیر معتبر ہے۔ یہ قانون بنا دیا تو ساری مشکلیں حل ہو گئیں۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کوئی بات کسی امام کے سمجھ میں آئی۔ کوئی سمجھ میں نہیں آئی اور آج کل کے لوگ تو بالکل بے علم ہیں۔ ہم تو کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ ان کے مقابلے میں۔ لیکن بہر حال جو بات میرے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کہہ دیتا ہوں۔ تو یہاں جو شرط لگائی ہے۔ یاایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن (طلاق ۱-) اے نبی جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدت کے اوقات میں طلاق دو عدت کے اوقات طہر کے ایام ہیں ان میں طلاق دو حیض کے ایام میں طلاق نہ دو تو طلاق مطلقاً مشروع ہو گئی اور یہاں اس کی قید لگائی۔ اور اس کا ہے وہ مفہوم مخالف۔ تو وہ معتبر ہی نہیں ہے۔ تو یہ اس قید کی وجہ سے اعتراض پیدا کرنا بے جا ہے۔ یہ کہا کہ محمد الرسول اللہ ﷺ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ غیر محمد غیر رسول اللہ ہیں۔ (آل عمران-۱۴۴) وہ مالک الملک ہے۔ جیسے چاہے بیان کرے۔ وہاں مطلق بیان کر دیا۔ یہاں قید لگا دی اوتفرضوالھن فریضۃ یا تم نے مہر مقرر نہیں کیا۔ فریضہ کے معنی وہ چیز جو فرض کی گئی ہے اس کا نام مہر ہے۔ مہر مقرر نہیں کیا۔ ان دونوں قیدوں کے ساتھ کہ چھوا نہ ہو اور مہر مقرر نہ ہو تو

کوئی مہر نہیں۔ چار قسمیں بیان کی تھیں (۱) وہ جس کا مہر مقرر ہو گیا اور علاقہ بھی
ہوا اس کا پورا مہر پورا سامان ہے۔ اور ۳ حیض اس کی عدت ہے اور امام
شافعی کے نزدیک ۳ طہر ہے۔

(۲) ایک مطلقہ وہ ہے جسے چھوا اور مہر مقرر نہیں ہوا۔ اس کی عدت ۳ حیض
ہے اور مہر مثل ہے۔

(۳) ایک وہ مطلقہ ہے جس کو نہ تو چھوا۔ اور نہ مہر مقرر ہوا اس کے لئے نہ
عدت ہے نہ مہر۔ اس کے لئے متاع ہے جو ابھی آگے آتا ہے۔

(۴) ایک وہ مطلقہ ہے جسے نہیں چھوا ہے مگر مہر مقرر ہو گیا ہے۔ اس کے لئے
نصف مہر ہے اور عدت نہیں ہے۔ اب یہاں ایک مضمون اور ہے وہ یہ لیں جناح
کا لفظ جہاں بھی آیا ہے گناہ اور حرج ہے۔ اور لغت میں بھی گناہ اور حرج کے
معنوں میں آیا ہے۔ تو اب اس کے معنی مہر کے عقل سے ثابت کرنا یہ بھی کوئی اچھی
بات نہیں ہے۔ یہ عقل ہی سے تو ثابت کیا ہے کہ جناح کے معنی بوجھ کے ہیں اور
گناہ بھی بوجھ ہے۔ مہر بھی بوجھ ہے ادائے مہر بھی بوجھ ہے لیکن جتنے آدمی بھی
مہر ادا کرتے ہیں۔ سب پر تو بوجھ نہیں ہوتا اگر بھاری بھی فرض کر لیا جائے تو جتنے
بھی ہیں سب کی جناح میں داخل ہو جائیں کہ مہر تو بہر حال سب ہی کو ادا کرنا ہوتا
ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ضابطہ کی غلطی ہوئی ہے۔ کہ جناح جو ہے وہ بوجھ ہے
ادائے مہر اور ادائے مال بوجھ ہے تو ادائے مہر جناح ہو گیا۔ یہاں بوجھ مختلف
چیزوں کی صفت واقع ہوا ہے۔ یہاں شرط یہ ہے کہ ایک موجبہ ہو اور ایک
سالبہ ہو تب نتیجہ نکلے گا۔ جناح یہاں بوجھ ہے۔ اور اگر یہاں بوجھ کی نفی ہو تو

تب نتیجہ دیتا۔ دودھ سفید ہے۔ اور کپڑا سفید ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے دودھ کپڑا ہے یا کپڑا دودھ ہے۔ یہ منطقی بات ہے۔ ایک شے کئی چیزوں کی صفت ہو سکتی ہے۔ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تمام چیزیں آپس میں متحد ہو جائیں۔ البتہ ایک مثبتہ اور موجبہ ہو تو نتیجہ دیں گی۔ مثلاً دودھ سفید ہے۔ بھینس سفید نہیں ہے۔ تو اس کے قطعی معنی یہ ہیں کہ بھینس دودھ نہیں ہے۔ یہ حق ہے۔ یہ نتیجہ ٹھیک ہے۔ یہ تمام سائنس حکمت سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سانس جب تک ہے زندہ ہے روح جب تک ہے زندہ ہے تو سانس روح ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ یہ بالکل کا جو سب سے بڑا حکیم ہے اس کی رائے ہے۔ مگر بالکل غلط ہے۔ قانون کا لحاظ نہیں رکھا قانون یہ ہے کہ ایک موجبہ ہو اور ایک مثبتہ ہو۔ تب شکل ثانی میں نتیجہ دے گا جیسے کہ فرمایا ما قدروا اللہ حق قدرہ جیسی قدر کرنی چاہیئے ویسی قدر نہیں کی۔ انہوں نے اللہ پاک کی کب ما انزل اللہ علیٰ بشر من شیء جب انہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا۔ یعنی کوئی بشر منزل من اللہ نہیں ہے۔ تو اس نے جواب دیا من انزل الکتاب الذی جاء به موسیٰ علیہ السلام موسیٰ جو کتاب لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی۔ موسیٰ علیہ السلام تو عند الفریقین منزل من اللہ ہیں۔ موافق اور مخالف دونوں کے نزدیک تو کوئی بشر منزل من اللہ نہیں ہے اور موسیٰ منزل من اللہ ہیں تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ موسیٰ علیہ السلام بشر نہیں ہیں۔ اور یہ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بشر ہیں۔ تو یا تو دونوں مقدمے باطل ہیں یا ایک مقدمہ باطل ہے۔ تو اس میں سے ایک مقدمہ کہ موسیٰ علیہ السلام منزل من اللہ ہیں۔ یہ دونوں کے نزدیک مسلم ہے تو یہ مقدمہ کہ کوئی بشر منزل من اللہ نہیں ہے۔ یہ باطل ہے۔ تو اللہ پاک نے شکل ثانی

سے ان کی بات کا رد کر دیا۔ یہ بات میں نے مفتی کفایت اللہ مرحوم کو بھی بتائی تھی کہ قرآن شریف تمام اشکال اربعہ سے بھرا ہوا ہے اور اس سے زیادہ منطقی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اور چونکہ توریت بھی آسمانی کتاب ہے۔ میں نے توریت کو نہیں دیکھا۔ صحیح توریت غیر محرف میں بھی یہ مضمون ہیں۔ اس کا پتہ یوں چل گیا کہ انہ لفی زبر الاولین (شعراء ۔۔) یہ مضامین اگلی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ ہوں گے نہیں ہیں۔ فارانے اس کی تصدیق کر دی۔ ایسی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ اتنے بڑے بڑے مجتہدوں سے ان کے سامنے بات کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے دل کو۔ میں نے ایسی بات ایک جلسہ میں مولوی احتشام الحق وغیرہ کے سامنے بھی کہہ دی تو مجھ سے تو انہوں نے کچھ کہا نہیں لیکن مجھے بتایا گیا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ لو بھئی اب تو یہ بڑے بڑے لوگوں کی باتوں کو بھی غلط کہنے لگے تو میں نے جواب دیا کہ ان سے کہہ دو کہ جو بات وہ کہتے ہیں وہی صحیح ہے۔ میں اگر صحیح بھی کہوں تو غلط ہیں میں اس معاملہ میں نہیں پڑتا۔ اتنے بڑے آدمی کے سامنے کیا کہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ بغیر مہر کے نکاح درست ہے۔ اللہ پاک نے نکاح کو مشروع قرار دیا۔ نکاح کے معاملہ میں بڑی دقت ہے ایک بات میرے بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ نہ میرے استاد کے سمجھ میں آئی ہے نہ اور کسی بزرگ کے سمجھ میں آئی کہ یہاں کائنات میں کل چار عقد ہیں (۱) تملیک شئے بالعوض یہ بیع ہے کسی شئے کے عوض آپ کو مالک بنا دینا (۲) تملیک شئے بلا عوض کسی شئے کا مالک بنا دینا بلا کسی شئے کے عوض اس کا نام ہبہ ہے۔ نذر کر دیا کہ یہ آپ لے جایئے اس کے بدلے میں قیمت وغیرہ کچھ نہیں۔

(۳) اب تیسری شکل یہ ہے کہ شے کا مالک تو نہیں بنایا مگر شے کی منفعت کا مالک بنا دیا۔ بلا عیوض یا بالعیوض اگر منفعت کا مالک بالعیوض بنایا تو اس کو اجارہ کہتے ہیں۔ مثلاً سقہ نے دو روپیہ مہینہ پر آپ کو پانی کی منفعت کا مالک بنا دیا پانی کا نہیں کیونکہ پانی اس کی ملکیت نہیں ہے۔ تملیک منفعت شے بالعیوض یہ یہ اجارہ کہلاتا ہے۔

(۴) اور تملیک منفعت شے بلا عیوض۔ اس کا نام استعارہ ہے۔ کسی شے کا مستعار دینا تو بلا عیوض کسی شے کی منفعت کا مالک بنانا۔ قلم مستعار دیا یعنی قلم کا مالک تو نہیں بنایا مگر اس کی منفعت کا مالک بنا دیا کہ اس سے لکھ لے۔

یہ کل چار عقد ہیں۔ یہ عقد نکاح کہاں سے آیا۔ نہ یہ بیع ہے نہ ہبہ ہے نہ اجارہ ہے اور نہ استعارہ ہے۔ چاروں میں سے کسی میں شامل نہیں تو پھر یہ کہنا کہ بالعیوض اتنے مہر کے میں نے سپرد کیا یا قبول کیا یہ کیا چیز ہے۔ یہ بہت مشکل ہے۔ لیکن میں نے اس کی ایک ترکیب نکالی ہے تملیک کسے کہتے ہیں تصرف کا حق حاصل ہونا۔ یہاں شوہر اس کے عضو کا مالک نہیں ہے۔ نہ اس کی منفعت کا مالک ہے ملکیت نہیں ہے۔ کسی قسم کی ملکیت نہیں ہے۔ البتہ یہ ہے کہ تملیک شے منفعت مخصوص ہے۔ یعنی تملیک منفعت شے خاص ہے زوج کے لئے حق تصرف غیر کے لئے جاتا رہا۔ مخصوص ہو گیا شوہر کے لئے۔ یہ میری سمجھ میں آیا۔ آگے اللہ بہتر جانتا ہے کیا ہے۔ تملیک منفعت عضو کی شوہر مخصوص ہے۔ تب جا کر ان چاروں عقدوں میں شامل ہو گا۔ یا پھر دوسرا قانون لگے گا۔ کہ اللہ پاک کو حق ہے۔ جس کو چاہے عقد کے نام سے پکارے۔

تو اس مطلقہ کے لئے حکم یہ ہے کہ نہ اس کے لئے مہر ہے نہ عدت ہے ان کے لئے متاع ہے۔ متاع عموماً تین کپڑوں کا ہوتا ہے۔ ایک سر پر باندھنے کا ہوتا ہے ایک پہننے کا ہوتا ہے۔ اور ایک چادر ہوتی ہے جو سر سے پیر تک سب بدن کو ڈھانپ لے۔ اس میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ میں اختلاف ہے کہ متاع واجب ہے یا واجب نہیں ہے۔ بلکہ مندوب ہے۔ واجب اور مندوب کے معنی سمجھ لیں۔

اللہ تبارک تعالے کا حکم انسان کے ہر سکون اور حرکت کے ساتھ متعلق ہے اور حرکت اور سکون کے مجموعہ کا نام فعل اور عمل ہے تو ہر عاقل بالغ کے فعل اور عمل کے ساتھ حکم الہی متعلق ہے تو جب فعل کے ساتھ حکم متعلق ہو اگر دیکھا جائے گا کہ فعل کی طلب قطعی ہے۔ یعنی فعل کلیتاً مطلوب ہے تو اس فعل کی کلیتاً طلب کا نام فرض ہے۔ اور واجب ہے۔ فرض و واجب میں حنفی مذہب والے فرق کرتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک فرض و واجب ایک ہی چیز ہے۔ ہمارے یہاں فرق یہ ہے کہ اگر اس کی طلب قطعی دلیل سے ثابت ہے تو اس کو فرض کہیں گے اور اگر وہ ظنی دلیل سے ثابت ہے تو اس کو واجب کہیں گے عشا کے جو چار فرض ہیں وہ قطعی دلیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے ان کو فرض کہیں گے۔ اور وتر جو ہیں وہ ظنی دلیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے ان کو واجب کہیں گے اور اگر فعل کی کلیت مقصود نہیں ہے بلکہ اکثریت مقصود ہے تو اس کو مندوب کہتے ہیں اس فعل کو مندوب کہیں گے۔

اگر اس کا ترک کلیتاً مقصود ہے جیسے چوری نہ کرو ایک بار بھی کی اور نہ

ایک دانہ کی۔ ترک مقصود ہے۔ کہ چوری مت کرو۔ تو اس ترک فعل کی کلیت جو ہے
اس کا نام حرمت ہے اور فعل حرام ہے۔ اور اگر ترک کی کلیت نہیں بلکہ اکثریت
مقصود ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اگر نہ فعل کلیتاً مقصود ہے نہ جزئیتاً اور نہ
ترک کلیتاً مقصود ہے نہ جزئیتاً چاروں میں سے کوئی مقصود نہیں ہے اور پھر اس
کے ساتھ حکم متعلق ہے تو اس کو مباح کہتے ہیں جیسے کلوا واشربوا ولا تسرفوا (اعراف)
بکرے کا گوشت کھاؤ۔ تو یہ کھانا پینا مباح ہے فرض نہیں ہے۔ تو ہر فعل کے ساتھ
پانچ حکم متعلق ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ کون سا فعل مقصود ہے۔ حضرت امام مالک رضی
فرماتے ہیں کہ یہ مندوب ہے۔ واجب نہیں ہے فرض نہیں ہے۔ مگر امام
ابوحنیفہؒ اس کو فرض کہتے ہیں۔ دینا پڑے گا۔ متعوھن ان کو متاع دو۔ کیا
متاع ہو کہ جو مالدار غنی ہے۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق دے اور جو غریب ہے
وہ اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ فرمایا کہ جس کا مہر مقرر ہو گیا
اس کو تو نصف مہر دینا پڑے گا۔ اور اس کا چونکہ مہر مقرر نہیں ہوا ہے یہ اس
سے گھٹیا ہے۔ تو یہ اس قیمت کا دیا جائے کہ نصف مہر سے زیادہ نہ ہو جائے
اب قدرہٗ کے معنی قدر امکانہ کے ہیں۔ استطاعت اور امکان کے مطابق مرد کے
یا عورت کے۔ اگر عورت کسی رئیس گھر کی ہے تو قیمتی کپڑے اور اگر غریب گھر کی ہے
تو موٹا جھوٹا۔ عورت کا حال دیکھو اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نہیں مرد کا حال
دیکھنا چاہیئے۔ مرد اگر رئیس ہے تو اچھا کپڑا دے اور غریب ہے تو ہلکا دیدے۔
تو امام مالک نے یہ کہا کہ حقا علی المحسنین متاع ان لوگوں پر حق ہے جو احسان کرنے
والے ہیں۔ اور احسان کرنا واجب نہیں ہے۔ احسان کہتے ہیں بغیر کسی معاوضہ

کے بھلائی کرنا۔ اللہ پاک نے یہ کہا کہ محسنین پر حق متاع واجب ہے۔ تو وہ احسان ہوا۔ اگر واجب ہوتا تو ادا ہوتا۔ اگر آپ کے دس روپے مجھے دینے ہیں تو وہ میں ادا کروں گا احسان نہیں کروں گا۔ اگر کچھ دینا نہ ہو پھر جو میں دوں گا تو وہ احسان کروں گا۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

امام ابو حنیفہ نے یہ فرمایا کہ حکم ہے متعوا متاع دو تو یہ امر ہے اور امر واجب کرتا ہے۔ امر وجوب کے لئے ہے۔ دوسری دلیل یہ دی حقا علی المحسنین میں جو علی ہے اردو میں پر کا لفظ آتا ہے وہ آتا ہی ادا کے لئے ہے۔ یعنی جب آپ کا حق مجھ پر ہوگا۔ تب یہ کہیں گے۔ احسان کے لئے پر نہیں آئے گا احسان کرنے والے کے لئے جس پر احسان کیا جائے گا۔ اس کے لئے تو پر آئے گا کرنے والے کے لئے پر نہیں آئے گا۔ یہ دو دلیلیں امام ابو حنیفہ نے بیان کیں، مگر کچھ کم میں نہیں آئیں۔ میں کہتا ہوں۔ یہ عقد نکاح جو ہے وہ معاوضہ کو چاہتا ہے عقد بغیر عوض نہیں ہو سکتا۔ چاروں صورتوں میں مہر ہے۔ اس صورت میں مہر نہیں ہے۔ تو یہ تو بدل ہے مہر کا۔ اس صورت میں مہر نہیں ہے تو یہ بدل ہے مہر کا حنفی مذہب کی تائید میں میں کہتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی متاع تو قائم مقام ہے مہر کا۔ اور مہر واجب ہے تو یہ بھی واجب ہو گیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ‌ؕ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ بقرہ (۲۳۷)

ترجمہ   اور اگر تم نے چھونے سے قبل طلاق دیدی اس صورت میں کہ ان کا مہر مقرر کر دیا گیا ہو تو اس صورت میں مقرر کئے ہوئے مہر کا آدھا۔ یعنی اگر ہزار روپیہ مقرر کیا ہے تو ۵۰۰ دیدو۔ مگر دو صورتوں میں استثنیٰ کر دیا یا تو وہ عورت خود معاف کر دے یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہو۔ یہ دو صورتیں اگر ہوں تو نصف مقدار میں مہر دینا پڑے گا اور اگر تم نے معاف کر دیا تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کرنا نہ بھولو۔ بھولنے کی ممانعت نہیں ہے۔ کیونکہ بھولنا تو غیر اختیاری شئے ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مت ترک کرو احسان کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ۔ جب آدمی کسی کام کو بھول جاتا ہے تو اس کام کو وہ ترک کر دیتا ہے۔ ترک کرنا لازم ہے۔ لازم کو ملزوم کی جگہ بولا گیا۔ یہ فصاحت کا بہترین طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں ذکر تھا کہ بغیر چھوئے طلاق دیدی اور مہر مقرر نہیں ہوا اس صورت میں نہ عدت ہے نہ مہر ہے۔ اس کے مقابلہ کی یہاں صورت ہے کہ بغیر چھوئے طلاق دیدی۔ اور مہر مقرر ہوا ہے تو اس صورت میں آدھا مہر ہے۔ یہاں ایک بڑی نزاکت ہے اسے سمجھیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر خلوت صحیحہ ہو جائے تو مہر واجب ہو جاتا ہے۔ خلوت صحیحہ اس مکان خالی کو کہتے ہیں جس میں ان کے

درمیان اس فعل کے کرنے میں حساً اور شرعاً کوئی شے مانع نہ ہو۔ حساً یہ کہ کوئی تیسرا آدمی موجود ہو۔ بیماری ہو۔ شرعاً یہ کہ روزہ ہو۔ احرام میں ہو وغیرہ۔ یہ چیزیں تعلق سے روکنے والی ہیں۔ تو یہ خلوت صحیحہ مہر کے مقرر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ حنفی مذہب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک چھونا شرط ہے اور خلوت صحیحہ موجب مہر نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا اور ان کی عمر کو شامل کرکے تقریباً تیرہ سو سال سے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ امام مالکؒ۔ امام ابوحنیفہؒ۔ امام شافعی اور امام حنبلؒ۔ یہ تو چار امام باقی ہزارہا بلکہ لاکھوں مجتہد اس تیرہ سو سال میں گذرے ہیں۔ یہ بحث شروع ہی سے چلی آرہی ہے۔

اگر تم نے بغیر چھوئے طلاق دیدی یہ حالت ہے کہ تم نے مہر مقرر کردیا ہے فرض کے معانی مقرر کرنے کے ہیں تو جو مہر تم نے مقرر کردیا ہے۔ اس کا آدھا تو یہ کلام تام نہیں ہے۔ وہ آدھا کیا چیز ہے۔ اس کی خبر ہونی چاہیئے۔ خبر محذوف نکالی جائے گی۔ کہ آدھا مہر واجب ہے یا آدھا مہر ساقط ہے۔ یعنی اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر ہزار روپیہ مقرر ہوا ہو تو ۵۰۰ بس اتنا فرمایا۔ تو اب یہ ۵۰۰ واجب ہے یا ہزار میں سے پانچسو ساقط ہے۔ دونوں باتیں محذوف ہو سکتی ہیں۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ آدھا مہر ساقط ہے۔ اس کی محذوف خبر "ساقط ہے" نکلے گی۔ اتنے بڑے آدمی ہیں ان کی بات کو رد کرنا۔ بڑی جھجک سی ہوتی ہے۔ حنفی مجتہدین نے اس کا رد نہیں کیا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خلوت صحیحہ مقرر مہر نہیں ہے خلوت صحیحہ میں بغیر چھوئے مہر ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک۔ اور امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ خدا نے یہ فرمایا کہ بغیر چھوئے آدھا مہر ساقط ہے۔ اگر خلوت صحیحہ مقرر مہر ہوتی تو

یہ آدھا مہر ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا خلوت صحیحہ مقرر مہر نہیں ہے۔ اگر اس دلیل کا رد نہ ہو تو حنفی مذہب (خلوت صحیحہ مقرر مہر ہے) باطل ہو جائے گا۔ حنفی مذہب ہے کہ نصف ماذ فتم واجب۔ تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف واجب ہے۔ انہوں نے محذوف یہ نکالا ہے کہ آدھا مہر واجب ہے۔ امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ یہ خبر نہیں نکل سکتی اس لئے کہ طلاق دینے کو اسبات پر معلق کیا کہ طلاق دے۔ یعنی آدھا مہر واجب ہوگا طلاق دینے کی صورت میں۔ اور جو شے کسی شے پر معلق ہو اور جس پر معلق ہے اگر وہ معدوم ہو تو وہ شے خود بھی معدوم ہوگی۔ تو اگر طلاق نہ دی جائے یعنی طلاق معدوم ہو تو نصف مہر بھی معدوم ہو جائے گا۔ تو طلاق نہ دینے کی صورت میں نصف مہر کا واجب نہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور طلاق نہ دینے کی صورت میں پورا مہر واجب ہے اور پورے کو نصف لازم ہے۔ کل کے واجب ہونے کو آدھے کا واجب ہونا لازم ہے۔ تو نصف مہر معدوم نہ ہوا۔ اور جب نصف مہر معدوم نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں خبر "واجب" نہیں نکل سکتی بلکہ "ساقط" ہی نکلے گی۔ اور اب یہ بات صحیح ہو گئی کہ اگر طلاق دی تو نصف مہر ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں دی تو ساقط نہیں ہوگا۔ بہت ادق بات ہے۔ اب ترجمہ یہ نکلا کہ بغیر چھوئے اگر طلاق دی جائے نصف مہر ساقط ہے۔ اور خلوت صحیحہ ہوئی مگر چھوا نہیں ہے اور طلاق دیدی تو نصف مہر ساقط ہو گیا۔ تو معلوم ہو گیا کہ خلوت صحیحہ مقرر مہر نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے بہت دقیق تقریر فرمائی ہے۔ اچھا خاصا عالم نہیں سمجھ سکتا۔ تو بیان کیا کرے گا۔ ظاہر میں کتنی اچھی اور بین بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غلط ہے۔ اور اس غلطی کا احناف علماء نے کچھ جواب نہیں دیا۔ یعنی اس کی غلطی نہیں پکڑ سکے

اس کی غلطی کے دو ٹکڑے ہیں. میں کہتا ہوں۔ پہلی غلطی تو یہ ہے کہ یہ اصول غلط ہے۔ کہ جو شے جس شے پر معلق ہو اس کی نفی سے شے کی نفی ہو جاتی ہے۔ نصف مہر کا واجب ہونا معلق ہے طلاق دینے پر۔ اگر طلاق نہ دی جائے تو نصف مہر بھی واجب نہ ہوگا۔ یہ اصول حکما۔ اہل زبان اور مجتہدین سب کے یہاں رائج ہے لیکن یہ اصول ہے غلط۔ اس دقت باریک بحث میں نہیں جاتے ورنہ سبق رہ جائے گا جیسی طور پر سمجھ لیں۔ الگنی پر کپڑا (لٹکا ہوا ہے) معلق ہے۔ طلاق دینا تو ہے الگنی اور نصف مہر جو ہے وہ ہے کپڑا۔ تو طلاق کی نفی سے مہر کے وجوب کی نفی ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر الگنی کو مٹا دیا جائے تو کپڑا خود بخود مٹ جائے گا۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ اگر الگنی ہٹا دیں تو کپڑا جوں کا توں باقی رہے گا۔ تو یہ اصول ہی غلط ہے۔ یہ اصول فلسفیوں نے ایجاد کیا تھا۔ اور اہل شریعت مجتہدین اور اہل زبان سب نے اس کو اپنا لیا۔ اس کے باوجود ہم اس اصول کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں لیکن یہاں ایک نفیس بات ہے جو امام شافعیؒ نے خیال نہیں فرمائی۔ کہ یہ جو آدھا مہر ہے جس کو تم کہہ رہے ہو کہ ساقط ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ واجب ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اگر یہ واجب ہوگا۔ تو معدوم ہو جائے گا۔ اور معدوم ہے نہیں کیونکہ کل موجود ہے تو کل کے ضمن میں نصف لازم ہے تو یہ آدھا جو ہے۔ وہ اس مہر مقرر کا آدھا نہیں ہے یہ الگ ایک مستقل شے ہے۔ اللہ تعالے فرماتا ہے۔ کہ جو مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا میں تم پر واجب کرتا ہوں۔ یہ آدھا وہ آدھا نہیں ہے۔ جو اس مہر کے ضمن میں آدھا ہے۔ وہ مہر تو اللہ پاک نے مقرر نہیں کیا وہ تو ہم نے آپس میں طے کیا ہے۔ مثلاً ہزار روپیہ تو اس کا نصف ۵۰۰ ہے۔ تو اب یہ واجب کا حکم

ہے۔ وہ اس پانچ سو کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ مستقل الگ شے ہے جو اللہ پاک خود مقرر کر رہا ہے۔ مقدار اس کی بھی پانچ سو ہے۔ مگر مقدار کا برابر ہونا حکم کے برابر ہونے کو نہیں چاہتا۔ مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ ایک مربع کو سیدھا کاٹ دیں کر برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ یہ دو مستطیل بن جائیں گے۔ اب اسی مربع کو آڑا کاٹ دیں۔ دو برابر کے مثلث بن جائیں گے۔ ہر دو مثلث الگ الگ ہے دو مستطیل کے برابر ہوگا۔ مگر حکم دونوں کے الگ الگ ہوں گے۔ مستطیل کا حکم الگ ہوگا مثلث کا الگ تو مقدار کا برابر ہونا حکم کے برابر ہونے کو نہیں چاہتا۔

یہ نہیں ہے کہ وہ آدھا جو تم نے مقرر کیا تھا۔ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک اللہ پاک کی مقرر کی ہوئی اور ایک ہماری مقرر کی ہوئی۔ اب اللہ پاک نے فرمایا کہ تم پر میں مہر واجب کرتا ہوں۔ کتنا۔ اتنا کہ جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے۔ اس کا آدھا تو مقدار کے برابر ہونے سے حکم کا برابر ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ آدھا وہ آدھا نہیں ہے جو کل کے اندر کا آدھا ہے بلکہ یہ ایک مستقل الگ آدھا ہے۔ یعنی جو مہر تم نے مقرر کیا تھا۔ اس کے نصف کے برابر اب میں واجب کرتا ہوں۔

اور امام شافعیؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ کل کے واجب ہونے سے نصف کا واجب ہونا لازم آتا ہے۔ یہ دھوکا ہے کہ کل عالم اس دھوکے میں آگیا۔ یہ اصول بھی غلط ہے۔ ساری غلطیاں اور ساری مشکلات جو لاینحل بن جاتی ہیں۔ وہ اس اصول پر ہیں۔ یہ شیطانی غلطی ہے کہ جو حکم کل کا ہوگا وہی حکم جز کا ہوگا۔

رومال سفید ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کا ہر جز سفید ہے۔ تو یہ عالم ظاہری میں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ میں نے اس کی تردید کردی اور تمام علماء کی غلطی پکڑلی۔ جو صفت کل کے لئے ثابت ہے وہ جز کے لئے ثابت ہے۔ پانی گرم ہے تو پانی کا ہر ہر جز گرم ہے۔ اس کو دیکھ کر حکماء نے یہ اصل بنالیا لیکن یہ غلط ہے۔ جتنے گمراہ مذہب پیدا ہوئے ہیں وہ اسی اصل پر ہوئے ہیں۔ اس میں خرابی تھی یہ بات میں نے کہی ہے مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ جو حکم کل کا ہے وہ حکم جز کیلئے اس وقت ثابت ہوگا۔ جب وہ حکم کل پر جز کے واسطے سے آیا ہو۔ اور جو حکم کل کیلئے براہ راست آیا ہے۔ وہ جز کے لئے ثابت نہیں ہوگا۔ مثلاً کل کے لئے کل ثابت ہے۔ جز کے لئے کل ثابت نہیں ہے۔ کسی جز کو کل نہیں کہہ سکتے۔ نماز ظہر فرض ہے۔ ظہر کی رکعت چار ہیں۔ تو چاہیئے کہ ہر ہر رکعت فرض ہو۔ ایک رکعت پڑھ لی۔ فرض ادا ہوگیا۔ اور ایک گھنٹہ بعد دوسری پڑھ لی اس طرح تیسری اور چوتھی۔ اگر اسی طرح پڑھیں گے تو فرض ادا نہیں ہوگا۔ تو ہر ہر رکعت واجب نہیں ہے۔ بلکہ چار رکعت مل کر ایک شئے بنی ہے وہ شئے واجب ہے۔ اس کیلئے فرضیت ثابت ہوئی ہے۔ ایک ایک رکعت واجب ہو کر چار رکعت کا وجوب نہیں آیا ہے بلکہ چار رکعت کی نماز فرض ہے۔ اسی طرح پورا واجب ہے۔ اس کا ہر ہر ٹکڑا تنہا واجب نہیں ہے۔ کہ ایک مرتبہ ایک ادا کرلیا۔ دوسری مرتبہ دوسرا ٹکڑا ادا کرلیا۔ اس طرح حج ادا نہیں ہوگا۔ اس میں ایک باریک بات اور ہے جو بڑا بڑا عالم نہیں سمجھا کہ واجب ہونا اور چیز ہے۔ اور واجب الادا ہونا اور بات ہے میں نے آپ سے ۱۰۰ روپیہ قرض لیا کہ دو ماہ بعد دیدوں گا۔ تو یہ سو روپیہ مجھ پر

واجب ہو گئے۔ مگر واجب الادا یہ دو ماہ بعد ہوں گے۔ کافر ضتم واجب لہ ہو گیا جب معاہدہ ہوا۔ واجب تو ایجاب و قبول سے ہی ہو گیا۔ اب یہ جو حکم ہے یہ واجب الادا کا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ کا قول اسی حد تک میری سمجھ میں آیا جو میں نے بیان کر دیا اس سے زیادہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ تم پر ایک چیز واجب ہے۔ رہ گیا ہے کہ جو کچھ تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا: اب امام ابو حنیفہؒ نے یہ فرمایا۔ دکیف تاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض واخذن منکم میثاقاً غلیظاً (النساء)

مہر لینا حرام ہے۔ واپس عورت سے مہر واپس نہیں لے سکتے۔ اسے تم تنہائی میں مل چکے اب کیسے مہر واپس لے سکتے ہو۔ یہ علت فرمائی واپس نہ لینے کی یہ تنہائی میں ملنا مقرر مہر ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ قضا کہتے ہیں۔ مکان خالی کر۔ جب تم خلوت میں ایک دوسرے سے مل چکے تو اب تم مہر واپس نہیں لے سکتے تو معلوم ہوا کہ خلوت میں ملنا موجب مہر ہے۔ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خلوت صحیحہ مقرر مہر ہے۔

یا عورت معاف کر دے مہر تو اس صورت میں نہیں دینا پڑے گا عورت کو اختیار ہے کہ وہ نہ لے کہ میری صورت تک نہیں دیکھی میں نہیں لیتی۔ یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ تو وہ کون ہے: یا تو شوہر ہے یا ولی ہے۔ مگر ولی کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور یہاں حکم ہو رہا ہے کہ معاف کرے۔ مذہب کے درجہ میں ہے معاف کرنا تو کوئی معاف کرنے والا ہونا چاہیے تو ولی کو تو ہے نہیں حق معاف کرنے کا۔ اگر ولی کہے عورت سے کہ مہر معاف کر دے تو عورت کہہ دے کہ میں نہیں معاف کرتی۔ سیدھی سی بات ہے تو اب یہ معاف کرے

والا شوہر ہی ہو سکتا ہے۔ اور شوہر ہی ہے۔ اور شوہر کا معاف کرنا یہ ہے کہ وہ پورا مہر ادا کردے۔ عورت کا معاف کرنا تو یہ ہے کہ وہ آدھا مہر نہ لے۔ اور معاف کردے اور شوہر کا معاف کرنا یہ ہے کہ وہ اس کو آدھا نہ دے پورا دے۔ چنانچہ ایک صحابی تھے انہوں نے نکاح کیا پھر طلاق دیدی تو عورت نے کہا کہ میں مہر نہیں لیتی تو صحابی نے فرمایا کہ نہیں میں معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں اور انہوں نے پورا مہر ادا کردیا۔

مگر امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ معاف وہ شے کی جاتی ہے جو حق واجب ہو اور پورا مہر مرد پر واجب ہی نہیں ہے۔ تو حق ہے نہیں وہ کیسے معاف کرے گا بلکہ بغیر حق کے کسی کو بلا معاوضہ کوئی شے دینا اس کو ہبہ کہتے ہیں۔ یہ ہبہ ہوگا معاف نہیں ہوگا۔ اگر شوہر پورا مہر ادا کردے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل تو یہ ہے کہ ولی کو حق نہیں ہے معاف کرنے کا۔ عورت کا معاف کرنا پہلے ٹکڑے میں آچکا تو اب کوئی ہے نہیں جو معاف کرے تو لازم یہ خطاب شوہر کی طرف ہے۔ کہ شوہر معاف کردے یعنی پورا مہر ادا کردے۔ اور امام شافعی نے یہ فرمایا کہ عفو کا اطلاق اس حق پر ہوتا ہے جو کسی پر واجب ہو جو شے واجب نہیں ہے وہ معاف نہیں کہلائے گی بلکہ اس کو ہبہ کہیں گے۔ اس کا جواب احناف علماء نے نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (مائدہ ۱۱۷) توفیتنی قرآن میں بھی اور لغت کی کتابوں میں بھی ہر جگہ موت ہی کے معنی ہیں۔ لیکن یہاں تمام اصحاب رضی اللہ علیہم اجمعین نے ہمیں یہ بتادیا کہ یہاں توفیتنی کے معنی رفعتنی کے ہیں اور یہ ہم نے مان لیا۔ اسی طرح اصحاب رسولؐ نے یہ بتادیا کہ

عفو کے معنی پورا مہر ادا کرنے کے ہیں۔ یہاں تو ہم نے اس کو بھی تسلیم کر لیا۔
اس کی تائید یہ ہے کہ یہ ہے صحیح جواب۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا معاف کرنا تقوی کے زیادہ قریب ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ (مائدہ - ۱۱۷) عورت کو تو حکم دیا کہ تو معاف کر دے اور مرد کو حکم دیا کہ تو پورا دیدے اور اس کو فضل قرار دیا۔ دونوں کو حکم دیا کہ وہ دوسرے پر احسان کریں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ عفو کے معنی دراصل احسان اور فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ میں پہلے بھی آپکو بتا چکا ہوں کہ گمراہی کا سبب یہ ہوا ہے کہ ایک لائن کی چیز کو دوسری لائن میں شامل کر دیا ہے۔ یہ کل اور ہے وہ کل اور ہے۔ ایک تو یہ کل ہے کہ پورا مجمع ہے یہ کل ہے اور ایک کل کے یہ معنی ہیں کہ ہر ہر واحد یعنی کل آدمی اس درخت کو نہیں اکھاڑ سکتے اس کے معنی یہ ہیں کہ مجمع میں سے ہر ہر واحد درخت کو نہیں اکھاڑ سکتا۔ اور ایک کل یہ ہے کہ کل آدمی یعنی پورا مجمع مل کر درخت کو نہیں اکھاڑ سکتا تو یہ ایک جھٹکے میں اکھاڑ دیں گے۔ تو کل ایک تو انفرادی ہوا اور ایک کل مجموعی ہوا۔ تو اگر ایک کل احکام کو دوسرے کل میں ملا دیں گے تو غلط ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے یہ تمام مشکل مسائل ناقابل حل ہو گئے ہیں۔ فلسفہ الہیات کے جتنے مسائل لا ینحل ہو گئے ہیں اس کی وجہ سے ہوئے ہیں کہ ایک لائن اور دور کی چیز کو دوسری لائن میں تلاش کیا۔ مثلاً عالم مقدار یعنی عالم ہندسہ میں یہ ثابت ہو گیا کہ مربع کا دو چند مربع ہوتا ہے لیکن عالم عدد میں ہرگز مربع کا دو چند مربع نہیں ہوتا۔ اب غور ہے ایک تو وہ غور ہے جو قوت غور ہے ایک وہ غور ہے جو عمل غور ہے۔ جب قوت غور کو قوت عمل میں لے آئے گا تو بڑی سخت غلطی ہو گی۔ اسی طرح شرعی احکام اور

غیر شرعی احکام دونوں کے حکم الگ ہیں اگر دونوں ملا کر حکم دیگا شرعی کو غیر شرعی میں ملا کر حکم دیگا تو وہ غلط ہوگا۔ شرع کا حکم یہ ہے کہ عاقل بالغ انسان اگر بلا وجہ کسی کو ستائے تو وہ ظلم ہے اور ناجائز ہے۔ اور عاقل بالغ انسان کے عالم کے باقی ہر عالم میں یہ فعل جائز ہے۔ یعنی سوتے ہوئے باپ کا گلا اگر نابالغ بچہ کاٹ ڈالے تو اس کو پھانسی نہیں ہوگی۔ یا خدا مار ڈالے یا دکھ دے کوئی برا نہیں کہے گا۔ تو عاقل بالغ انسان کے علاوہ کائنات میں یا کائنات سے باہر خالق کائنات میں یہ حکم کسی جگہ نہیں لگے گا۔ محسن کشی عاقل بالغ انسان میں بری ہے۔ اور سب جگہ صحیح ہے۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کو کشتی والوں نے بلا ٹکٹ کشتی میں بٹھا لیا۔ خضرؑ نے کشتی توڑ دی تو یہ محسن کشی ہوئی۔ تو موسوی عالم کے اصولوں پر یہ پرکھا جائے گا تو یہ غلط اور برا ٹھہرے گا۔ لیکن عالم خضری میں وہ فعل صحیح ہے۔ اسی طرح عقلی چیزوں کو روحانی چیزوں پر پرکھا جائے گا تو سب غلط ہوں گے۔ یہ اصل میں اصول شیطانی ہے کہ اس نے عالم مخلوق کے قانون کو عالم خالق کے قانون پر منطبق کر دیا مخلوق کے احکام میں یہ پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں ہے۔ خالق کے احکام میں یہ سوال ناجائز ہے۔ تو کیوں والے حکم کو اس نے نہ کیوں والے حکم میں شامل کر دیا۔ یہ غلطی کی اس نے یہ ذہن سے نکلی ہے۔ اسی کا نام شیطنت ہے۔ کیونکہ اس عالم کیوں میں جب سوال کیا جائے گا تو وہ تمام کے تمام خالق کے فعل پر منطبق ہوں گے۔ یہاں جو فعل ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے اسباب ہیں۔ کیوں کے جواب میں وہ سب آئیں گے۔ جب اس کا فعل آ جائے گا۔ وہاں کیوں کا سوال ختم ہو جائے گا وہ جو پہلا فعل ہوگا۔ وہ بے علت ہوگا۔ تو وہ اسباب جو

کیوں کے جواب میں آئیں گے جب خدا کے فعل پر منطبق ہو جائیں گے۔ تب اطمینان ہو گا۔ تو وہ جو فعل بے علت ہے اسی کا نام خدا کا فعل ہے گرم روئی کپڑے میں لپیٹ لیں کپڑا گرم ہو جائے گا۔ اب جب سوال ہو گا کیوں گرم ہے تو گرم روئی جواب ہو گا۔ پھر روئی پر بھی یہی سوال ہو گا تو کہا جائے گا گرم توے پر اتری ہے توے میں سوال ہو گا تو جواب اس کا آگ ہو گی۔ اب آگ پر سوال نہیں ہو گا۔ کہ آگ کیوں گرم ہے بس یہاں آ کر اطمینان ہو جائے گا۔ اور آگ جو ہے وہ اللہ کا فعل ہے۔ تو جب اللہ کا فعل آ جائے گا اطمینان ہو جائے گا۔ تو اللہ کے ذکر سے قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ زمین آسمان سورج یہ سب اللہ کے فعل ہیں۔ اگر سورج کو کوئی کہے یہ سورج نہیں ہے۔ تو اس کو پاگل دیوانہ ہی کہیں گے۔ یہ یقین یقین جو کہتے ہیں۔ کیا ہے۔ اللہ کا فعل جب آ جاتا ہے تو دل کو یقین ہو جاتا ہے۔ اور جب یقین ہو جاتا ہے۔ تو قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو جس طرح اللہ کے فعل پر یقین ہے۔ اگر ایسا ہی ہے کہ ایک آپ اشارہ سے پانی طلب کریں۔ اشارہ آپ کا فعل ہے۔ اس میں امکان ہے کہ مقصد سمجھ میں نہ آئے اگر صاف طور پر آپ کہیں پانی لاؤ۔ تو کوئی شبہ نہیں رہتا۔ تو قول فعل سے زیادہ قوی ہے اور یقین ہونے کے بعد جس طرح آپ ہر شے کو اللہ کے فعل پر منطبق کرتے ہیں اور جو منطبق نہ ہو اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر خدا کے قول پر یقین ہو جائے تو بدرجہ اولی ہر شے اس کے قول پر پرکھیں گے اور وہی آپ کے رد یا قبول کی معیار بن جائے گا۔ تو ہر شے اسی کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ اب آپ اس کی بڑائی بیان کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(بقرہ ـ ۲۳۸ ـ ۲۴۲)

حفاظت کرو نماز کی اور بیچ کی نماز کی اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کے سامنے مطیع اور فرمانبردار ہو کر، پھر اگر کسی چیز سے ڈر ہو تو پیدل نماز پڑھ لو یا تم اپنی اونٹ کی سواری پر نماز پڑھ لو۔ اور تم جب مطمئن ہو جاؤ اطمینان سے ہو جاؤ نڈر ہو جاؤ تو پھر اللہ کا ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا ہے۔ جب کہ تم نہیں جانتے تھے تم میں سے جو لوگ وفات پا گئے بیویاں چھوڑ گئے ان کو چاہیے وہ اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر دیں ایک سال کی متاع اس شرط پر کہ وہ نکلے نہیں باہر پھر اگر وہ نکلے جائیں گھر سے پھر تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے معاملات میں جو اپنے بارے میں معروف اور شرع کے مطابق طریقے پر کریں۔ یعنی نکاح وغیرہ۔ اللہ زبردست حکمت والا ہے اور تمام مطلقاؤں کیلئے متاع ہے۔ شریعت کے مطابق دستور کے مطابق اور ثابت ہے اور واجب ہے ان لوگوں پر کہ جو خدا سے ڈرتے ہیں یا کفر گناہ اور معصیت سے پرہیز کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالےٰ تمہارے واسطے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو سمجھو۔

حافظوا۔ حفاظت کرو۔ یا تو معنی ہیں یا یہ لفظ جو آیا کرتا ہے۔ حافظ باب مفاعلت کا۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کی حفاظت کرو۔ تم نماز کی حفاظت کرو خدا تمہاری حفاظت کرے گا یا نماز تمہاری حفاظت

کرے گی۔ نماز تمہاری حفاظت یہ کرے گی کہ تمہیں گناہوں سے اور منکر اور فحش باتوں سے روک دے گی اور پھر نماز روز جزا شفاعت کرے گی اور کیونکہ نماز میں قرآن شریف ہے یہ پل صراط پر ٹھہر جائیگا۔ جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور خاص کر سورۂ بقرہ سورۂ آل عمران کہ یہ جہنم کو ڈانٹ دیں گی روک دیں گی کہ وہ اس تک نہ پہنچیں۔ اور یا حٰفظوا۔ کے حفاظت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے جو ظاہری اسباب ہیں اور باطنی ان تمام اسبابوں کا لحاظ رکھو۔ ظاہر میں یہ معنی ہیں کہ جگہ پاک ہو۔ بدن کپڑا پاک ہو ستر چھپی ہوئی ہو۔ جگہ کسی کی غصب کی ہوئی نہ ہو۔ باطنی کی حفاظت یہ ہے کہ نیت خالص صرف اللہ کے لئے ہو، ساکت اور ثابت ہو اور جس جگہ سجدہ کیا جاتا ہے ادھر نظر رہے اِدھر اُدھر نہ دیکھے۔

یہ تمام محافظت کے ذرائع ہیں اور یہ چونکہ بہت بڑی عبادت ہے۔ شاید جتنی عبادتیں اسلام نے فرض کیں ہیں۔ ان سب سے بڑھیا عبادت ہے اور اس کے علاوہ جو عبادتیں ہیں ان میں سے صرف ایک عبادت جو مالی ہے۔ اس کو مستثنیٰ کر دیں تو کُل عبادتوں کو یہ محیط ہے یعنی توحید لا الٰہ الا اللہ اس کے اندر ہے تسبیح اس کے اندر ہے۔ درود شریف اس کے اندر ہے۔ خدا کی تمام صفات اس کے اندر ہیں۔ تلاوت قرآن اس کے اندر ہے۔ اور تمام جتنے بھی موانع ہیں خواہش کے سب متروک ہیں۔ نہ اِدھر اُدھر دیکھ سکتا ہے۔ نہ زبان سے بول سکتا ہے۔ تمام جتنی بھی عبادتیں بدنی ہو سکتی تھیں ان سب کا مجموعہ ہے۔ صرف مالی عبادت اس میں نہیں ہے باقی کل عبادتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز کا ذکر آتا ہے۔ یہی آتا ہے۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ دونوں کو ساتھ لاتا ہے تاکہ وہ تمام عبادتوں کا مجموعہ بن جائے۔ یہ کہیں

نہیں کہا کہ نماز کی حفاظت کرو۔ یا نماز کو ادا کرو حفظوا الصلوٰۃ یا اقیموا الصلوٰۃ
یا یہ نہیں کہا کہ اقیموا الصلوٰۃ واتموا الحج نماز پڑھو اور حج کرو یہ نہیں کہا بلکہ صلوٰۃ اور
زکوٰۃ اس لئے کہ زکوٰۃ مالی عبادتیں جتنی بھی ہیں ان سب پر وہ محیط ہے اور سب سے
بہتر عبادت ہے۔ اور باقی بدنی جتنی عبادتیں ہیں اور قلبی جتنی عبادتیں ہیں وہ سب
اس میں موجود ہیں۔ اس لئے جامع لفظ بولا جاتا ہے نماز اور زکوٰۃ تو گویا پوری اسلامی
عبادتوں کو یہ دو لفظ محیط ہیں۔ اب نماز کیا ہے۔ نماز کے متعلق آپ دیکھئے کہ حج میں جو چیز
ہیں وہ اس کے اندر موجود ہیں۔ جیسے احرام ہے اس میں تکبیر تحریمہ موجود ہے۔ تکبیر تحریمہ کے بعد جو چیزیں
ممنوع ہیں سب سے بچنا پڑتا ہے جس طرح احرام باندھنے کے بعد ممنوعات سے بچنا پڑتا ہے
اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد تمام ممنوعات سے بچنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس
سے بھی زیادہ ہے احرام میں بات چیت کر سکتے ہیں نماز میں بات چیت بھی نہیں کر سکتا
احرام میں کھا پی سکتا ہے۔ نماز میں کھا پی نہیں سکتا۔ روزہ اس کے اندر موجود ہے
کیونکہ روزہ میں صرف کھانے پینے کی ممانعت ہے اس کے علاوہ ترک کلام اور ادھر
ادھر دیکھنا ہے سب چیزوں کی ممانعت ہے۔ اس میں بھی کھانے پینے کی ممانعت ہے۔ ہر عبادت
سے ہر عبادت کے اعتبار سے یہ جامع اور افضل ترین چیز ہے اور یہ شروع ہوتی ہے دو ہاتھ اٹھانے
سے آپ جانتے ہیں کہ امام اور تمام نماز پڑھنے والے کان کی لو تک دو ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

تو یہ اصل میں کنایہ ہے کنایہ کہتے ہیں شے کے لازم کا ذکر کرنا جو شے لازم ہو
کسی شے کو اس لازم کا ذکر کرکے اس کے ملزوم کو بولنا تو یہ درحقیقت کنایہ ہے بے
رخی سے نفرت سے بے اعتنائی سے جب دونوں ہاتھ اٹھائے تو اس کے معنی یہ ہوئے
کہ یہ جہان یعنی یہ دنیا اور وہ جہان یعنی عقبیٰ ان دونوں سے ہاتھ اٹھالئے نہ نیچے

اس کی کچھ پرواہ ہے نہ اس کی کچھ پرواہ ہے دونوں کی خواہش کو میں نے ترک کر دیا۔ اور کیوں ترک کر دیا؟ کہ اللہ اکبر۔ کیونکہ اللہ جو ہے ان دونوں جہانوں سے بڑا ہے اور بڑے کے سامنے چھوٹے کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا۔ تو جتنی خواہشات دنیا کی اور جنت کی ہیں ان سے میں نے قطع تعلق کر لیا ہے۔ یعنی عبادت جو ہوتی ہے صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے جہنم سے بچنے کے لئے نہیں ہے یا جنت کو حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے حور و قصور کے حاصل کرنے کے لئے نہیں یہ صرف خدا کی ہی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہے اور اگر کسی اور مقصد کے لئے ہوگی تو وہ شرک ہوگا۔ محض خدا کے لئے عبادت ہے۔ لوجہ اللہ وجہ کے معنی ہیں منہ۔ اس کی عنایت کے لئے اس کی نظر کرم ہماری طرف پڑے اور وہ خوش ہو جائے۔

جب خواہشات کی گھاٹی کو ترک کر دیا اور اللہ اکبر کہا تو اللہ تعالیٰ کی کبریائی جو ہے۔ اس کی تجلی ہوئی۔ اگر صحیح نماز، قاعدہ کے مطابق پڑھے تو ایک ہی نماز کافی ہے تمام نفس کی اور عالم کی اصلاح کے لئے۔ تو جب قاعدہ یہ ٹھہرا نہ کہ اللہ اکبر دونوں جہاں سے جب قطع نظر ہو گئی تو کسی چیز کی طرف التفات باقی نہ رہا بالکل فنائے عالم ہو گیا۔ اب صرف خالق عالم ہی کی طرف توجہ رہ گئی تو اکبر کہا۔ تو اکبر کے معنی ہیں اکبر من کل شی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے اور اس کی بڑائی کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ جتنا بڑا ہے وہ۔ تو اب جب اسکی بڑائی اور کبریائی کی تجلی اس کے دل پر پڑی اور روح پر پڑی تو روح اس کی کبریائی کی برداشت نہ کر سکی جیسے شمع ہوتی ہے۔ موم کی بتی ہوتی ہے اسے آگ کی لو پر رکھیں تو کچھ دیر وہ ٹھہرے گی اور اس کے بعد وہ برداشت نہیں کرے گی۔ جھک جائیگی اسی طرح جب کبریائی کی تجلی ہوئی تو وہ اس کو برداشت نہیں کر سکا۔ کچھ دیر کے بعد اس کو ناقابل برداشت

سمجھ کر جھک گیا۔ تو خواہش کی جو گھاٹی ہے۔ اس کو عبور کر گیا خواہش کا جو گڑھا تھا بربادی کی جو چیز تھی اس گڑھے سے وہ نکل گیا اور نکل کر جھک گیا جھکنے کے یہ معنی ہوتے ہیں جتنا علو و تکبر تھا اور تکبر کی اور شہوت کی جو گھاٹی تھی اس سے گذر گیا جھکنے کے یہ معنی ہیں۔ اب جب وہ جھک گیا تو پھر جو لگی ہے تو بعض اوقات جسطرح وہ جھکی ہوئی تو ذرا سا اونچا اور کر دیتی ہے اس کو یہ پھر دوبارہ اونچا ہو جاتا ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا۔ پھر ایک دم گر پڑتا ہے۔ بس یہی معنی سجدہ کے ہیں سجدہ میں جا پڑا۔ وہ قیام سے خواہش اور شہوت کی گھاٹی سے نکل گیا۔ اب جو پھسل کر گرا ہے کے اوپر یہی سجدہ ہے تو یہ ہوا کی گھاٹی سے نکل گیا جو سب سے زیادہ مہلک گھاٹی ہے ہوا کی اور خدا کا دشمن جو ہے اس کائنات میں صرف ہوا ہے۔ ہوا کس کو کہتے ہیں افرئیت من اتخذ الٰہ ھواہ ۔ بھلا دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے اپنی ہوا کو اپنا (جاثیہ ۔ ۲۳) معبود بنا کر رکھا ہے۔ ہوا کس شے کا نام ہے ایک تو خواہش ہوتی ہے۔ جیسے آدمی یہ کہے کہ اچھا کھا لوں۔ اچھا پی لوں یا یہ مکان لے لوں ایک یہ کہ میرے برابر کوئی نہیں ہے۔ یہ غرور تکبر شہوت اور ایک یہ کہ میری رائے یہ ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے میں جو کہوں وہ ٹھیک ہے میری رائے یہ ہے میں بھی ایک رائے رکھتا ہوں۔ نہ قرآن کو نہ حدیث کو نہ خدا کو نہ نبی کو یا کسی بڑے کو کسی کو نہیں مانتا اپنی رائے کو ظاہر کرنا ہے یہ معنی ہیں ہوا کے۔ ہوا کا یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی آپ سمجھ لیں کہ ہوا یہ ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ نبی صلی اللہ (نجم ۔ ۳-۴) علیہ وسلم اپنی رائے سے نطق نہیں کرتے۔ بولتے نہیں بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں۔ مجدد صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب اور اکابر ائمہ سے میں یہاں ذرا سی ان کے

بھول ہوئی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نطق یہ قرآن ہے۔ قرآن کے علاوہ نبی اپنی خواہش
سے بول سکتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے اس لئے کہ یہ جو فرمایا کہ "وہ اپنی خواہش سے رائے
سے نطق نہیں کرتے وہ صرف وحی کہتے ہیں جو ان کی طرف وحی کی گئی ہے وہ نطق جو
ہے وہ وحی ہے تو اب اگر اس نطق سے قرآن مراد ہوگا۔ کہ قرآن اپنی خواہش سے
بیان نہیں کرتے۔ تو اوپر قرآن کا ذکر ہونا چاہیے عن الھواہ کی جو ضمیر ہے "نہیں
ہے وہ" وہ کون؟ ضمیر کسے کہتے ہیں۔ مانقدما جس کا اوپر ذکر ہو جائے
لفظاً یا معناً یا حکماً تین طریقوں سے اوپر مرجع کا ذکر ہوا کرتا ہے۔ جب جا کے وہ
ضمیر آتی ہے تو "ہواہ" کی ضمیر کس طرف پھر رہی ہے۔ اوپر قرآن کا کہیں ذکر نہیں ہے
لفظ نہیں ہے۔ یہ تین آیتیں ہیں۔ وہاں قرآن کا نام نہیں ہے۔ تو اب جو یہ کہا کہ
نہیں ہے وہ تو کیا نہیں ہے وہ یہ "ہواہ" کی ضمیر نطق کے مصدر کیطرف پھر رہی ہے
یہ معناً ضمیر نطق کی طرف پھر رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق ہے وہ ان کی رائے
خواہش سے نہیں ہے۔ اور یہ جو قرآن ہے (یہ نکتہ ہے۔ نئی بات ہے) تو یہ قرآن تو نبی
کا نطق ہے ہی نہیں۔ یہ تو خدا کا نطق ہے۔ تو نبی کا نطق وہ ہوگا جو اس کے علاوہ
ہوگا۔ اور اس کے علاوہ جو وہ نطق کرتے ہیں۔ وہ وحی ہے بڑی اچھی بات ہے۔ تو
ہوا کی گھاٹی جو مہلک ہے جب کہ زمین پر گر پڑا تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ ہوا کی گھاٹی
سے نکل گیا۔ تین ہی مہلک گھاٹیاں ہیں۔ شہوت کی۔ غضب کی اور ہوا کی تینوں
گھاٹیوں سے نکل گیا اس نماز میں۔ قیام، رکوع اور سجود، یہ تین چیزیں جو ہیں۔ تینوں
مہلک گھاٹیوں سے نکال دیتی ہیں تو اب امن ہو گیا۔ اب گھبراہٹ اور پریشانی
کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اس کو حکم ہوا کہ تو دربار میں بیٹھنے کے قابل ہے۔ ہماری

محفل میں آؤ اور بیٹھ جاؤ۔ تو نہیں مہلک گھاٹیوں سے یہ نکل گیا اور محفل میں دربار الٰہی میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی یہی معراج ہے نماز جو ہے مومن کی معراج ہے جب اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہے اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ بیٹھنے کی اجازت مل گئی اب وہ بیٹھ گیا۔ تو اب اس نے اس کی تعریف شروع کر دی۔ التحیات للہ والصلوٰۃ والطیبات ۱ اب جب اللہ پاک کی تعریف کرنی شروع کر دی تو ادھر سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول ہوا اور اس کا عروج اوپر کی طرف ہوا۔ اب اس کی معراج ہو رہی ہے۔ اب یہ عروج کی طرف چلا کیوں کہ اس کو اجازت مل گئی وہ ان گھاٹیوں سے نکل گیا اس کے دربار میں حضوری کی اجازت مل گئی اب دونوں ایک جگہ مل گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نماز کا پڑھنے والا جو بھی یہ نبی سے ملا تو اس نے کہا السلام علیک یا ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اگر آپ قاعدہ میں نماز پڑھیں تو یہ آنکھوں سے نظر آجائیگا دل پر جو شرع نے بتایا ہے یہ دل پر آپ کو اسطرح نظر آجائیگا جسطرح آپ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ تو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ ملاقات کرتے ہی ان پر سلام بھیجا تو انہوں نے السلام علیک نہیں کہا بلکہ جواب دیا کہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کیوں کہ آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں سلامتی تجھی ہی پر نہیں ہے۔ اے معراج میں آنے والے بلکہ سلامتی ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر تجھ پر بھی اور ہم سب پر۔ اب اتنے بلند تقرب کو دیکھ کر ملائکہ کو حیرت ہوگئی تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے اتنی معراج اور عروج تجھے کس بنیاد پر ہوا تو اس نے کہا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ و رسولہ۔ مجھے اس بنیاد پر یہ عروج ملاقات کی بدولت یہ معراج ہوئی۔ تو پھر ملائکہ

نے کہا کہ اتنی بڑی معراج اس نبی کی بدولت تجھے ملی. کیا نذرانہ اور تحفہ پیش کیا تو نے کیا کچھ کیا؟ اس نے کہا۔ اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم الخ درود شریف کا تحفہ پیش کیا اب یہ حال دیکھ کر ملائیکہ میں چرچا ہوا اور شور مچا اور جوق در جوق ملائیکہ اس کے جسمانی جُثّہ کو دیکھنے نازل ہو گئے۔ تمام کائنات کے کہ یہ ایسا بندہ ہے جونہی ملائیکہ کا نزول ہوا جوق در جوق ملائیکہ آئے اس کو دیکھنے کے لئے اسکی زیارت کیلئے۔ تو اس نے سیدھی طرف دیکھ کر کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ اور بائیں طرف دیکھ کر کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ یہ ہے نماز قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون (مومنون-۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلاح پائی کامیاب ہو گئے۔ فلاح کے معنیٰ ہیں مقصود کا حاصل ہو جانا یا خیر و خوبی کیساتھ وقت گذر جانا باقی رہنا تو خیر و خوبی کے ساتھ باقی رہیں گے مقصود جو ان کو مطلوب ہے وہ حاصل ہو جائیگا۔ کس کو ان مؤمنوں کو ان مسلمانوں کو کہ جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔ خشوع کے معنیٰ ہیں جھکنے کے یعنی دل سے توبہ کرتے ہیں۔ دل اسی طرف لگا دیتے ہیں۔ اور اپنے مونڈھوں کو جھکا دیتے ہیں۔ اور روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ خشوع کو خضوع لازم ہے جھکنا۔

اب یہاں علمی ضابطہ ہے اسے سمجھ لیں آپ کہ جب وصف پر حکم مرتب ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شے مقید ہو۔ اور اس مقید پر کوئی حکم لگایا جائے تو وہ حکم درحقیقت اس مقید کی قید کا ہوتا ہے۔ جیسے یہ ڈاکٹر یہ کہے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیجیو۔ ٹھنڈا پانی مضر ہے۔ تو پانی تو مطلق تھا اور ٹھنڈا پانی مقید ہوا اس مقید پر حکم لگا مضرت اور نقصان کا ٹھنڈا پانی مضر ہے۔ اس کے معنیٰ کیا ہوئے

کہ مضرت درحقیقت ٹھنڈک میں ہے۔ ورنہ مطلق پانی گرم پانی میں بھی پانی موجود ہے۔ وہ مضر نہیں ہے تو معلوم ہوا اصل مضر چیز جو ہے وہ ٹھنڈک ہے۔ یہ مجتہدین کے ہاں کا قاعدہ ہے۔ تو مقید پر حکم مرتب ہو گا وہ قید کی طرف رجوع ہو گا۔ تو یہاں حاصل معنیٰ افلح المؤمنون فی صلوٰتھم خاشعون مؤمن کامیاب ہو گئے فلاح پا گئے اور خیر و خوبی اور خیریت سے باقی رہیں گے۔ کون سے مؤمن جو مقید ہیں اس بات کے ساتھ کہ جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں وہ کامیاب ہو گئے تو کامیابی کا حکم مرتب ہوا اس مقید پر جو مؤمن ہیں۔ اور جسکی قید خشوع صلوٰۃ اور خضوع نماز ہے۔ وہ علت فلاح ہے نتیجہ یہ نکلا خشوع علت فلاح ہے۔

اور وجہ اس کی کیا ہے۔ یہ کیوں علت ہے فلاح کی یہ میں کہتا ہوں کہ یہ علت کامیابی کی یوں ہے کہ یہ ایسا جوہر نادر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کسی جگہ بھی نہیں ہے۔ نایاب چیز تھی تو جب یہ اس کے سامنے پیش ہوئی تو وہ خوش ہو گیا۔ تو اس نے اپنے سارے خزانے اس کے حوالے کئے۔ یعنی یہ خشوع اور خضوع جو ہے وہ علت فلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے گودام کے گودام بھرے ہوئے نہ ہوں میرے پاس وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۝ (حجر۔ ۲۱)

یہ ایک چیز ہی ایسی ہے جو نایاب ہے۔ اس کے خزانے میں اللہ کے پاس نہیں ہے۔ ازل سے ابد تک اب جو بندہ نے یہ چیز پیش کی تو اسے یہ چیز پسند آئی تو اس نے اپنے سب خزانے اس کے حوالے کر دئے کہ تو ایسی نایاب

چیز لایا ہے جو میرے پاس نہیں۔ یہ معنیٰ ہیں حفاظت نماز کے۔

سب سے بڑی چیز نیت ہے۔ نیت کے کیا معنیٰ ہیں یعنی توجہ ہونی چاہیے کہ یہ فعل صرف اور محض اللہ کے لئے ہے یا محض لوجہ اللہ ہے۔ اور کوئی اس میں نیت نہ ہو نہ لوگوں کا دکھانا ہو نہ بھول ہو نہ غفلت ہو۔ کیونکہ اگر غفلت میں کرے گا تو درحقیقت وہ اس کا نذرانہ نہیں رہنے کا۔ برا ہوگا۔ ادا تو نماز ہو جائے گی۔ ادا ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ دوبارہ اس کو قضا نہیں پڑھنی پڑے گی۔ جیسے کوئی شخص آپ کے روپے قرض لے گیا اور کسی گندی چیز میں باندھ کر اسے آپ کے منہ پر مارے قرضے تو وہ ادا ہو جائیگا لیکن لعنت کا مستحق ہوگا اور نفرت سے دیکھا جائیگا اسی طرح جو شخص بغیر نیت کے یا غیر اللہ کی نیت کرکے بے قاعدہ ادا کرے گا۔ تو وہ نماز تو بے شک ادا ہو جائے گی۔ لیکن وہ عتاب کا مستحق ہوگا۔ اس لئے تو حکم ہے کہ رو اور رونا نہ آئے تو رونے والے کی سی صورت بناؤ۔ انہی عاجزی پسند ہے۔ اللہ کو اور اس نے جو اپنے بندوں کی تعریف کی ہے۔ روتے ہوئے میرے سامنے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ بس وہی تو میرے بندے ہے۔

حفظو علی الصلوٰۃ۔ حفاظت کرو تم خود نمازوں کی محافظت کے معنیٰ میں ہے۔ تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم نماز کی حفاظت کرو۔ نماز تمھاری حفاظت کرے گی۔ یا تم نماز کی حفاظت کرو اور جس نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے وہ تمھاری حفاظت کرے گا۔

اور یہ لازمی چیز ہے۔ حسی چیز ہے۔ میں دوکان پر بیٹھا ہوا ہوتا ہوں

لوگ کہتے ہیں کہ میرا فلاں کام کرا دو۔ میں کہتا ہوں کہ دو کان اکیلی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں دیکھتا رہوں گا آپ جائیے میرا کام کرا دیجئے۔

جب بندہ خدا کے کام میں لگ جاتا ہے تو وہ غافل ہو جاتا ہے اپنے کام سے تو اتنی دیر خدا اس کا کام کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ ایک سیکنڈ کے ننھے حصہ میں بھی آپ کے کام میں لگ گیا۔ تو ابد تک کی شہادت ہو گئی۔

حٰفظوا علی الصلوٰۃ۔ حافظوا جمع کا صیغہ ہے۔ ظاہری حفاظت کا طریقہ تو سمجھ گئے کہ ستر ڈھکا ہوا ہو۔ ناپاکی کی جگہ ڈھکی ہوئی ہو۔ کپڑا پاک ہو جگہ پاک ہو۔

حافظوا علی الصلوٰۃ، صلوٰۃ، صلاۃ کی جمع ہے۔ یعنی نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور بیچ کی نماز کی حفاظت کرو۔

علماء کرام نے پانچ وقت کی نماز اس آیت سے نکالی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ نمازوں کی حفاظت کرو تو جمع کا صیغہ ہے تو جمع کا صیغہ کم سے کم تین کے لئے بولا جاتا ہے۔ کم سے کم تین تو یہ ہو گئیں اور پھر اس کے اوپر عرض کیا کہ اور بیچ کی نماز تو بیچ کی نماز ان تین سے علیحدہ ہے۔ تو بیچ کی نماز کا تحقق ہونا چاہیے تو اب اگر وہ "صلوٰۃ وسطیٰ" ایک ہو گی تو تین یہ اور ایک یہ چار ہو گئیں تو بیچ نہیں رہے گا۔ لہذا دو اور ملنا چاہئیں ان کے ساتھ پانچ جب ہو جائے گی۔ تب بیچ کی نماز کا تحقق ہو جائے گا۔ یہ علماء اکرام نے فرمایا۔ اس میں میری کوئی رائے نہیں ہے۔ جو انہوں نے فرمایا وہ میں نے آپ کے سامنے نقل کر دیا۔

اب رہ گئے اوقات تو اوقات متعدد آیتوں سے نکالے ہیں اقیموا الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل والقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشہودا (اسراء-۸۰)

نماز پڑھ زوال شمس سے رات کے اندھیرے تک۔ چاروں نمازیں ہو گئیں اس میں یعنی جب زوال ہو جائے شمس کو یعنی سر کے اوپر سے ہٹ جائے تو ہٹنے کے بعد جو نماز ہو گی وہ ہو گی ظہر کی عصر کی مغرب کی کب تک الیٰ غسق اللیل رات کے گہرے اندھیرے تک وہ عشاء تک آگیا اور ان قرآن الفجر کان مشہودا وہ صبح کو ہو گیا تو پانچوں نمازیں اس آیت سے نکالی ہیں اور فسبحوا بکرۃ واصیلا اللہ کی تسبیح کرو جب شام ہو جائے اور جب صبح ہو جائے اور رات کو اور جس وقت کہ ظہر ہو۔ پانچوں نمازیں اس آیت سے بھی نکالیں اور بھی کئی آیتیں ہیں جن سے پانچوں نمازوں کے وقت نکالے۔ صلوٰۃ الوسطیٰ بیچ کی نماز کون سی ہے اس میں سات آرائیں ہیں علماء کرام کی۔ ایک جماعت تو کہتی ہے کہ بیچ کی نماز کا اللہ نے تعین نہیں کیا پتہ نہیں کون سی ہے اور یہ کہا کہ بیچ کی نماز کی حفاظت کرو اور تعین یوں نہیں کیا کہ اگر یہ معلوم ہو جائیگا تو بیچ کی نماز کی حفاظت کریں گے۔ اور پابندی کریں گے اور باقیوں کیساتھ لاپرواہی ہو جائیگی۔ جیسا کہ اللہ پاک نے ایک رات رمضان کے مہینہ میں ایسی رکھی ہے۔ جو ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ لیکن اس کا تعین نہیں کیا کہ وہ کون سی رات ہے۔ اس رات کو حاصل کرنے کے لئے بندہ ہر رات عبادت کرے گا۔ وہ رات کو پا لے گا۔ تو جس نے پانچوں نمازوں کو ادا کر لیا۔ تو اس نے بیچ کی نماز کو ادا کر لیا۔ اس لئے بیچ کا لفظ بولا ہے کہ لوگوں کو شوق ہو۔ رغبت ہو اور ہر ایک کو پورا پورا ادا کریں ایک علما کی جماعت تو یہ کہتی ہے۔

اور ایک جماعت علماء کی یہ کہتی ہے کہ

مذہب میں جو سب سے بڑی چیز ہے لا الہ الا اللہ، کلمہ ہے ستر سے کچھ اوپر ہیں۔ ایمان کے شعبہ۔ سب سے اول جو ہے توحید اور سب سے کم جو ہے وہ ہے راستے سے کانٹا یا گندی چیز کو ہٹا دینا۔ اور نماز جو ہے ان دونوں کے بیچ میں ہے اس لئے کہدیا کہ پانچوں نمازیں پڑھو۔ یہ پنجگانہ نماز ہی بیچ کی نماز ہے۔

اور پانچوں رائیں پانچوں وقتوں کے ساتھ ہیں۔ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ وہ صبح کی نماز ہے۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ ظہر کی ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ عصر کی ہے کہ جب غزوۂ خندق میں آپ کی عصر کی نماز قضا ہوئی تو رسول کریمؐ نے بددعا دی کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبریں آگ سے بھر دے کہ انھوں نے بیچ کی نماز ہم سے گنوا دی۔

ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ عشاء کی نماز ہے۔ اس کی بڑی تعریف آئی ہے۔

بیچ کی نماز کے دلائل اور بیچ کی نماز کی فضیلتیں بیان کر کے وہی نماز مراد لے لی۔ یعنی بیچ کی نماز کا حکم ہے اور تاکید ہے تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ تاکید اسی شئے کی ہوتی ہے جو زیادہ اچھی ہوگی جس کے خیال میں جس نماز کی زیادہ خوبیاں معلوم ہوئیں وہ بیان کر دیں۔

باقی میرے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ ٹھیک نہیں ہے۔

اس لئے کہ اگر آپ پانچ نمازوں کی گنتی نکالتے ہیں۔ صلوٰۃ اور صلوٰۃ وسطیٰ۔ تو صلوٰۃ وسطیٰ جو ہے اس پورے مجموعے کا جز ہوگیا الگ نہ رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح سے نماز وسطیٰ کی تاکید ہے اس سے بہت

زیادہ قوی پہلی چیز کی ہونی چاہیے۔ کیونکہ حافظوا کا لفظ صلوٰۃ پر آیا ہے۔ حفاظت کرو نمازوں کی اور اس کی تو دوسری چیز جو ہے اس سے ذرا گھٹیا ہونا چاہیے یا زیادہ سے زیادہ برابر سہی۔ تو مقدم یہ ہے کہ جس طرح حفاظت صلوٰۃ وسطیٰ کی آئی ہے اسی طرح صلوٰۃ کی آئی ہے، تو دونوں برابر ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں اللہ نے فرمایا کہ حافظوا علی الصلوٰت اگر وہ اتنا ہی کہہ دیتا تو یہی محافظت کی چیز ہوتی اب یہ کہا کہ نمازوں کی حفاظت کرو اور بیچ کی نماز کی حفاظت کرو تو یہ بعد میں لایا۔ اگر اس کی اہمیت ہوتی تو یہ کہتا کہ حافظوا علی الصلوٰۃ وحافظوا علی الصلوٰۃ الوسطیٰ تب بھی جا کر برابر ہوتا۔ اولیت نہ ہوتی۔

تو یہ جتنی رائیں ہیں۔ یہ سب کچھ زیادہ صحیح نہیں ہیں۔

اگر اس خیال سے نہیں بتایا کہ وہ بیچ کی حفاظت کرے گا اور باقی کی نہیں کریگا تو جس بنیاد پر اس کی حفاظت کرے گا۔ اسی بنیاد پر ان سب کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ اور آج تک کسی کتاب میں ان سات کے علاوہ کوئی مضمون نہیں آیا۔ ساتوں رائیں جو ہیں مشکوک ہیں۔ اور صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ مسئلہ کی عقلی۔ یقینی اور ظنی دلیل کافی نہیں ہے۔ اور اگر کفایت کرتے ہو ظنی دلیل پر تو زیادہ سے زیادہ صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق آئی ہے اور وہ عصر کی نماز ہے۔

باقی چار ختم ہو جاتی ہیں۔ تو پھر یہ مسئلہ ظنی رہا۔ عقلی نہیں رہا۔ تو بیچ کی نماز عصر کی ہے ظناً۔ یقینی بات نہ رہی۔ تو پھر کیا معنی ہوتے، حفاظت کرو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی۔

مطلب یہ ہے جو میں سمجھا ہوں کہ حفاظت کرو نمازوں کی۔ مطلق نماز۔ بغیر کسی

خصوصیت کے ہر نماز کی حفاظت کرو۔ ہر نماز کی حفاظت کرنی چاہیئے اور صلوٰۃ وسطیٰ، وسطیٰ کے معنی عمدہ۔ جو عمدہ ہے۔ بہترین ہے زیادہ اچھی نماز ہے وہ کونسی نماز ہے۔ وہ نماز فرض ہے۔ یعنی نفلی نماز ہو۔ چاشت کی نماز ہو۔ تہجد کی نماز ہو۔ اشراق کی نماز ہو۔ مانی ہوئی نماز ہو۔ اور خاص کر جو فرض نماز ہیں ان کا بڑا اہتمام کرو۔ یعنی فرض نماز کی حفاظت کرو خاص طور پر۔

اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کے سامنے۔ قانت، قنوت سے مشتق ہے۔ قنوت کے معنی ہیں ذکر اور دعا کے۔ اللہ کا ذکر کرو۔ اللہ سے دعا کرو اور ایک قنوت کے یہ معنی ہیں کہ کامل اطاعت کرو۔ نہایت مطیع ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ نماز میں بات چیت نہ کرو۔ اشارا نہ کرو۔ اور ایک قنوت کے معنی دوام کے ہیں۔ کہ اول سے لے کر آخر تک پوری نماز میں خدا کی طرف توجہ کرو۔ دل کو ادھر ادھر نہ لگاؤ اور یہ جب ہو گا کہ جب تم اپنے طور پر یہ سمجھ لوگے کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور جو خدا کے سامنے ہو تو کس کی مجال ہے جو ادھر ادھر دیکھے۔ اور اگر تمہارے دل میں اتنی روشنی اور قوت نہیں ہے کہ جو خدا کو دیکھو تو کم سے کم اتنا ضرور سمجھ لو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اور جب یہ خیال ہو جائے گا کہ کوئی تم کو دیکھ رہا ہے۔ تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ جیب کترا جیب کاٹنے کے وقت ایک سیکنڈ پہلے ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ خدا دیکھ رہا ہے تو جو وہ جیب کترا ہے جیب نہیں کاٹے گا اور اس سے غلط فعل اور وسوسے وغیرہ دل میں نہیں آنے کے جب اسے معلوم ہو جائیگا کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ فان خفتم فرجالا او رکبانا اگر تم کو ڈر ہے دشمن کا۔ یعنی اگر جہاد ہو رہا ہے۔ تو اس وقت کیا کرو۔

تو اب نہیں پڑھ سکتا نماز۔ تو فرمایا لڑ رہے ہو تو چلتے ہوئے نماز پڑھو۔ تو نماز پڑھنے میں کیا صورت ہوگی، زبان سے جو ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ زبان سے پڑھتا رہے۔ رکوع اور سجود نہیں کرنے کا۔ رکوع اور سجود کے لئے اشارہ کرے گا اور سواری پر ہے اونٹ کی یا گھوڑے کی۔ تو اونٹ کی سواری پر پڑھ لو۔ کوئی قبلہ کے استقبال کی ضرورت نہیں ہے کہ آیا ادھر قبلہ ہے یا نہیں۔ اگر کافر۔ دشمن۔ مشرک سے لڑائی ہو رہی ہے تو اس لڑائی کے ہنگامہ میں بھی نہ چھوڑو۔ اتنی اہمیت ہے نماز کی، اور ضابطہ میں ادا نہیں ہو رہی تو کم سے کم پیدل چلتے چلتے یا سواری پر بیٹھے بیٹھے اشارے سے پڑھ لو۔

اگر تمھیں ڈر ہے۔ دشمن کا ڈر ہے یا دشمن یا کافر کا نہیں ہے ویسے ہی کوئی مال لوٹنے آ رہا ہے اور قتل کرنے کی کوشش میں ہے وہ بھی اس میں شامل ہے یعنی جتنے بھی خوف ہو سکتے ہیں سب اس میں شامل ہیں ایک بات اور ہے یہاں کہ اگر تمہیں ڈر ہے کہ نماز قضا ہو جائے گی تو کھڑے ہی کھڑے اور سواری پر بیٹھے بیٹھے ہی پڑھ لو، تینوں معنی ہیں۔

فَاِذَا اَمِنتُم فَاذکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُم

اور جب مطمئن ہو جاؤ، نڈر ہو جاؤ، خوف جا تا رہے تو تم اللہ کا ذکر کرو اور نماز اسی طرح پڑھو جس طرح کہ اس نے تمہیں بتائی ہے۔ باقاعدہ نیت باندھو، رکوع اور سجود والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج اور جو لوگ تم میں سے مر گئے ہیں اور انھوں نے بیویاں چھوڑیں تو ان کو چاہئے۔ یہ محذوف ہے یہاں کہ ان کو

چاہیئے کہ وصیت کریں اپنی بیویوں کے لئے کہ وہ ایک برس تک کھانا پکانا، رہنا سہنا شوہر کے گھر میں رہیں باہر نہ نکلیں۔

ابتدائے اسلام میں یہی قانون تھا۔ یہی بات رائج تھی۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہوگئی اور منسوخ ہونے کے بعد یہ ایک سال رہنا سہنا، کھانا، کپڑا، یہ بھی منسوخ ہوگیا، اس کے بدلے میراث مقرر ہوگئی۔ ¼ شوہر کے مال میں سے اور ایک سال شوہر کے گھر قید رہنا اور عدت گزارنا یہ بھی منسوخ ہوگیا۔ اس کی جگہ چار مہینہ دس دن کی عدت اور حاملہ ہو تو وضع حمل تک۔

یہ جو آیت ہے منسوخ ہے۔ اور اس سے پہلے جو آیت تھی اس نے اس کو منسوخ کر دیا۔

یعنی یہ وصیت کی پہلی ابتدائے اسلام میں کہ اگر شوہر مر جائے حکم یہ دیا کہ وصیت کر جاؤ۔ یعنی مرنے والا کیا وصیت کرے گا۔ مرنے سے پہلے جب آثار موت کے ظاہر ہوں اور سمجھے کہ میں اب نہیں بچوں گا تو فوراً وصیت کر دے کہ میری بیوی ایک برس میرے مال میں سے کھائے پیئے اور ایک سال یہاں رہے تو اس کے بعد اللہ پاک نے فرمایا کہ جو وصیت ہے یہ واجب نہیں ہے اگر وہ وصیت کو توڑ کر نکل جانا چاہے اور دوسرا نکاح کر لے تو وہ کر سکتی ہے۔ اور وہ جو حکم ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آیتوں میں فرمایا ہے، اس سے یہ منسوخ ہوگیا۔

تمام علماء اور اہل اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ باقی یہاں دو گروہ ہیں۔ ایسے دو بڑے جید عالم وہ یہ کہتے ہیں۔ مجاہد نے یہ کہا کہ دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ایک آیت میں یہ حکم ہے کہ چار مہینہ دس دن عدت اور میراث

جو کچھ بھی اس کا ہے اور ایک آیت میں یہ فرمایا کہ ایک برس عدت اور گھر سے باہر نہ نکلیں اور اس شرط پر کھانا، کپڑا ملے گا۔ تو اگر وہ وہاں رہنا پسند کریں تو ایک سال عدت کرلیں اور شوہر کے مال میں کھائیں پئیں۔ اور اگر نہ رہنا پسند کریں تو چار مہینہ دس دن عدت پوری کرکے نکل آئیں تو دونوں آیتوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اور پہلی آیت نے دوسری آیت کو منسوخ نہیں کیا، بلکہ دونوں آئتیں اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

بڑے نکتہ کی بات ہے، جو آج تک کسی مفسّر نے نہیں بیان کی۔

کہ اگر یہ معنی صحیح ہے اور آیت کا یہ مفہوم ہوتا تو کسی نہ کسی زمانہ میں اس زمانہ میں یا بعد میں اس کے اوپر عمل ہونا تھا، عورت شوہر کے مرنے کے بعد چاہے چار مہینہ دس دن کی عدت پوری کرلیتی یا وہاں سے نکل جانے کے بعد نکاح کرلیتی۔ نہیں خوشی تھی اس کی وہیں رہتی تو کیا ایسا ہوا بھی؟ ایسا نہیں ہوا۔ کسی وقت بھی ایسا نہیں ہوا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کہ چار مہینہ دس دن کی عدت ہے اس کے بعد اس آیت پر عمل ہی نہیں ہوا۔ تو اگر یہ حکم مشروع ہوتا اور قابل عمل ہوتا اور غیر منسوخ ہوتا تو کوئی نہ کوئی تو اس پر عمل کرتا۔ عمل نہیں ہے۔

آج کے سبق میں یہ ایک ہی بات بہت وزنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آیت کے یہ معنی ہیں۔ ہم نے کہا کہ اگر آیت کے یہ معنی ہوتے تو اس پر عمل ہوتا اور جب عمل نہیں ہوا۔ اور عمل صرف دوسری آیت پر ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ منسوخ ہوگئی۔

ابو مسلم اصفہانی یہ کہتا ہے۔ کہ نہیں آیت کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ جو لوگ تم میں سے مرگئے ہیں۔ بیویاں انھوں نے چھوڑیں تو ان کو چاہئے کہ وہ وصیت

کریں اپنی بیویوں کو کہ وہ ایک برس ان کے گھر میں رہیں کھائیں پئیں اور گھر سے باہر نہ نکلیں۔ یہ وصیت ہے تو اس نے کہا کہ یہ معنی نہیں ہیں اس آیت کے۔ بلکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ تم میں سے جو لوگ مر گئے ہیں اور انھوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑا۔ اور ان کے شوہروں نے ان کو وصیت کی کہ تم ایک برس رہنا تو اللہ پاک نے یہ کہہ دیا کہ یہ وصیت لازمی نہیں ہے بلکہ ان کا دل چاہے رہیں دل چاہے نکل کر دوسرا نکاح کر لیں۔ یہ ابومسلم نے کہا ہے۔

کیا فرق ہوا۔ فرق یہ ہوا کہ ہم نے تو یہ معنی بیان کئے تھے کہ اللہ پاک نے یہ کہا کہ مردوں کو چاہئے کہ وہ وصیت کریں اپنی بیویوں کو۔

وہ یہ کہتا ہے کہ نہیں اللہ نے نہیں کہا یہ۔ بلکہ شوہروں نے ہی۔ مُردوں نے ہی وصیت کر دی کہ تم رہنا سہنا۔ اس کا اللہ نے یہ حکم بتایا کہ وہ حکم سے رہیں تو رہیں نکل جائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ تو یہ منسوخ نہیں ہے۔

تو میں نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ اس پر عمل نہیں ہوا۔ اس آیت کے اترنے کے بعد اور جب عمل نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ خلاف عمل ہے۔ خلاف عمل جب ہی ہوگا جب منسوخ ہوگا۔ بہت نئی بات ہے۔ دلیل جو اس نے بیان کی ہے۔ کیونکہ وہ بے عقلی دلیل اور عقل چیزوں کو اس معاملہ کو تو ہم تار تار کر دیں گے۔

وہ کہتا ہے نسخ نہیں ہونا چاہئے یہ جو حجت بے دلیل ہے دراصل یہود کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ناقابل تنسیخ ہے اس وجہ سے توریت جو ہے ناقابل تنسیخ ہے۔ قرآن کی ضرورت نہیں۔ جیسے وہ قبلہ کعبہ کی ضرورت نہیں تو یہود کا استدلال ہے وہ کہتا ہے کہ نسخ باطل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نسخ کس

وقت ہوا۔ ناسخ نے منسوخ کر دیا۔ کس وقت منسوخ کیا۔ یا جب وہ شئے منسوخ تھی، اس وقت منسوخ کیا، یا جب وہ منسوخ نہیں تھی اس وقت منسوخ کیا، اگر منسوخ نہ ہونے کے وقت منسوخ کیا تو منسوخ نہ ہونے کے وقت منسوخ ہونا ہوگیا۔ یہ محال ہے۔ ناممکن ہے۔ اور اگر منسوخ ہونے کے وقت منسوخ کیا تو وہ شئے منسوخ تھی منسوخ کیا گیا۔ تو یہ حکما، دہریہ جو ہیں۔ ان سے یہ بات یہود نے سیکھی اور یہود سے سیکھ کر اس غلطی کو یہاں رائج کیا۔

وہ غلط ہے۔ صحیح جواب یہ ہے کہ منسوخ ہونا پہلے نہیں ہے۔ ناسخ سے۔ بلکہ جس وقت ناسخ ہے بعینہٖ اسی وقت میں وہ منسوخ ہے۔ اگر منسوخ ہونا۔ ناسخ سے پہلے ہو یا پیچھے ہو۔ جب یہ خرابی لازم آئے گی ایک ہی وقت ہوگی تو کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی۔ اور یہ کہنا کہ نسخ خلاف عقل ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے۔ برابر آدم علیہ السلام کے زمانے کے اصول منسوخ ہو رہے ہیں، انبیاء منسوخ ہوئے ہیں، تمام انبیاء کی شرعیں منسوخ ہوگئیں۔ چنانچہ اصل کہاں رہا۔ اور تمام حیاتیں منسوخ ہو رہی ہیں۔ جدید حیاتیں ہو رہی ہیں۔ خدا پہلی حیاتوں کو مار رہا ہے اور منسوخ کر رہا ہے۔ نسخ میں کیا خرابی ہے۔ ازل تو بالکل وجود نہ تھا۔ کوئی وجود نہ تھا اس نے عدم کو منسوخ کر کے وجود کر دیا، پھر ایک وجود کو منسوخ کر کے دوسرا وجود کیا۔ دوسرے وجود کو منسوخ کر کے تیسرا وجود کیا۔ برابر ایک قوم کو منسوخ کر کے دوسری قوم کو آباد کر رہا ہے۔۔۔۔،

"اور اگر اللہ تعالیٰ ایک جماعت کو دوسری جماعت سے نہ دفع کر دیتا تو تمام عالم تباہ ہو جاتا"۔۔۔۔۔۔ اگر اللہ تعالیٰ ایک جماعت کو بعض کو بعض سے نہ دفع کر دیتا

لوگوں کو تو زمین جو ہے برباد ہو جاتی تباہ ہو جاتی۔ لیکن اللہ کا یہ بڑا فضل ہے روئے عالم پر کہ ایک کو دوسرے سے دفع کرا رہا ہے۔ اگر دفع نہ کرتا تو سارا عالم اس میں سما کہاں سکتا تھا۔ تو برابر مدافعت ہو رہی ہے۔ یہ کہنا کہ نسخ جو ہے خلاف اصل ہے۔ یہ غلط ہے۔ نسخ صحیح ہے اور بالکل اصل ہے۔ نسخ ہی حقیقت ہے۔ غیر نسخ غلط ہے جو شئے غیر منسوخ ہے وہ غلط ہے۔ وہ صرف خدا کی ذات ہے جو ناقابلِ نسخ ہے۔ باقی ہر شئے قابل نسخ ہے یہاں۔

اب یہ بات رہ گئی ذرا کھٹکے کی کہ جو نسخ کرنے والی چیز ہو گی ناسخ وہ پیچھے ہو گا اور جس حکم کو منسوخ کرے گا وہ پہلے ہو گا۔ منسوخ جس شئے کو کرنا ہے وہ پہلے ہو گی اور جو آیت منسوخ کرے گی وہ آیت پیچھے ہو گی۔ یہاں اُلٹا ہو گیا۔ منسوخ کرنے والا جو ہے وہ پیچھے ہو گیا۔ اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کو حق ہے کہ جو چاہے سو کہے۔ اور جس طرح سے چاہے کہے کہ جو نازل ہوا تھا جس طریقہ پر قرآن نازل ہوا تھا۔ اس میں پہلے منسوخ نازل ہوا تھا۔ پھر بعد میں نازل ہوا ناسخ لیکن جب اس نے حکم دیا جبرئیل علیہ السلام نے آکر پڑھ دیا تو اس کو اُلٹا کر دیا۔ پہلے اس نے پڑھا ناسخ کو اور پھر منسوخ کو پڑھا۔

تو آپ نے اسی طرح سے اسے یاد کر کے سب لوگوں کو بتا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ مکہ شریف میں جب آپ رہتے تھے تو جو سورتیں نازل ہوئی تھیں وہ قرآن میں پہلے آنی چاہئے تھیں اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ بعد میں آنی چاہئے تھیں۔ یہاں کیا کر دیا۔ یہ سورت جو پڑھ رہے ہیں۔ یہ ہیں مدنی اسے پہلے لکھ دیا سورۂ آلِ عمران پہلے لکھ دی یہ مدینہ کی سورۃ ہے اسے پیچھے ہونا چاہئے تھا

جو مکہ کی تھی وہ پہلے ہونی چاہیے تھے تو وہ نازل تو ہوئی تھی پہلے لیکن پڑھی ہے جبریل علیہ السلام نے پیچھے۔ تو جس طرح ان کو پڑھتا ہوا دیکھا آپؐ نے اسی طرح آپؐ نے ہم تک پہونچا دیا کہ میںؐ نے اس طرح سے سنا ہے فرشتہ سے۔ تو نازل وہ پہلے ہوئی یہ پیچھے ہوئی۔ تو اسی طرح ناسخ جو ہے وہ پہلے نازل ہوگیا۔ وہ پہلے پڑھ دیا اور منسوخ کو پیچھے پڑھ دیا۔ نازل وہ ہوا تھا پہلے تو اس میں کیا حرج ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

(بقرہ- ۲۴۳-۲۴۴)

کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو نکلے اپنے گھروں سے موت کے خوف سے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا مر جاؤ پھر اللہ پاک نے ان کو زندہ کیا۔ اللہ بڑا فضل کرنیوالا ہے۔ لوگوں پر لیکن اکثر شکر نہیں کرتے۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ وہ سنتا ہے اور جانتا ہے۔ یا یہ خطاب "کیا تم نے نہیں دیکھا" نبی کی طرف ہے یا قوم کی طرف ہے۔ یا دونوں کی طرف ہے الوف الف کی جمع ہے الف معنی ہزار الوف ہزاروں الوف الفت کی جمع محبت کرنیوالا۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ الفت کرنے والے تھے۔ تو یہ معنی ہیں کہ زندگی اور دنیا کی بڑی محبت تھی۔ اس لئے اپنی جانوں کو بچانے کے لئے شہروں سے بھاگ نکلے۔ ایک بستی میں طاعون پھیلا تو کچھ آدمی موت کے خوف سے بھاگ گئے اور کچھ رہ گئے۔ جو رہ گئے ان میں سے کچھ مر گئے اور کچھ بیمار ہو گئے۔ جب بیماری ختم ہو گئی اور وہ واپس آئے تو جو لوگ بیمار ہو گئے تھے انہوں نے کہا کہ بھئی یہ لوگ اچھے رہے جو جان بچا کر بھاگ گئے۔ اب اگر طاعون آیا تو ہم بھی بستی سے بھاگ جائیں گے اور طاعون اور مرض سے محفوظ رہیں گے۔ اتفاق سے پھر طاعون آیا۔ اور وہ لوگ سب بھاگ گئے۔ بھاگنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تم مر جاؤ وہ مر گئے اور کچھ دن تک وہ پڑے رہے۔ اور گل سڑ گئے کہ حزقیل ایک نبی تھے بنی اسرائیل۔ وہ ادھر سے گزرے اور ان ہڈیوں کے ڈھیر کو تکتے رہے اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا ہاں

یا اللہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو اللہ پاک نے کہا کہ ان سے کہو کہ اللہ پاک تم کو حکم دیتا ہے کہ تم سب جمع ہو جاؤ۔ جب انہوں نے یہ کہا تو ہڈیاں اڑنے لگیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے لگیں۔ پھر کہا کہ اب تم ان کو یہ کہو کہ اللہ پاک تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ خون اور گوشت اپنے اوپر چڑھا لو۔ جب انہوں نے یہ کہا تو گوشت اور خون ان پر جمع ہو گیا۔ پھر یہ فرمایا اب ان کو حکم دو کہ اللہ پاک یہ حکم دیتا ہے کہ تم کھڑے ہو جاؤ۔ جب نبی نے یہ فرمایا وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کی زبان سے یہ نکلا سبحانک وبحمدک لا الہ انت

دوسری روایت یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا اس نے جہاد کا حکم دیا۔ لیکن لشکر نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہاں بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اور کہا کہ جب وہاں سے بیماری ختم ہو جائے گی۔ تب ہم حملہ کریں گے تو اللہ پاک نے ان کو موت دے دی، اور وہ سب مر گئے جب بنی اسرائیل کو معلوم ہوا تو وہ ان کو دفن کرنے کے لئے گئے مگر ان کی کثرت دیکھ کر گھبرائے تو اللہ پاک نے ان کو دوبارہ آٹھ دن کے بعد زندہ کر دیا۔
ایک روایت یہ ہے کہ حزقیل نبی نے دعا مانگی کہ اللہ پاک ان کو ایسا معجزہ دکھا کہ یہ گناہوں سے باز آ جائیں تو اللہ پاک نے ان کو زندہ کر دیا۔ اللہ پاک نے حکم دیا کہ موتوا مر جاؤ یہاں ایک باریک مسئلہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا موتوا مر جاؤ۔ دوسری جگہ آیا ہے کن فیکون۔ تو لفظ کن اللہ پاک نے ادا نہیں کیا کیونکہ کن جب کہا جائے گا۔ تو پہلے ک ادا ہو گا۔ اس کے بعد نون ادا ہو گا۔ اور اس میں ایک زمانہ گزرے گا۔ جس وقت ک ادا ہو گا ن ادا نہیں ہو گا جب وہ زمانہ گزر جائے گا نون زمانے کے دوسرے جزمیں ادا ہو گا۔ یہاں موتوا کہا پہلے م ادا ہو گا پھر و پھر ت پھر و اس پر زمانہ گزرے گا ایسا نہیں ہے۔ یہ صرف سرعت اظہار کے لئے ہے۔ دوسری جگہ

ارشاد ہے کہ وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ پلک جھپکنے بلکہ اس سے بھی کم۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کا ایک اس قدر تیز ارادہ ہوا کہ فوراً فعل واقع ہوگیا۔ ہمارے یہاں جو فعل ہو رہا ہے وہ بالحرکت ہو رہا ہے۔ حصول مقصد کے لئے پہلے حرکت ہو گی پھر مقصد تک پہنچے گا۔ ارادہ اور مقصد کے درمیان حرکت ہے۔ اور اللہ پاک کا کوئی فعل بالحرکت نہیں ہے۔ وہ حرکت کا خالق ہے اس میں حرکت نہیں ہو گی۔ اس کا فعل بالمشیت ہے۔ مشیت کا فعل کس طرح ہوتا ہے۔ اس کی ناقص مثال ہے آپ کی مشیت۔ یہ ناقص مشیت ہے اب آپ ارادہ کریں کہ ایک ہزار میل لمبی سڑک سنگلاخ میدان میں تیار ہو جائے۔ تمام گڑھے بھر جائیں۔ پہاڑ کٹ جائیں فوراً سڑک تیار ہو گئی۔ ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ اس پر موٹریں دوڑا دیں فوراً دوڑنے لگیں۔ کچھ وقت صرف نہیں ہوا۔ لیکن آپ کا فعل کمزور ہے۔ اللہ پاک کی مشیت کامل مشیت ہے۔ اسی تناسب سے اس کا فعل بھی کامل اور قوی ہے۔ آپ کی ناقص مشیت سے کتنی جلدی فعل ہو گیا۔ اللہ پاک کی مشیت سے فعل اس سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے ہو گا۔ یہی معنی کن فیکون کے ہیں۔ فعل بالحرکت جو ہوتا ہے اس میں مادہ آلہ کی ضرورت ہوتی ہے وقت لگتا ہے اور فعل مشیت سے ہوتا ہے اس میں کسی چیز کی ضرورت نہیں ادھر ارادہ کیا ادھر ہو گیا۔ ارادہ سے مراد جدا نہیں ہے۔ یہاں ایک شبہ ہے۔ اسے بھی سمجھ لیں اس کی بنیاد وہ شبہ ہے جو فلسفیوں کو ہوا۔ وہ شبہ یہ ہے کہ عالم جو موجود ہوا وہ کس وقت ہوا۔ وجود عالم کے وقت ہوا یا عدم عالم کے وقت ہوا۔ اگر وجود عالم کے وقت ایجاد کیا تو وہ موجود تھا ہی ایجاد کیا کیا؟ اور اگر عدم عالم کے وقت ایجاد کیا تو عدم کے وقت وجود ہوا اور یہ اجتماع النقیضین ہے اور محال ہے۔ لہذا یہ ایجاد نہیں کیا

بلکہ بحث و اتفاق سے ہوگیا۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مغالطہ عامۃ الورود ہے
اور ہر جگہ جاری ہو سکتا ہے۔ آپ نے چھری سے خربوزہ کاٹا۔ اور اب یہ ثابت کرنا ہے
کہ نہیں کاٹا تو سوال ہوگا کہ بتاؤ یہ کٹے کے وقت کاٹا یا نہ کٹے کے وقت کاٹا۔ اگر کٹے
کے وقت کاٹا تو یہ کٹا ہوا تھا ہی کاٹا کیا۔ اور نہ کٹے کے وقت کاٹا تو یہ اجتماع النقیضین
ہوا تو گویا نہیں کاٹا حالانکہ آپ نے کاٹا تھا۔ اس کی غلطی میں نے پکڑ لی ہے۔ ایک ضابطہ
تو آپ یہ یاد رکھیں کہ جب دو لاشوں کی چیزوں کو آپ ملا دیں گے تو نتیجہ کبھی صحیح
نہیں نکلے گا۔ حاور د کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے اس قسم کی غلطیاں ہوئیں۔ یہ
نہیں جانتے کہ بندش کس طرح کی جاتی ہے۔ جو اصل چیز ہے اس کا استعمال
نہیں آتا۔ اکثر غلطیاں حکما سے اسی بنیاد پر ہوئی ہیں۔ یہاں تین صورتیں ہیں۔
ایک شق کو چھوڑ دیا۔ تین میں سے دو شقوں کو ملا کر ایک کر دی اور پھر یہ حکم جاری کیا
اس لئے یہ نقصان ہوا۔ وہ تین صورتیں یہ تھیں۔ یہ میں نے نکالدیں اس شبہ کو
مجھ سے پہلے اس طرح کسی نے حل نہیں کیا۔

(۱) ایجاد عالم وجود عالم سے پہلے ہے۔
(۲) ایجاد عالم وجود عالم کے ساتھ ہے۔
(۳) ایجاد عالم وجود عالم کے بعد ہے۔

(۱) اگر ایجاد عالم وجود عالم کے بعد ہے تو یہ تحصیل حاصل ہے۔ اس لئے
باطل ہے۔
(۲) اگر ایجاد عالم وجود عالم کے سے پہلے ہے تو یہ وجود و عدم کا اجتماع
ہے جو محال ہے اس لئے یہ صورت بھی باطل ہے۔

اب جو درمیانی صورت رہ گئی کہ ایجاد اور وجود دونوں کا زمانہ ایک ہے وجود ایجاد سے نہ پہلے ہے نہ پیچھے بلکہ ساتھ ہے اسی ایجاد سے اس کا وجود ہوا پہلے اور پیچھے ہوتا تو یہ تحصیل حاصل یا اجتماع النقیضین لازم آتا۔ جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہے کہ کٹنا اور کاٹنا دونوں ساتھ ہیں دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ استدلال کرنے والا ایک شق بھول گیا۔ یہ صحیح جواب ہے۔ سارے عقلا جمع ہو کر بھی اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتے۔

بالکل یہی شبہ کن فیکون میں ہے۔ کہ خطاب کن جو ہے۔ وہ کس کی طرف ہے موجود کی طرف ہے یا معدوم کی طرف ہے۔ اگر موجود کی طرف خطاب ہے تو کن سے کیا ہوا۔؟ وہ تو موجود تھا ہی۔ اگر معدوم کی طرف خطاب ہے تو وہ جائز نہیں ہے۔ جو شے ہے ہی نہیں تو اس سے کہے گا کیا۔ یہاں وہی جواب ہے کہ یہ خطاب موجود کی طرف ہے۔ کونسا موجود جو پہلے سے وجود تھا وہ نہیں بلکہ وہ موجود جو اسی خطاب سے موجود ہوا ہے۔ اس سے کہا کہ ہو اسی خطاب سے وہ ہوا ہے۔ دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ یہ فلسفہ الہیات محض غلوطات کا مجموعہ ہے۔ ایک ایک چیز میں ثابت کر سکتا ہوں۔ سب غلط ہے فلسفی انسان اتنی باریکیاں بیان کرتا ہے۔ اور ایک سنٹ میں گڑھے میں جا گرتا ہے۔ اور کیڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کو نہیں سوچتا۔ ارے سوچنے کی چیز تو یہ ہے۔ یہ تو چونکہ مجھے بہت مشق ہے۔ اس لئے یہ باتیں میں بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ اس علم کو پڑھنے والا کوئی ایسا نہیں ہے۔ جس کا دماغ خراب ہوئے بغیر رہ جائے۔ وہ فلسفی مغرب کے ہوں یا مشرق کے میں نے ایک شخص کو بھی ایسا نہیں پایا کہ اس کو یقین ہو علم کے معنی

تو یقین کے ہیں۔ جب یقین نہیں ہوا تو اس علم سے کیا فائدہ قوانین اور ضابطوں کو قاعدہ کے اندر لا کر سمجھے تو ہو سکتا ہے۔ ورنہ سب بے کار ہے۔ سات حکیم گزرے ہیں۔ افلاطون ان میں آخر تھا۔ تو ان میں کا پہلا مالٹے کا حکیم تھا۔ اس نے کہا کہ یہ سانس جو ہے یہ روح ہے۔ دلیل اس نے یہ دی کہ جب تک سانس رہتی ہے زندہ رہتا ہے۔ اور جب تک روح رہتی ہے زندہ رہتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ روح سانس ہے۔ کتنی فاش غلطی ہے۔ وہ ضابطہ میں نہیں لا سکا۔ زندہ رہنا روح کے لئے ثابت ہے اور سانس کے لئے بھی زندہ رہنا ثابت ہے۔ جب ایک چیز دو چیزوں کے لئے ثابت ہو تو وہ دونوں چیزیں ایک ہو گئیں۔ یہ نتیجہ نکالا اور یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کپڑا سفید ہے اور دودھ سفید ہے۔ کپڑے اور دودھ دونوں کیلئے سفیدی ثابت ہے تو چاہیئے کہ کپڑا دودھ ہو جائے۔ اس میں غلطی یہ ہے کہ اگر ایک چیز دو چیزوں کے لئے ثابت ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک ہوں۔ بلکہ ایک شے ایک شے کے لئے ثابت ہو اور دوسری شے کے لئے ثابت نہ ہو تو وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گی۔ جیسے دودھ سفید ہے بھینس سفید نہیں ہے تو دودھ بھینس نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس میں قانون کی غلطی ہے۔ وہ قانون کو جاری نہیں کر سکا۔ الفاظ کے معنی جاننے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ ہزارہا غلطیاں اسی بنیاد پر ہوئی ہیں۔ ہمارے یہاں کے علماء نے بھی یہی غلطی کی کہ اللہ کی ذات کو اپنی ذات پر منطبق کیا۔ اللہ کے افعال کو مخلوق کے افعال پر منطبق کیا۔ اللہ کے احکام کو مخلوق کے احکام پر منطبق کیا۔ مخلوق کے احکام بدیہی تھے۔ اس کے اللہ کے احکام کی بداھتاً تردید کر دی اور اپنی عقل کے مطابق اس کے احکام و اوصاف ثابت کر دیئے اور اس کا نام

فلسفہ الہیات رکھا۔

اب مخلوق کا حکم یہ ہے کہ بغیر جرم سابق کے اگر کسی کو دکھ دیا جائے تو یہ ہمارے یہاں ظلم کہلائے گا۔ یہ حکم بھی پوری مخلوق کا نہیں ہے بلکہ عاقل بالغ انسان کے لئے ہے جانور نباتات جمادات اور بچے اور مجنون سب اس حکم سے خارج ہیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہ جانوروں کو، بچوں کو جو تکلیفیں ہو رہی ہیں۔ یہ خدا کا فعل نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا ظالم نہیں ہے رحیم ہے تو اس کے فعل کو اپنے حکم پر منطبق کر دیا۔ یہ غلط ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو بات یہاں صحیح ہو وہاں غلط ہو۔ اس نے اپنا نام رحیم رکھا وہ دکھ دیکر بھی رحیم ہے اور سکھ دیکر بھی رحیم ہے۔ ہم دکھ دیں تو ظالم سکھ دیں تو رحیم۔ اور ہماری رحمت بھی رحمت جب ہے جب وہ منظور کرے۔ ورنہ اس کی کوئی جزا کوئی صلہ نہیں ہماری سب نیکیاں اور رحمتیں سراب ہیں۔ وہ رحمت جب ہوں گی جب اس کو وہ رحمت کہے۔ اگر کسی کے ساتھ ہم نے نیکی کی۔ اس نے کہا کہ میں اس نیکی کو منظور نہیں کرتا۔ وہ نیکی کہاں رہی۔ نیکی وہ ہے۔ جس کو وہ نیکی کہے۔ حق کی معیار کیا ہے؟ "جو وہ کہے وہ حق" خدا اس کو کہتے ہیں۔ جو وہ چاہے کرے۔ ورنہ وہ پابند ہو جائے گا اس کے افعال مقید ہو جائیں گے۔

تو خداوند تعالٰے نے فرمایا کہ اگر کہیں وبا پھیل جائے تو وہاں سے جانا نہیں چاہئے اور رسول صلعم نے فرمایا کہ وبا سے بھاگنا نہیں چاہئے اور اگر کوئی باہر ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ وہاں وبا ہے تو اس کو وہاں جانا نہیں چاہیئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام پر حملے کی تیاری ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ تو حملہ کو ملتوی کر دیا گیا اور جو لوگ وہاں تھے ان سے کہا گیا کہ تم مرتے سے

مت ڈرو موت اللہ کے ہاتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاد کی ترغیب ہے کہ موت کے ڈر سے جہاد سے بھاگنا نہیں چاہیئے۔ یہاں تینوں معنی جو اوپر بیان کئے گئے ہیں تینوں لگتے ہیں کہ وہ آپس میں محبت کرتے تھے یا اپنی زندگی سے محبت کرتے تھے۔ یا دہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ حذر الموت یعنی لحذر الموت۔ موت کی ڈر کی وجہ سے۔ ان سے کہا موتو مرجاؤ ثم احیاھم پھر ان کو زندہ کر دیا۔ ہمارے یہاں کے لوگ تو یہ کہتے ہیں یہ کرامت تھی اور معتزلہ یہ کہتے ہیں۔ کہ مردہ کو زندہ کرنا یہ نبی کا خاصہ ہے۔ کیونکہ اگر غیر نبی بھی مردہ کو زندہ کرے گا تو نبی اور غیر نبی میں فرق کیسے معلوم ہو گا۔ اور یہ دلیل ان کی ٹھیک ہے۔ میں سنت جماعت ہوں۔ مگر سنیوں کی یہ بات کہ وہ کرامت ہے صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ کرامت اس خرق عادت فعل کو کہتے ہیں جو عادت کے خلاف ہو اور مومن کے ہاتھ پر ہو۔ اگر کافر کے ہاتھ پر ہو تو اس کو استدراج کہتے ہیں۔ تو کرامت کا معارضہ ہو سکتا ہے۔ اور معجزہ اس خرق عادت فعل کو کہتے ہیں جس کا چیلنج ہو کہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا۔ معارضہ نہیں ہو سکتا۔ کرامت دعا سے اتفاق سے فعل ہو جاتا ہے۔ ڈرتا ہے بول نہیں سکتا۔ اور معجزہ میں کھلا چیلنج ہوتا ہے بڑی قوت ہوتی ہے۔ جیسے قرآن کا دعویٰ ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ ۲۴) تم ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے کہ اس جیسی کوئی سورۃ لے آؤ۔ کیسا زبردست دعویٰ اور کتنی قوت ہے اس میں۔

اب یہاں سائنس کی نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ دعویٰ کرے کہ اس جیسی ایجاد کوئی نہیں کر سکتا لیکن قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ فاتو بسورۃ من مثلہ وادعو شہداءکم من دون اللہ ۔۔۔ ولن تفعلو (بقرہ ۲۳) تمام انس و جن ازل سے ابد تک کے اکٹھے ہو کر زور لگالیں اس کی مثل ایک

سورۃ نہیں لا سکتے نہ اب نہ آئندہ قیامت تک کتنی بڑی قوت ہے اس دعویٰ میں۔ اور بزدلی جو ہے وہی انسانی علامت ہے۔ اور اتنی قوت کہ سارے عالم کو دعوت مقابلہ دے یہ انسانی قوت سے باہر ہے۔ پس پتہ چل گیا کہ یہ انسان کا فعل نہیں ہے۔

تو حکم ہوا اجزا کو جمع ہو جائیں وہ جمع ہو گئے تو اجزا کا جمع ہونا ممکن ہے اگر ممکن نہ ہوتا تو پہلی بار ہی جمع نہ ہوتے۔ پھر ان کو زندہ کر دیا۔ وہ زندہ ہو گئے۔ زندہ ہونا ممکن ہے۔ اگر ممکن نہ ہوتا تو پہلی بار بھی وہ زندہ نہ ہوتے۔ جب دونوں باتیں ممکن ہیں اور مخبر صادق نے خبر دید کی کہ دوبارہ زندہ ہو گا۔ تو قطعی یقین ہو گیا۔ کہ قیامت آئے گی۔ اور دوبارہ انسان زندہ ہو گا۔ ان اللہ لذو فضل علی الناس (البقرہ ۲۴۳، یونس) بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا فضل کرتا ہے لیکن اکثر انسان شکر نہیں کرتا۔ آگے آیت آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے انسان پر کہ وہ ایک کو دوسرے سے دفع کرتا رہتا ہے

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین (البقرہ ۲۵۱) یہاں ایک وقت ہے کہ پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آیا تو جن کو فتح ہوئی ان کے ساتھ تو ظاہر فضل ہوا لیکن جن لوگوں کو شکست ہوئی اور ملے گئے ان پر بظاہر میں فضل معلوم نہیں ہوتا۔ ان کو بڑی تکلیف پہنچی۔ اور برباد ہو گئے۔ تو اس نے اپنا نام رحیم و کریم اور ذو فضل رکھا اس بنیاد پر وہ رحیم و کریم ہے۔ وہ اس بنیاد پر ذو فضل نہیں ہے۔ کہ وہ کسی کو دکھ نہ پہنچائے۔ ہم اس بنیاد پر رحیم ہیں کہ کسی کو دکھ نہ دیں وہ تو مطلق رحیم ہے۔ سکھ دے تو رحیم دکھ دے تو رحیم۔ یہاں ایک نکتہ اور دیکھ لیں کہ اگر دکھ دینے والی قوت اللہ کے علاوہ کوئی اور ہو گی جیسا کہ یہ

آتش پرست وغیرہ کہتے ہیں تو یہ سکھ دینے والا اس پر قادر ہے کہ اس کو دکھ دینے سے روک دے یا قادر نہیں ہے اگر قادر نہیں ہے تو مجبور ہو گیا اور مجبور خدا بننے کے لائق نہیں ہے اور اگر قادر ہے اور پھر نہیں روکا تو یہ سب دکھ تکلیف۔ دوزخ جنت۔ زندگی موت سب اسی کی طرف سے ہے۔ وہی خالق کائنات ہے۔ اور وحدہٗ لاشریک ہے ومن کل شیٔ خلقنا زوجین (ذریت ۴۹) تمام متضاد چیزوں کا وہ خالق ہے لعلکم تذکرون شاید کہ تم سوچو۔ کیونکہ اگر ایک ہی قسم کی چیزیں پیدا ہوتیں تو خیال ہوتا کہ شاید قدرت خلاف پر قادر نہیں ہے۔ جیسے برف کو گرمی پر اور آگ کو ٹھنڈک پر قدرت نہیں ہے۔ خلاف پر قدرت کا پتہ نہ چلتا۔ تو باوجود متضاد پر قادر ہونے کے اس نے اپنا نام رحیم کریم اور ذو فضل رکھا۔ یہ معنی ہیں رحیم مطلق کے اور رحیم مقید کے یہ معنی ہیں کہ رحم کرے تب رحیم ہو۔ ولکن اکثر الناس لا یشکرون لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے یہاں ایک باریک وقت ہے۔ کہ جب ان کو موت دیدی اور وہ مر گئے۔ تو انکو سکرات موت اور دیگر چیزوں کا علم ہوا یا نہیں۔ اور جب ان کو اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہو گیا تو پھر یہ زندہ ہونے کے بعد مکلف اعمال ہوئے یا نہیں۔ جب یہ زندہ ہوئے تو انہوں نے جیسے جیسے عمل کئے اور پھر اپنے اپنے وقت مقررہ پر وفات پائی۔ تو ان اعمال کا جو دوبارہ زندہ ہو کر انہوں نے کئے۔ اس کے لئے جزا و سزا اور جوابدہی ہے یا نہیں۔ یہ وقت ہے یہاں کیونکہ مشاہدہ کے بعد تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔ اصولاً۔ اور یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ وہ مرے اور موت کے حالات کا ان کو مشاہدہ نہ ہوا۔ یہ تو موت نہ ہوئی بلکہ ایسا ہوا کہ جیسے نیند کا غلبہ ہوا دفعتاً اور وہ سو گئے تو اس کا جواب یہ ہے لما آمنو کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیات الدنیا ومتعنٰھم الی حین (یونس ۹۸) پہلے فرمایا لم ینفع ایمانھم لما راؤا باسنا (مومن ۸۵)

ان کا ایمان ان کو نفع نہیں دے گا جب وہ ہمارا عذاب دیکھ لیں. مگر یونس ؑ کی قوم نے عذاب دیکھا اور وہ ایمان لے آئے تو اس نے کہا مجھے منظور ۔ فرعون عذاب دیکھنے کے بعد ایمان لایا تو کہا نامنظور ۔ تو اس نے کہا میں کسی بات کا پابند نہیں ہوں جو چاہوں سو کروں ۔ میں نے اصل عظیم آپ کو بتا دی کہ خدا اور ہے جو چاہے کرے ۔ یہ ہمارے یہاں کے علماء ان چیزوں میں بہت پریشان ہوتے ہیں ۔ کہ مشاہدہ کے بعد ان کو مکلف نہیں ہونا چاہئے ۔ نہیں اس میں کچھ حرج نہیں ہے ۔ اس کو پورا اختیار ہے جیسا چاہے حکم دے فرشتے سب دیکھتے ہیں ۔ مکلف ہیں ۔ شیطان جنت میں رہا سب کچھ جانتا تھا مکلف تھا ۔ کوئی پابندی نہیں لگانی چاہئیے ۔ یہ بھی نہیں کہنا چاہئیے کہ پہلے تو اس لئے یہ کہا تھا ۔ وہ برابر کہہ رہا ہے ۔ موسٰی پر ایمان لاؤ ۔ اس کی شریعت پر عمل کرو ۔ پھر اس کو منسوخ کر دیا ۔ اب جب تک محمد ﷺ پر ایمان نہ ہو موسٰی پر تنہا ایمان کافی نہیں ہے ۔ وہ ایمان نامنظور ۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ واشکروا حکم ہو رہا ہے کہ جہاد کرو ۔ اور شکر کرو کہ ہم نے تم کو زندہ کر دیا ۔ شکر کیا ہے ؟ عبادت کو سبیل اس لئے کہا کہ اس کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچنا ہے اس دنیا میں جو نعمتیں اللہ پاک کی ہیں ۔ ان میں سب سے بہتر نعمت انسان کی اپنی ذات ہے ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو اپنی ذات سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے ۔ اور دوسری نعمتوں سے بھی اس لئے محبت ہوتی ہے ۔ کہ وہ اس کی ذات میں کام آتی ہیں ۔ اس کی ذات کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے ۔ تو جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ حقیقی نعمت جو ہے اپنی ذات اور عارضی نعمتیں جو ہیں یعنی اس کی بقا کے اسباب دونوں کی دونوں اس کی نذر کر دے ۔ اس کا نام شکر ہے ۔ ہمارے یہاں کے علماء عام طور پر شکر کو عبادت کہتے ہیں ۔ لیکن یہ غلط ہے ۔ شکر عبادت نہیں ہے ۔ معاملہ ہے ۔ عبادت غیر اللہ کی حرام ہے،

اور شکر غیر اللہ کا فرض ہے۔ کیونکہ فرمایا ان اشکرلی ولوالدیک (لقمان ۱۴) شکر کر میرا اور اپنے والدین کا یہ نہیں کہا ان اعبد ولی ولوالدیک عبادت کر میری اور والدین کی۔ عبادت کے لئے حرمت ثابت ہے۔ شکر کے لئے حرمت ثابت نہیں ہے لہٰذا شکل ثانی سے عبادت نہیں ہے۔ وقاتلو فی سبیل اللہ واعلموا ان اللہ سمیع علیم جہاد کرو اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے اور سنتا ہے۔ یہ جو تم جہاد کی رغبت لوگوں کو دلاتے ہو یا مت سے ڈراتے ہو اور اس طرح اس سے نفرت دلاتے ہو تو یہ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ جانتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ جو تمہارے دل میں ہے۔ اس کو جانتا ہے۔ اور جو تم کہہ رہے ہو اس کو سنتا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کس نیت سے کہہ رہے ہو۔ نظام عالم کو باقی رکھنے کے لئے اور آخرت کے ثواب کو حاصل کرنے کے لئے بھی جہاد بہت بڑی عبادت ہے۔ یہ ڈانٹ ہے سخت کہ ترک جہاد سے باز آجاؤ۔ انفروا خفافاً و ثقالاً (توبہ ۴۱) ہلکے ہوں یا بھاری۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ جاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جان سے اور مال سے یاایھا النبی حرض المومنین علی القتال (انفال ۶۵) اے نبی جہاد پر مومنین کو اکساؤ یومئذ دبرہٗ الا متحرفاً لقتال او متحیزاً الی فئۃ (انفال ۱۶) فقد باء بغضبٍ من اللہ۔ جو میدان جنگ سے سوائے دو باتوں کے یا تو کوئی داؤ کر رہا ہے۔ یا اپنے کیمپ میں واپس آنے کے لئے ان دو کے علاوہ اگر وہ کسی تیسری وجہ سے بھاگا تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہو گا وماواہ جہنم (انفال ۱۶) اور روز جزا اس کے لئے جہنم ہے۔ قرآن بھرا ہوا ہے اس سے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے اور مجھے بھی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ
قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ قَالَ
ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا
وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ قَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا
وَ اَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ
وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ
قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہُ
الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً
مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَہٗ
بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ
مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۷﴾ (البقرہ ۔ ۲۴۶ - ۲۴۷)

اوپر جہاد کا ذکر ہے۔ اسی کے متعلق یہ آیت ہے۔ کیا تو نے دیکھا۔ بنی اسرائیل کی امراء کی طرف جب انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے ایک خلیفہ بادشاہ امام مقرر کردو۔ تاکہ ہم راہ خدا میں جہاد کریں۔ نبی نے کہا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر جہاد فرض ہوگیا تو تم جہاد نہ کرو۔ تو وہ کہنے لگے کہ کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں یا یہ کہ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اللہ کے راستہ میں جہاد نہ کریں۔ مالنا کے دونوں معنی ہیں۔ استفہام کے بھی ہیں اور نفی کے بھی ہیں۔ انہوں نے اس کی وجہ بھی بیان کی کہ انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو گھروں سے نکال دیا اور ہمارے شہر ہم سے چھین لئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے حالات میں بھی ہم جہاد سے منہ موڑ لیں، یہاں سے ایک یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ اگر گھروں سے نکال دے یا لوٹ لے تو اس موقع پر بھی جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ ہمیں ہمارے گھروں سے نکالدیا اور ہمارے بیٹوں کو گرفتار کرلیا۔ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوگیا تو انہوں نے اعتراض کیا سوائے تھوڑی سی جماعت کے۔ اور قاعدہ تو یہ تھا کہ وہ یہ کہتا کہ اللہ ان کو جانتا ہے بلکہ اس نے یہ کہا کہ اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کا اقرار کرکے اس سے بھاگے۔ یہ بات ظلم ہے۔ جیسے فرمایا۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ جو اللہ رسول ملائکہ اور جبرائیل ومیکائیل کا دشمن ہے (بقرہ-۹۸) تو یہاں یہ ہونا چاہئے تھا کہ اللہ ان کا دشمن ہے۔ مگر کہا اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ اس

سے پتہ چلا کہ جبریل و میکائیل سے دشمنی بھی کفر ہے۔

تو اب یہ پتہ نہیں کہ نبی کون تھا اس بارہ میں کوئی متواتر خبر نہیں ہے۔ خبر واحد سے یہ معلوم ہوا کہ یا تو یہ نبی یوشع ابن نون تھے یا اسمٰعیل کو بگاڑ کر اسمویل ہے یا اس زبان میں ان کا نام اسمویل ہے اور بعض مفسروں نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی شمعون تھے۔ تو ان نبیوں میں سے کوئی نبی تھے۔ خبر واحد سے یہ پتہ چلا خبر متواتر سے کچھ پتہ نہیں چلا۔ بنی اسرائیل میں جب گناہوں کی کثرت ہوگئی اور نافرمانی زیادہ کرنے لگے تو ان پر کافر غالب آگئے اور ان کو نکالدیا اور گھر بار سب لوٹ لیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ قصہ جالوت سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ آگے اس کا قصہ آتا ہے کہ جالوت نے غلبہ کیا ان کو لوٹ لیا۔ اور ان کو معہ ان کی اولاد کے ان کے گھروں سے نکالدیا اور اس آیت میں بحث کی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جب یہ قصہ ہوگیا تو نبی نے انہیں بتایا کہ اللہ نے تمہارے اوپر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے یہ تم کو لے کر جہاد کریں گے۔ یعقوب کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کی اولاد میں اکثر نبوت رہی اور ایک بیٹے کی اولاد میں اکثر خلافت رہی باقی جو ان کے بیٹے تھے انہیں بادشاہت اور نبوت نہیں ہوئی ایک بیٹے کا نام یہودا تھا اور ایک کا نام لاوی تھا۔ ان کے ایک بیٹے تھے۔ بن یامین۔ ان کی اولاد میں سے یہ طالوت تھے۔ یہ معمولی مزدوری وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ غریب آدمی تھے ان کا نام سن کر یہ برہم ہوگئے اور کہنے لگے کہ وہ کیوں کر ہم پر بادشاہ اور حکمراں ہو سکتا ہے۔ ہم اس کے مقابلہ میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں۔ دو خاندانوں میں بادشاہت اور نبوت ہوتی چلی آئی ہے۔ اور یہ ان میں سے نہیں ہیں۔ یہ شاہی خاندان سے نہیں ہیں۔ اس لئے یہ بادشاہت کے مستحق

نہیں ہیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ یہ مالدار نہیں ہے غریب آدمی ہے سقہ کا کام کرتا ہے۔ یہ عذر کیا انہوں نے۔ یہ دو وجہیں انہوں نے بیان کیں کہ ان دو وجہوں سے وہ خلافت اور امامت کے لائق نہیں ہیں۔ سلیمانؑ اور داؤدؑ دونوں بادشاہوں کے خاندان سے تھے۔ دو عذر بیان کئے کہ اس کا نسب اچھا نہیں ہے اور غریب آدمی ہے۔ نبی نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ اللہ تعالٰے نے اس کو تمہارے اوپر خلیفہ چن لیا ہے۔ تو نبی کو تو یہ سچا جانتے ہی تھے برابر اس سے دعائیں کراتے تھے تو جب انہوں نے اللہ کی طرف سے بات بتادی تو ان کو مان لینا چاہئے تھا۔ دوسرے انہوں نے یہ جواب دیا کہ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ بسط کے مفسرین نے دو معنی بیان کئے ہیں کہ وہ طویل القامت تھے اور ایک یہ معنی بیان کئے کہ وہ بہت حسین و جمیل تھے۔ تو بسطہ کے معنی طویل اور جمیل کے ہیں اور طویل ہونے کی بنا پر ہی اس کو طالوت کہا اور تیسرے اور صحیح معنی اس کے یہ ہیں کہ شدت اور قوت بہت زیادہ تھی۔ اللہ نے علم میں اور جسم میں ان کو زیادہ قوت عطا کی ہے۔ اب یہ مضمون دقیق ہے اسے سمجھیں۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

پہلی بات تو اس نے یہ بتائی کہ امامت موروثی نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے دیدے اور جس سے چاہے چھین لے قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز کہئے اللہ مالک الملک ہے جس کو چاہے (آل عمران-۲۶) ملک دیدے اور جس سے چاہے ملک واپس لے لے۔ میراث نہیں ہے۔ یہ ملک یعنی بادشاہت اور نہ امامت۔ اگر وہ نبی کی اولاد ہوتی تو نبی کی اولاد سے بھی وہ

چھین سکتا تھا۔ اور چھین لیتا اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انٹ سنٹ جو چاہا کر دیا۔ ساری دنیا یہی سمجھتی ہے۔ غلط ہے یہ معنی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اسکا فعل بالمشیت ہے۔ ہم جو کام کرتے ہیں تو ہمیں آلات و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمانے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف مشیت کافی ہوتی ہے۔ فعل کے وجود میں۔ یہ معنی ہیں یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ (عمران۔ ۴۰) اس کا فعل بالآلہ نہیں ہے۔ بالمدت، بالحرکت نہیں ہے۔ بالمدت نہیں ہے۔ ہم کو فعل میں مشیت کے علاوہ جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی اس کو ضرورت نہیں ہوتی صرف مشیت کافی ہے اس کے فعل میں۔ بہت دقیق مسئلہ ہے لیکن اگر حل ہو گیا تو کل مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ اکثر علماء بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ اس کی علت کیا ہے۔ کہ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ دیکھئے ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے۔ پہلے اس کی اچھائی برائی خیال میں آتی ہے۔ اگر اچھائی خیال میں آئی تو اس کے کرنے کو آمادہ ہوتا ہے۔ اگر برائی خیال میں آئی تو اس کو نہ کرنے کا خیال دل میں آتا ہے۔ اور یہ خیال ارادے کو ٹھوکتا ہے۔ ارادہ قدرت کو، قدرت اعضاء کو حرکت دیتا ہے۔ اور اعضاء آلات اور اوزار اور سامان وغیرہ کو حرکت دیتے ہیں۔ یہ حرکت برابر ہوتی رہتی ہے۔ تب جا کے فعل ہوتا ہے۔ تو خیال میں فعل پہلے ہوتا ہے اور واقع میں پیچھے ہوتا ہے۔ اور وہ ان تمام حرکتوں اور عملوں کی غایت یا علت کہلاتا ہے۔ تو جب کسی فعل کے لئے پوچھا جاتا ہے کہ تمام حرکت کس لئے کی ہیں تو جواب میں یہی علت پیش کی جاتی ہے کہ اس لئے کی جاتی ہے

تو یہ فعل جو ہوتا ہے اس کی دو علتیں ہوا کرتی ہیں۔ یا تو کوئی نقص ہوتا ہے، اس کو دور کرنا ہوتا ہے۔ یا کوئی کمال مطلوب ہوتا ہے۔ بھوک لگی تو کھانے کا ارادہ کیا۔ اور کھانے کی خوبی خیال میں آئی کہ اس سے بھوک رفع ہو گی۔ ذائقہ آئے گا۔ اور زندگی بچے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ خیال آیا تو حرکت شروع ہوئی۔ کاروبار کیا۔ روپیہ کمایا۔ روپے سے اشیاء حاصل کیں پھر پکایا کھایا۔ تو اس سے پہلے جتنی حرکتیں تھیں وہ سب کھانے کے لئے تھیں اور وہ کھانے کے لئے کیوں تھیں یہ جو بھوک کا نقص تھا۔ عیب تھا۔ تکلیف دی۔ اس سے بچنے کے لئے۔ پوری کائنات میں دیکھ لیجئے۔ جتنی بھی حرکت ہو رہی ہے سب اپنی بقا کے لئے ہو رہی ہے۔ تو حرکت کے دو مقصد ہیں۔ فنا سے بچنا اور بقا کا حاصل کرنا۔ تو اللہ تعالیٰ کا فعل ایسا فعل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو نہ تو منفعت حاصل کرنا ہے اور نہ مضرت کو دفع کرنا ہے۔ اس کو ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان دونوں چیزوں کا خالق ہے خالق مخلوق کا غیر ہوتا ہے۔ اس کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس کو طلب ہی نہیں ہو گی۔ طلب نہیں ہو گی تو حرکت نہیں ہو گی۔ حرکت نہیں ہو گی تو عمل نہیں ہو گا۔ لیکن عمل ہے تو یہ عمل بالحرکت نہیں ہے بالمشیت ہی ہے۔ اور اس نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان میں حرکت ہو گی اور جب بالمشیت فعل ہو گا تو جو چاہے ہو گا۔ اس کو حق ہے کہ ایک چیونٹی کو سارے عالم کی بادشاہت دیدے اور اس چیونٹی کو ایسا شعور دیدے کہ بڑے بڑے اس کے سامنے لرزاں اور ترساں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیدا کرنے میں کوئی لاگت نہیں لگتی ۔ وقت وہاں ہوتی ہے۔ جہاں لاگت لگتی ہے۔ جب نفس مشیت ہے۔ کہا یہ ہو وہ ہو گیا

تو لاگت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چیونٹی ایک بہت بڑے دروازہ میں پھنس جائے لوگ کہیں کہ کسی طرح اس کو نکالو۔ ایسا شعور اگر وہ پیدا کرے تو اس کی کیا لاگت خرچ ہوگی۔ کچھ نہیں۔ جب وہ ایسا چاہے گا ہو جائے گا۔ تو اب یہ سوال کرنا غلط ہے۔ کہ یہ کیوں۔ یہ کیسے۔ بس وہ جیسا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ خدا کہتے ہی اس کو ہیں جس کے فعل سے کیوں کا سوال پیدا نہ ہو۔ خدا کے فعل سے سوال کیا جائے کہ یہ کیوں یہ کیوں یہ دراصل شیطانی فلسفہ ہے۔ اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس نے اپنے شاگردوں کو سکھا دیا ان کا نام فلسفہ ہے۔ اب آپ یہ سمجھ لیں کہ سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ فاعل قادر اور مختار ہو۔ اگر پتھر اوپر سے سر پر آگرے تو اس سے کوئی سوال نہیں ہوگا۔ اگر انسان اس طرح کو دے تو اس سے سوال ہوگا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو فعل کیا جا رہا ہے اس کی اچھائی یا برائی عقل میں آئے۔ یعنی فاعل مختار ہو۔ اور حسن و قبح عقلی ہو وہاں یہ سوال کیا جائے گا۔

اب حکماء کے نزدیک خدا فاعل بالاختیار ہے ہی نہیں تو ان کے عقیدہ کے لحاظ سے بھی اس کے فعل سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔ اور اہل اسلام کے نزدیک وہ فاعل بالاختیار ہے لیکن حسن و قبح عقلی نہیں ہے۔ یعنی عقل سے کسی شے کی اچھائی برائی معلوم نہیں ہوگی۔ جس کا نام اس نے اچھا رکھ دیا وہ اچھی ہوگئی اور جس شے کا نام اس نے برا رکھ دیا وہ بری ہوگئی۔ کسی شے کے اندر کوئی اچھائی برائی نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے میں نے اس پر غور کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ جس قدرت سے شیطان

کو پیدا کیا اسی قدرت سے نبی کو پیدا کیا۔ ہر شئے قدرت ہی کا نتیجہ ہے۔ اور قدرت ایک ہی ہے تو جس قدرت سے تمام خبیث چیزیں بیماریاں شراب جوا وغیرہ پیدا کی ہیں۔ اسی قدرت سے صحت اور آب زمزم پیدا کیا ہے۔ لاگت دونوں کی ایک ہے پھر اچھی بری کیسے ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی کن فیکون سے پیدا ہوا اور یہ بھی کہا کن یا شیطان شیطان حاضر ہو گیا کہا کن یا نبی نبی حاضر ہو گیا کن یا جبریل جبریل حاضر ہو گئے۔ سب کی لاگت کن ہے۔ پھر بھلائی برائی کیونکر ہو گی۔ وہ تو پیدا کرنے کے بعد اس نے کہدیا کہ اس کا نام میں نے برا رکھ دیا۔ اس کو برا کہو۔ اس کا نام میں نے اچھا رکھ دیا اس کو اچھا کہو۔ شیطان کو پیدا کر کے کہا کہ یہ برا ہے۔ تمہارا دشمن ہے اس کا کہا ہرگز نہ ماننا۔ نبی کو پیدا کر کے کہا یہ بہت اچھا ہے۔ تمہارا دوست ہے۔ اس کی بات ماننا اور اس کا اتباع کرنا۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔ خدا کی اگر معرفت صحیح ہو جائے تو کوئی جھگڑا نہ رہے۔ خدا وہ ہے جو چاہے سو کہے اور جو چاہے سو کرے۔ جو کہے وہ حق جو کرے وہی عدل۔ جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔ کوئی شئے اچھی ہے نہ بری ہے۔ اچھا اور برا اس کا نام ہے۔ نماز اس واسطے اچھی ہے کہ اس نے اس کا نام اچھا رکھ دیا۔ نفس نماز میں کوئی اچھائی نہیں ہے اگر طلوع وغروب اور زوال کے وقت نماز پڑھے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ منیٰ میں کنکریاں مارنا رکن حج ہے۔ نہیں مارے گا حج ناقص ہو جائے گا۔ علاوہ حج کے اگر یہی فعل کرے گا کافر ہو جائے گا۔ اگر جان بوجھ کر کرے گا۔ اگر جہالت سے کرے گا تو فاسق ہو جائے گا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بری ہے۔ اللہ پاک نے ان کے نام اچھے اور برے رکھ دیئے ہیں۔ اور ان کے اوقات اور مکان مقرر کر دیئے ہیں کہ اس وقت اور

اس جگہ یہ فعل کرو گے تو اچھا ہے۔ تو کسی شے میں کوئی ذاتی خوبی نہیں ہے۔ خوبی اس کے بتانے سے آئی ہے۔ جو آدمی یہ سمجھ جائے گا کہ اس کو حق ہے جو چاہے کہدے جو چاہے کردے تو پھر کبھی اعتراض نہ کریگا۔ تو طالوت اس نے چن لیا تمہارے اوپر بادشاہت کے لئے یہ نبی نے ان کو بتا دیا۔ تو امارت اور خلافت موروثی ہونا چاہیئے یہ غلط ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے چن لے۔ کافر کا بیٹا نبی ہوتا ہے نبی کا بیٹا کافر ہوتا ہے۔ اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ تو تھی قانونی بات اب اللہ پاک نے تمہاری عقلوں کے مطابق ایک بات کہدی۔ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

علم اس کو زیادہ دیا اور قوت جسمانی زیادہ دی یعنی علم و قدرت اس میں زیادہ ہے۔ علم و قدرت دو ظاہری اسباب ان کی خلافت کے لائق ہونے کے دیئے حسن و جمال اور طول قامتی دشمن کو دفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہیبت اور قوت کیساتھ اس میں تدبیر عقل اور علم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ دو کمال بادشاہت کے لئے ضروری ہیں تم میں یہ نہیں ہیں۔ اس میں یہ دونوں موجود ہیں۔ مال و جسمانی برتری دشمن کو دفع کرنے اور انتظام عالم میں کافی نہیں ہے۔ کیونکہ علم و قدرت یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو ذاتی طور پر مقصود ہیں۔ مال نسب جاہ یہ باہر کی چیزیں ہیں۔ اس لئے علم و قدرت ان سے افضل ہیں۔ مال و نسب و جاہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ یہ چھن سکتی ہیں لیکن علم و قدرت یہ اندرونی اور ذاتی شے ہیں۔ یہ چھن نہیں سکتیں۔ یہ مال اور جاہ دراصل ذریعہ ہیں۔ اس قدرت اور علم کو حاصل کرنے کا۔ یہ دونوں علم و قدرت خود کمال ہیں۔ اور مال ان کا ذریعہ ہے۔ کمال مقصود ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے مقابل کا آدمی نہ رہے۔ کمال سے ہر شخص کو محبت ہے۔ وحدت کا طالب ہے کہ میری مثل دوسرا کوئی نہ ہو۔ اس

کے مقابلہ میں جتنی خوبیاں اور لذتیں ہیں سب کو اس مقصد کے لئے خرچ کر دیتا ہے۔ مال ہے شجاعت ہے۔ علم ہے۔ قدرت ہے۔ سب کو خرچ کر دیتا ہے۔ اب وحدت حقیقی تو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ حق تعالےٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تو غیر اللہ میں اپنے آپ کو سب سے اول رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ قدرت ہے۔ علم بھی دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ کیونکہ ہمیشہ تمام اصحاب علم جو ہیں وہ اصحاب قدرت کے تابع رہے ہیں۔ تو قدرت مقدم ہے اس کے علاوہ علم وشعور افضل ہوتا ہے۔ تو ڈاکٹر آپریشن کے وقت کلوروفارم نہ دیتا۔ اگر کسی کے سر پر کوئی لکڑی مارے تو وہ ہاتھ سے روکتا ہے۔ کہ چوٹ ہاتھ پر لگے اور سر بچ جائے۔ ہاتھ کو سر پر سے نثار کرتا ہے۔ اسی طرح کلوروفارم سے شعور کو زائل کیا تو کیوں وہی قدرت کو بچانے کے لئے کہ قدرت باقی رہے۔

تو اس کو علم و قدرت میں زیادتی دی ہے۔ یہاں علم کو مقدم اور جسم کو مؤخر کیا ہے اس کی وجہ بھی سمجھ لیں لڑائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو تلوار بندوق سے ہوتی ہے۔ اور ایک تدبر اور علم سے ہوتی ہے۔ اور سیاسی اور دماغی لڑائی جو ہے وہ تلوار کی لڑائی سے زیادہ مقدم ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم یہ سیاسی لڑائی میں افضل اور اول نمبر تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو کہتے ہیں کہ انہوں نے بہت جہاد کیا۔ انہوں نے تلوار سے بہت جہاد کیا۔ اور انہوں نے تدبر سے کیا۔ جتنے بڑے بڑے اکابر صحابہ ہیں۔ ان کو مسلمان حضرت ابوبکر نے کیا ہے۔ تدبر کی لڑائی لڑی۔ اس کو مقدم کیا۔

اللہ جس کو چاہتا ہے بادشاہت دیدیتا ہے۔ تیسرا جواب یہ دیدیا کہ کسی کا حق نہیں وہ

جس کو چاہے دیدے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ جہاد کے واسطے مال کی بہت ضرورت ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

طالوت کو وسعت نہیں ہے مگر اللہ کو بڑی وسعت ہے۔ علیم کے معنی جاننا۔ اس پر علم ہونا چاہئے کہ جہاد کے لئے کتنے ساز و سامان کی ضرورت ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے علم ہے تو جس جس شے کی ضرورت ہے اور جتنی ضرورت ہے۔ میرے پاس ہر شے کی وسعت ہے۔ میں اس کو دیدوں گا۔ اس نے چاروں جواب دیدیئے۔ مضمون کافی ہو گیا اب اللہ کی بڑائی بیان کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بقرہ-۲۴۸)

ان کے نبی نے ان سے یہ کہا کہ طالوت کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس صندوق آئے گا۔ اس میں اللہ کی طرف سے تمہارے اطمینان کا سامان ہوگا اور ہارون ؑ اور موسٰی ؑ نے جو چھوڑا ہے اس میں اس کا بچا ہوا حصہ بھی ہوگا۔ بیشک اس میں نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم مومن ہو اگر تم کو یقین ہو۔

قوم نے یہ کہا تھا کہ طالوت ہمارے اوپر کس طرح بادشاہ ہوسکتا ہے۔ نہ وہ شاہی خاندان سے ہے۔ نہ وہ مالدار ہے۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو نبی نے اللہ تعالےٰ سے معجزہ طلب کیا تاکہ ایک صندوق جب وہ آسمان سے طالوت کے گھر پر اترتا ہوا دیکھیں گے تو ان کو یقین ہوجائے گا۔ اس صندوق کی ایک روایت یہ ہے کہ آدم ؑ کے پاس ایک صندوق تھا جس میں ان کی اولاد۔ تمام انبیاء کی تفصیل تھی۔ وہ منتقل ہوتا ہوا حضرت یعقوب ؑ تک پہنچا۔ ان سے یہودیوں کو ملا۔ ان میں جب اختلاف ہوتا تھا تو وہ صندوق بولتا تھا اور ان کا فیصلہ کر دیتا تھا۔ جب ان کی بدعنوانیاں بڑھیں تو ان پر غیر مسلم جماعت غالب آئی اور وہ لوگ صندوق بھی لے گئے اور کسی گندی جگہ انہوں نے ڈال دیا۔ مگر جس نے اس کے قریب پیشاب کیا۔ اور اس کی بے حرمتی کی۔ اس کو بواسیر ہوگئی۔ اس طرح ان کی پانچ آبادیاں برباد ہوگئیں۔ تو انہوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ہانک دیا۔ اور فرشتے ان کو ہنکاتے ہوئے طالوت کے گھر لے آئے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ

یہ صندوق اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا۔ یہ صندوق لکڑی کا تھا اور موسیٰ ؑ اس میں توراۃ رکھتے تھے۔ جب اسرائیلیوں نے معجزہ طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ان کو نبی کے ذریعہ کہ وہ صندوق طالوت کے گھر میں اترے گا آسمان سے اور وہ تمہاری تسکین کا سبب ہوگا۔

"تحملہ" کے معنی اٹھائے ہوئے کے ہیں۔ لیکن تمام مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں معنی نگرانی کے ہیں۔ فرشتوں کی نگرانی میں وہ صندوق آسمان سے آئے گا۔ جب وہ صندوق کھولا گیا تو خالی تھا۔ اس کو ایک کوٹھری میں مقفل کر دیا گیا۔ اور نبی نے دعویٰ کیا کہ اس کے اندر تمہاری تسکین کا سبب ہے۔ جب اس کو کھولا گیا تو اس میں ایک کتاب نکلی۔ اس میں لکھا تھا کہ طالوت تمہارا بادشاہ ہوگا۔ اور وہ جہاد کرے گا۔ اور تم کو فتح ہوگی۔ اور اس قسم کی بہت سی بشارتیں اس میں درج تھیں۔ یہ دو روایات صندوق کے سلسلے میں آئی ہیں۔

بقیہ کے معنی بعض مفسرین نے یہ بیان کئے ہیں کہ آل ہارون اور آل موسیٰ یعنی ان کے سلسلے کے جو بزرگ اور انبیاء تھے وہ اس میں روحانیات کے نصائح محفوظ رکھتے تھے اور یہ نصائح ہی باقیات ہیں اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کے بقیہ تھے۔ بقیہ معنی بچا کھچا یا تھوڑا سا۔

سکینہ کے معنی تسکین اور اطمینان کے ہیں کہ تمہیں تسکین ہو جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہ کہا کہ طالوت نبی تھے ان کے ہاتھ پر یہ معجزہ ظاہر ہوا۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ ان ہی نبی کا معجزہ ہے جن کے ذریعہ طالوت کی بادشاہت کی تائید کی گئی۔

اب یہاں دو تین باتیں سمجھنے کی ہیں ۔

دلیل کی تقریر یہ ہے کہ طالوت صاحب معجزہ ہے اور صاحب معجزہ نبی ہے تو طالوت نبی ہو گئے۔ اکثر علمار اس کو نہیں سمجھے۔ جس انسان سے معجزہ صادر ہو وہ نبی ہے اور لغت میں معجزہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ خرق عادت فعل جو نبی سے صادر ہو اس کو معجزہ کہتے ہیں. اور جو غیر نبی سے صادر ہو وہ کرامت کہلاتی ہے۔ تو نبی کی شناخت یہ ہے کہ اس سے معجزہ صادر ہو اور معجزہ کی یہ پہچان ہے کہ وہ نبی سے صادر ہو۔ نبی کی شناخت معجزہ ہوا اور معجزہ کی شناخت نبی ہوا۔ یعنی نبی کی شناخت نبی ہوا۔ غلط بات ہے. علم کلام کی تمام کتابوں میں نبی کی یہی تعریف لکھی ہے ۔ معجزہ کی شناخت کسی اور ذریعے سے ہوتی اور جب معلوم ہو جاتا کہ یہ معجزہ ہے اور پھر وہ نبی سے صادر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ یہ نبی ہے تو یہ ٹھیک ہو جاتا۔ نبی کی شناخت تو معجزہ ہی سے ہو گی. مگر یہ کہنا کہ معجزہ وہ ہے جو نبی سے صادر ہو یہ غلط ہے بلکہ مدعی نبوت سے جو صادر ہو وہ معجزہ ہے۔ جب تک معجزہ صادر نہ ہو وہ نبی نہیں ہے۔ وہ صرف مدعی ہے جب معجزہ ہو گیا تو اب نبوت ثابت ہو گئی اب وہ نبی ہو گیا۔ اب وہ دقت ختم ہو گئی۔ اب معجزہ کیا ہے. معجزہ ایسا خلاف عادت فعل ہے جس کا معارضہ ومقابلہ کرنے سے سارا عالم عاجز ہو ۔ عادت کیا ہے اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں. ان کی سب کی خصلتیں رکھی ہیں انکی جو خصلتیں ہیں. یہ ان کی عادتیں ہیں ۔ پتھر میں سختی۔ دودھ میں سفیدی۔ سورج میں روشنی آگ میں حرارت پیدا کر دی۔ تو اشیار کی جو خصلتیں ہیں یہ ان کی عادتیں کہلاتی ہیں ان اشیار سے ان کی عادتوں کے خلاف اگر کوئی فعل ہونے لگے تو اس کا نام خرق

عادت ہے۔ ایک تولہ کی کنکری ہے۔ اس کو آپ اٹھا سکتے ہیں یہ آپ کی عادت ہے
اگر آپ نہ اٹھا سکے تو یہ فعل خرق عادت ہوگا۔ اب کہا کہ قرآن کی مثل لاؤ۔ نہیں لا سکے تو
قرآن معجزہ ہو گیا۔ پھر ان سے بہت بڑا دعویٰ کیا لایا قل لئن اجتمعت الانس والجن
علیٰ ان یاتو بمثل ہذا القرآن ان لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا
(اسراء ۸۸)
کہہ دے کہ اگر آدمی اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا اور لے آئیں تو وہ ہرگز
ایسا نہیں کر سکتے خواہ کتنے ہی ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں اس قرآن کی مثل
بنانے پر علیٰ ان یاتو بمثل ھذا القرآن میں یاتو مضارع کا صیغہ ہے کہ حال اور مستقبل
دونوں کے لئے آتا ہے نہ اس وقت مقابلہ کر سکتے ہیں نہ ابد تک کر سکیں گے۔
ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں اور سب مل
کر کوشش کریں مقابلہ کرنے کی۔ ہرگز مقابلہ نہیں کر سکیں گے ماضی حال پر اور
حال مستقبل پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور مستقبل کہیں نہیں ٹھہرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابد
تک اس کا مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔ پہلے یہ کہا پھر کہا فاتوا بعشر سور من مثلہ
(ہود ۱۳)
اس جیسی دس سورتیں لے آؤ۔ یہ دوسرا موقع ہے۔ جیسے کوئی شاعر دعویٰ کرے
کہ غالب کچھ نہیں جانتا تھا بالکل بے کار شاعر تھا تو اس سے کہا جائے گا کہ اس کا جو
یہ دیوان ہے ایسا دیوان تم بھی لکھ دو پھر کہا جائے کہ دیوان تو خیر کیا لکھو گے چلو
اس جیسی دس غزلیں ہی کہہ دو۔ گویا ہرانے کے لئے۔ پھر تم دس کیا لا سکو گے
فاتو بسورۃ من مثلہ (بقرہ ۲۳) چلو ایک ہی سورۃ لے آؤ جیسے کہیں دس تو
خیر چلو ایک ہی غزل کہہ دو۔ گویا ہرانے کے لئے۔ پھر کہا فان لم تفعلوا (بقرہ ۲۴)
اور اگر نہیں لا سکے۔ پھر کہا ولن تفعلو ہرگز نہیں لا سکو گے۔

دیکھئے آجکل نت نئی ایجادات محیر العقول بڑے بڑے سائنسداں کر رہے ہیں. مگر کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی جیسی ایجاد کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ دل کمزور ہے کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا. تو وہ کس قدر قوی دل ہوگا. جس نے اتنا بڑا دعویٰ کیا. کتنی قلبی قوت کی ضرورت ہے کہ اس نے سارے عالم کو دعوت معارضہ دیدی. بہت بڑی قلبی طاقت ہے. تو معلوم ہوا کہ اتنی بڑی طاقت انسان کی طاقت سے باہر ہے. انسان ہوتا تو ڈرتا کہ ممکن ہے کوئی لے آئے. جب کوئی نہیں لایا. تو معلوم ہوا کہ نبی کا دعویٰ سچا ہے کہ ہرگز تم نہیں لاسکتے. اور وہ بھی امی آدمی یہ دعویٰ کرے کہ تم اس قسم کا کلام نہیں لاسکتے. لن کا لفظ بتارہا ہے. کہ بہت بڑی طاقت ہے. اتنی بڑی طاقت ہے کہ انسان کا قلب اتنا قوی نہیں ہوسکتا. دین کی بات میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لگانی چاہیئے. ایک بات میرے خیال میں آئی. وہ بتادوں اللہ تعالےٰ معاف کرنیوالا ہے. میری غلط بیانی کو اللہ تعالےٰ معاف کرے. اللہ پاک نے فرمایا کٓھٰیٰعٓصٓ پانچ حرف پھر کہا الٓمٓ تین حرف پھر کہا طٰہٰ دو حرف پھر کہا قٓ. ایک حرف یہ بھی تو سب قرآن ہے. اس لئے کہا ایسا قرآن نہیں لاسکتے پھر کہا دس سورتیں بھی نہیں لاسکتے پھر کہا دس کیا ایک سورۃ بھی نہیں لا سکتے انا اعطینا تین آیت کی سورۃ ہے اگر اتنی چھوٹی سی سورۃ بھی لے آتے تو معارضہ ہوجاتا اور نبی کا دعویٰ جھوٹا پڑ جاتا، نہیں لاسکے. تو قرآن نے تو صرف سورۃ پر بس کردیا. میں کہتا ہوں. ایک حرف بھی نہیں کہہ سکے قٓ ایک حرف ہے طٰہٰ دو حرف ہیں. الٓمٓ تین حرف ہیں. کٓھٰیٰعٓصٓ پانچ حرف ہیں. اس کا بھی معارضہ نہیں کرسکے. اللہ تعالےٰ اگر میں غلطی پر ہوں تو معاف کرے. اگر یہ بات میں نے

ٹھیک کہی تو یہ نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرے۔ ایک بات اور ہے اس پر غور کریں۔ گھر کے لوگ خاندان کے لوگ کنبے کے لوگ سب نبیؐ کے دشمن ہو گئے تھے۔ ایک بھی دوست نہیں تھا۔ پھر اہل کتاب اہل ملک سب کو خطاب کرے کہ "اے کافرو" کتنے بڑے قلبی قوت کی بات ہے۔ اب یہ تو آپ نے سمجھ لیا کہ معارضہ نہیں ہو سکتا۔ اب فرض کیجئے کہ معارضہ ہو سکتا ہے۔ اور مقصد تمام کفار کا یہ تھا کہ ان کو زچ کریں اور ہرائیں۔ تو تلوار سے ہرانے اور قتل کرنے میں اتنی توہین نہیں تھی جتنی دو سطر لکھ دینے میں تھی۔ تو اگر لکھ سکتے تھے اور پھر نہیں لکھا تو یہ دوسرا معجزہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سے کہا پہاڑ نہیں اٹھا سکتے خیر پہاڑ ایسی چیز ہے کہ نہیں اٹھ سکتی۔ مگر دو تولے کا پتھر تو اٹھا سکتے تھے۔ ان سے کہا دو تولہ کی کنکری اٹھاؤ تو وہ اسے بھی نہیں اٹھا سکے دعویٰ کیا کہ لاؤ۔ وہ لکھ سکتے تھے۔ پھر نہیں لکھ سکے۔ تو یہ دوسرا معجزہ ہو گیا۔ بہرحال خرق عادت فعل کو معجزہ کہتے ہیں۔ جس کا جواب نہ ہو سکے۔ اور جواب اس لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ فعل خدا کا ہے۔ انسان خدا کے فعل کا جواب نہیں دے سکتا۔ خواہ کتنی بڑھیا سے بڑھیا بکلی بنالیں۔ قدرتی بکلی کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ صناع کتنی بہتر سے بہتر چیز بنالے لیکن قدرتی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان میں فعل کے کرنے کی اللہ پاک نے قوت رکھی ہے۔ وہ بھی بڑی عجیب و غریب چیزیں بنا رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری قوت رکھی ہے فعل کے نہ کرنے کی۔ وہ بھی برابر کی قوت ہے۔ یعنی ایمان لانے کی بھی اتنی ہی قوت ہے۔ جتنی ایمان نہ لانے کی یعنی کفر کی قوت ہے۔ وہی قوت جو نیکی کرنے کی بعینہ وہی قوت بدی کرنے کی بھی ہے۔ دو ٹکڑے نہیں ہیں ایک ہی قوت میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں فعل اور ترک فعل انسان کو قوت

دی ہے کہ بھوک کے وقت کھانا کھائے۔ پیاس کے وقت پانی پیئے۔ اس کے مقابلہ میں یہ قوت بھی ہے کہ بھوک کے وقت نہ کھائے۔ پیاس کے وقت نہ پیئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رمضان میں روزہ نہ رکھ سکتا۔ جب دو گھنٹہ رک سکتا ہے تو اس سے زیادہ بھی رک سکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ ساری عمر نہ کھائے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ مر جائے گا۔ مگر رک سکتا ہے اور اگر یہ کھوک نہ کھائے گا۔ اتنی مدت تو مر جائے گا۔ تو اگر ایسا ہی کھائے چلا جائے گا تب بھی مر جائے گا۔ دونوں عمل برابر ہیں۔ تو اب یہ عادت ہوئی اس کی کہ بھوک کے وقت کھائے پیاس کے وقت پیئے۔ اب اگر وہ اس کے خلاف کرے تو اسی کا نام خرق عادت ہے یعنی اپنی مرضی سے اپنی خواہش کے خلاف کام کرے گا تو اس سے ایسا فعل سرزد ہوگا جو خلاف عادت ہوگا۔ ایسے خرق عادت فعل کو کرامت کہتے ہیں۔ اس کا جواب ہو سکتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو میں کر لوں گا۔ آپ کوشش کریں گے تو آپ کریں گے۔ یہ اکتسابی خرق عادت ہے۔ تو کرامت تو موقوف ہے کسب پر۔ مگر معجزہ اکتسابی نہیں ہے۔ وہ نبی کے کسب پر موقوف نہیں ہے۔ وہ تو خدا کا فعل ہے۔ خدا کے فعل کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جب مقابلہ نہیں ہو سکتا تو سارے عالم کو چیلنج کرے گا۔ کرامت کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ جب کوئی دعویٰ کرے گا تو دوسرا کہے گا لو میں موجود ہوں۔ پہلوانوں کو دیکھ لیجئے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہے۔ بھولو بہت بڑا پہلوان ہے مگر اس سے بڑا پہلوان ہو سکتا ہے۔ جو اس کو پچھاڑ دے۔ اب ہم ایک درخت نہیں اکھاڑ سکتے۔ وہ پہلوان اکھاڑ سکتا ہے۔ تو یہ خلاف عادت فعل ہے۔ یہ جسمانی فعل ہے۔ اسی طرح اگر ہم اپنی مرضی سے اپنی خواہشات کو ترک کر دیں تو خدا کی یہ عادت جاری ہوئی ہے کہ ہمارے ہاتھ سے بھی

خلاف عادت فعل ہونے لگے گا۔ بغیر دیکھے دیکھنے لگے گا۔ بغیر کھائے پیٹ بھر جائے گا بغیر پیئے۔ سیراب ہو جائے گا۔ اگر کوئی بات منہ سے نکل گئی۔ تو وہ ہو کے رہے گی۔ اب اگر وہ دعویٰ کرے تو کوئی نہ کوئی آدمی ایسا ضرور نکل آئے گا جو اس کا رد کر دے ایسا خرق عادت فعل اگر مومن کے ہاتھ سے ہو تو اس کا نام کرامت اور غیر مومن کے ہاتھ سے ہو تو اس کو استدراج کہتے ہیں۔ نبی صلعم کو مومنوں سے اتنی محبت ہے کہ خود مومنوں کو اپنی ذات سے اتنی محبت نہیں ہے۔ النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم (احزاب-۶) تو جب وہ مانگتے معجزہ نبی صلعم دکھا دیتے۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا۔ مگر انہوں نے جواب دیا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (ابراہیم-۱۱) جب اللہ کا حکم ہوگا تو ہوگا۔ وہ خدا کا فعل ہے۔ اس سے اجازت لینی پڑے گی اور پھر وہ خدا کے ہاتھ سے ہوگا۔ یہ ہے حقیقت معجزہ کی۔

یہ اس آیت کی تفسیر ہے ان کنتم مومنین

یہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ اس میں تمہارے لیے تسکین ہے۔ اگر تم مومن ہو یعنی معجزہ دلیل نبوت ہے۔ اب یہاں حکماء کی جماعت ہے وہ کہتی ہے کہ خلاف عادت فعل محال ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر ایسا ہوگا تو سارا نظام بگڑ جائے گا۔ یعنی برف جلانے لگے گی۔ آگ ٹھنڈک پہنچانے لگے گی۔ تو ان کے نزدیک معجزہ محال ہو گیا اور معجزہ دلیل نبوت ہے۔ معجزہ کے بغیر نبوت کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے تمام فلاسفہ نبوت کے منکر ہیں۔ بنیاد ان کے انکار کی یہی ہے کہ خلاف عادت فعل محال ہے۔ تو اب یہ آپ سمجھ لیں کہ خلاف عادت معجزہ یا خرق عادت فعل جو بھی آپ اس کا نام رکھ لیں محال نہیں ہے۔ فلاسفہ کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ آپ دیکھیں کہ یہ کائنات ہے

اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے یا کوئی اس کا پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ نہیں ہے جیسا کہ دہریہ کہتا ہے۔ تو اب یہ بغیر کسی کے بنائے بن گئی۔ یہ اتنا بڑا خرق عادت فعل ہو گیا ہے۔ اگر یہ کہو کہ کوئی موجد ہے تو یا وہ اضطراری ہے یا اختیاری ہے۔ اگر وہ اضطراری غیر اختیاری فاعل بالایجاب ہے تو یہاں متضاد چیزیں موجود ہیں۔ آگ اور پانی ٹھنڈک اور گرمی۔ سفیدی اور سیاہی۔ اندھیرا اور اجالا ہر چیز دوسری چیز کی ضد ہے اور اضطراری قوت سے ایک ہی قسم کا فعل سرزد ہوتا ہے تو اب جو متضاد فعل صادر ہوا تو یہ خلاف عادت فعل ہو گیا۔ تو موجد کے اضطراری ہونے کی تقدیر پر بھی خلاف عادت فعل ممکن ہو گیا۔ اور اگر موجد اختیاری ہے تو ہر شے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہے۔ یا وہ ہو گی یا نہیں ہو گی۔ سفیدی ہو بھی سکتی ہے۔ اور نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ تو سفیدی کی جگہ سیاہی اور سیاہی کی جگہ سفیدی حرکت کے وقت سکون اور سکون کے وقت حرکت وہ پیدا کر سکتا ہے۔ تو اس صورت میں معجزہ بہت آسان ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عالم نو پیدا ہے پہلے نہیں تھا پھر ہوا۔ تو خالق عالم کی ازلی عادت تو نہ پیدا کرنے کی تھی پھر پیدا کر دیا تو یہ پیدا کرنا اس کی ازلی عادت کے خلاف ہوا۔ تو کائنات کا وجود سارا کا سارا عادت کے خلاف ہے۔ اب اور دیکھیں کہ جتنی چیزیں اس کائنات میں ہیں سب ممکن ہیں یعنی ہو بھی سکتی ہیں۔ اور نہیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو بچہ آج تک نہیں ہے۔ وہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہے وہ نہیں بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ کل مر سکتا ہے۔ تو یہ سب چیزیں ہونے نہ ہونے کے درمیان ہیں جب خالق ان کو ہونے کی طرف لاتا ہے۔ ہو جاتی ہیں۔ جب نہ ہونے کی طرف

لاتا ہے۔ تو یہ نہیں ہوتیں۔ تو جتنے ممکنات ہیں ان کی عادت تو ہونے اور نہ ہونے کے درمیان رہنے کی ہے۔ اب جو یہ کبھی ہو جاتی ہیں اور کبھی نہیں ہوتی ہیں۔ یہ ان کی عادت کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ زمین آسمان شجر حجر انسان حیوان ہر شے خلاف عادت ہے۔ ہر شے معجزہ ہے۔ جب یہ انسان کے ہاتھ پر ہوں گی تو اللہ کا فعل سمجھا جائے گا۔ اور نبی کی نبوت کی دلیل اور شناخت ہوگی اسی لئے تو فرمایا اولیس الذی خلق السمٰوٰت والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم (یٰس-۸۱)
اس نے تمام آسمان اور زمین کو پیدا کر دیا کیا وہ قادر نہیں ہے کہ آدمی کی مثل دوبارہ پیدا کر دے ممکن کو وجود کر دے۔ یہ خاصہ خداوندی ہے۔ جب یہ انسان کے ہاتھ پر ہو گا تو اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بن جائے گا۔ تو اب یہاں نبی نے کہا کہ صندوق طالوت کے گھر میں آئے گا۔ اگر نبوت پر یقین ہے تو یہ معجزہ ہو گا اور اس سے تمہیں اطمینان ہو جائے گا۔ کہ طالوت کو اللہ تعالےٰ نے تمہاری خلافت کے لئے چن لیا ہے۔ چنانچہ یہ معجزہ صادر ہوا۔ اور صندوق طالوت کے گھر پہنچ گیا اور ان لوگوں کو اطمینان ہو گیا۔ اب یہاں یہ بات اور سمجھ لیں، آپ کے کام آئے گی۔ کرامت تو آپ سمجھ گئے کیا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ اپنی عادت کے خلاف فعل کرے۔ جوگی جے پال سے خواجہ معین الدین کا روحانیت میں مقابلہ ہوا اور جے پال ہار گیا۔ خواجہ معین الدین نے اس سے ایمان لانے کو کہا تو اس نے کہا کہ میرا دل ایمان لانے کو نہیں چاہتا۔ خواجہ معین الدین نے فرمایا کہ اپنے اور میرے نفس کو دیکھو اور سورج سے مقابلہ کرو تو اس نے مراقبہ کیا اور کہا کہ تینوں برابر کے روشن ہیں۔ لیکن

میرے نفس میں ایک سیاہ نقطہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ نقطہ اسی وجہ سے ہے کہ تم اس کا انکار کرتے ہو جو سب کو روشنی دینے کے لئے ہے۔ تم اگر اس کا اقرار کر لو تو یہ نقطہ بھی چلا جائے گا۔ اس پر اس نے کہا کہ میرا دل نہیں چاہتا تو خواجہ نے پوچھا کہ تمہارے نفس میں یہ چمک کس طرح پیدا ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں نے ۵۰ برس تک نفس کی مخالفت کی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تو بس سمجھ لو کہ اب بھی تمہارا نفس جو کہہ رہا ہے اس کی مخالفت کرو۔ تو یہ نقطہ بھی چلا جائے گا۔ اس پر وہ مسلمان ہو گیا۔

ہاں تو اب وہ مسئلہ سمجھ لیں کہ یہاں دو نبی موجود ہیں۔ ایک تو وہ جس کے متعلق اللہ پاک نے فرمایا قال لھم نبیھم ۔ اور ایک آیت آگے آرہی ہے کہ وَقَتَلَ دَاؤُدُ جَالُوْتَ (بقرہ ۲۵۱) داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ دو نبی یہاں موجود ہیں اور داؤد صاحب زبور بڑے جلیل القدر نبی ہیں۔ تو دو نبیوں کی موجودگی میں طالوت امام جہاد ہو گیا اور طالوت ان دونوں سے گھٹیا ہے۔ اگر نبی ہے تو ان سے چھوٹا نبی ہے اور اگر ولی ہے تو بہت ہی گھٹیا ہے۔ تو دو بڑھیا نبیوں کی موجودگی میں ایک گھٹیا شخص امام خلیفہ اور بادشاہ ہو گیا۔ تو یہ کہنا کہ افضل مستحق خلافت ہے۔ یہ اصول غلط ہے۔ یہ نئی بات آپ کو بتا رہا ہوں جس کے بارہ میں صدیوں سے غفلت رہی۔ دلیل کی تقریر یوں ہے حضرت علیؓ افضل ہیں اور افضل مستحق خلافت ہے۔ لہٰذا علیؓ مستحق خلافت ہیں۔ یہ حق ہے۔ اگر دونوں باتیں حق ہوں۔ لیکن دونوں باتیں غلط ہیں۔ پہلا اصول تو یوں ٹوٹ گیا کہ دو نبیوں کی موجودگی میں ایک گھٹیا شخص خلیفہ ہو گیا۔ رہی دوسری بات کہ

حضرت علیؓ افضل ہیں۔ وہ بھی غلط ہے کیونکہ معیار افضلیت جو بھی قائم کر دے گے وہ مشترک ہوگی۔ یہ میری جدید تحقیق ہے۔ مختصر سا حصہ آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں مثلاً اگر عینک معیار افضلیت ہو اور عینک آپ کے پاس بھی ہو تو وہ حجت نہیں ہو گی۔ اب حضرت علیؓ کے کمالات کا آپ تجزیہ کریجیئے۔ تو جتنے کمالات آپ دیکھیں گے۔ سب مشترک ہوں گے۔ جب مشترک ہو گئے تو مشترک حجت نہیں بن سکتے۔ مثلاً صحابیت ہے وہ مشترک ہے۔ جہاد ہے۔ یہ مشترک ہے سخاوت ہے وہ بھی مشترک ہے۔ زہد، تقویٰ لیجیئے وہ دونوں میں مشترک ہے۔ مقدار کی کمی بیشی یہ ایک الگ چیز ہے۔ مقدار کی کمی بیشی سے ماہیت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یعنی بہت سا نقلی گھی۔ تھوڑے سے اصلی گھی کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ کنستر کا گھی اور پاؤ بھر گھی اصلیت میں دونوں کی حیثیت ایک ہے دونوں اصلی گھی ہیں۔ اول مقدار ثابت نہیں ہوئی اور اگر ہو بھی جائے تو اصالت میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ یہ قانون میں لے وضع کیا ہے جو آپ کو بتلا رہا ہوں کہ مشترک کمالات حجت ہو ہی نہیں سکتے۔ علم موجب فضلیت تو ضرور ہے۔ مگر موجب افضلیت کسی وقت میں بھی نہیں ہے۔ موسیٰ جیسا جلیل القدر نبی کہہ رہا ہے۔ ہل اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنۡ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمۡتَ رُشۡدًا (کہف - ۶۶) کہ جو علم آپ کو حاصل ہے کیا میں اس کی اتباع کر سکتا ہوں۔ اور تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ موسیٰؑ خضرؑ سے بہت بڑے اور افضل ہیں۔ اگر علم موجب افضلیت ہوتا تو خضر موسیٰ سے افضل ہو جاتے وعلم آدم الاسماء کلھا (بقرہ ۳۱) آدمؑ کو تمام حقائق تعلیم کر دیئے کہ تمام فرشتے عاجز ہو گئے اور انہوں نے کہا۔ قالوا سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا (بقرہ - ۳۲) آدم کو فرشتوں سے بھی زیادہ علم دیا۔ مگر آدمؑ اپنی اولاد "انبیاء" سے افضل نہیں ہیں۔ خصوصاً حضرت

محمد صلعم سے افضل نہیں ہیں" زہد و تقوی" حضرت یحیٰی ؑ کا کتنا زہد ہے شادی تک نہیں کی۔ لیکن وہ حضرت عیسیٰ ؑ سے بھی افضل نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ حضور اکرم صلعم سے" عبادت کی کثرت" نوح ۹ ½ سو برس فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاما چالیس ہزار برس ان میں رہے۔ (عنکبوت - ۱۴) یہ پتہ نہیں بعد میں کتنا رہے۔ بہرحال ۹ ½ سو برس اسی طرح تبلیغ کی جس طرح حضرت صلعم نے ۲۳ برس تبلیغ کی۔ اللہ کی خوشنودی کے لئے نہایت سچے دل سے کی۔ کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر خدا کے احکام کو خدا کی مرضی کے مطابق ۹ ½ سو برس تبلیغ کرنا موجب افضلیت ہوتا تو حضرت نوح ؑ افضل ہو جاتے۔ ظاہر ہے انہوں نے اتنے ہی سال عبادت بھی کی اور حضور صلعم نے کل ۲۳ سال عبادت کی تو ایسی غلط باتیں جو بعض فرقوں نے اپنائی ہیں۔ اور ہمارے لوگ بھی متاثر ہیں۔ یہ اصول ہی سرے سے غلط ہیں۔ اور نہ روحانیت موجب افضلیت ہے۔ روحانیت جتنی عیسیٰ ؑ میں تھی کسی نبی میں نہیں تھی۔

وایدنٰہ بروح القدس (بقرہ - ۸۷) اور ہر وقت جبریل ؑ ساتھ رہا کرتے تھے اور بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ آدھی مادیت تو نکل گئی۔ اور اس مادیت کی جگہ روحانیت ہی آگئی۔ بعض صوفیاء حضرات روحانیت کی افضلیت کی بات کہدیتے ہیں یہ غلط ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ روحانیت کسی نبی میں نہیں تھی۔ نہ ترک گناہ موجب افضلیت ہے۔ حضور ؐ کے زمانے میں جس صحابی نے زنا کیا ان کو رجم کر دیا گیا اور جس نے چوری کی ان کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ جس نے شراب پی ان کے کوڑے لگائے گئے۔ نہ ائمہ اربعہ نے نہ خواجہ معین الدین نے، نہ فرید پاک نے، نہ کبھی چوری کی نہ شراب پی نہ زنا کیا۔ تو چاہیئے کہ یہ ان سے افضل ہو جائیں

لیکن یہ مطیع ان فساق کے

(اس وقت تو انہوں نے فسق کیا نا) کے خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔ تو یہ تمام اصول غلط ہیں عقل سے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتا کہ اللہ کے نزدیک کون افضل ہے یہ یا تو خدا خود بتائے گا یا نبی سے کہلائے گا کہ کون افضل ہے تب ہی معلوم ہوسکتا ہے (ولا تزکوا انفسکم) اپنے کو پاکیزہ اور افضل مت کہو۔ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی وہ جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔ لہٰذا دونوں مقدمہ غلط ہو گئے تو یہ کہنا کہ افضلیت موجب خلافت ہے غلط ہے۔ لہٰذا غیر افضل امام نماز کا بھی ہوسکتا ہے اور جہاد کا بھی ہوسکتا ہے۔ افضل کی موجودگی میں بھی اور تاریخی تجربہ بھی آپ کے سامنے موجود ہے۔ حجاج بن یوسف پر سارا عالم اسلام متفق ہے کہ افسق الفساق تھا لیکن اس کے پیچھے صحابہ نے نماز پڑھی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کتنے بڑے عالم اور زاہد اور متقی تھے مگر یہ خلیفہ نہ بنے۔ ہارون الرشید اور جعفر وغیرہ ہی خلیفہ رہے۔ اسی طرح امام نماز حضرت ابوبکرؓ افضل الامم تھے بالاتفاق اہل سنت مگر رسول اللہؐ سے یہ کتنے گھٹیا ہیں۔ کوئی نسبت دونوں میں قائم نہیں کرسکتے آپ۔ ایک بوند پانی کو سمندر سے نسبت ہے۔ لیکن ابوبکر کے کمال کو نبی کے کمال سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بوند پانی بڑھتے بڑھتے سمندر ہو جائے یا سمندر کم ہوتے ہوتے بوند بن جائے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کتنے بھی بڑھ جائیں نبیؐ کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں لائن الگ الگ ہیں۔ یہ لائن صدیقیت کی ہے وہ لائن نبوت کی ہے اس بات کو مثال سے سمجھیں۔ دھوپ ہے۔ اس میں ہر چیز صاف نظر آتی ہے۔ اسی طرح اس کا جو ظل ہے۔ اس میں بھی ہر شے صاف نظر آتی ہے۔ بظاہر دونوں

یکساں نظر آتے ہیں. لیکن یہ تیز سے تیز ظل اس دھوپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ظل جو ہے وہ دھوپ کے تابع ہے۔ اسی طرح ایمان نبوت کے تابع ہے۔ دھوپ کے بغیر ظل نہیں ہو سکتا اسی طرح ایمان بغیر نبوت کے نہیں ہو سکتا. نماز دونوں پڑھتے نظر آرہے ہیں. مگر دونوں کی نمازوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ یہ صدیقیت نبوت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تو حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے حضرت نبیؐ نے دو مرتبہ نماز پڑھی۔ اب یہاں بہت بڑا مقدس آدمی ہو اور بڑے سے بڑا فاسق ہو تو دونوں میں نسبت قائم ہو جائے گی. کم سے کم ایمان کی. حضرت غوث پاکؒ اور خواجہ معین الدین بھی مسلمان تھے اور آجکل کا شرابی زانی بھی مسلمان ہے تو مسلمان ہونے میں تو یہ اور وہ برابر ہو گئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاسق اور وہ ایک وقت جنت میں جا کر جمع ہو جائیں۔ تو یہ فاسق حضرت غوث پاک سے اتنا گھٹیا نہیں ہے جتنے ابوبکر رسول اللہؐ سے ہیں۔ تو جب رسول اللہؐ نے اپنے سے اتنے گھٹیا کے پیچھے نماز پڑھ لی تو اگر یہ مقدس ہستیاں ایک فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو کیا ڈر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے اور مجھے بھی، اب آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ
مبتلیکم بنهر فمن شرب منه فلیس منی
ومن لم یطعمه فانه منی الا من اغترف
غرفة بیده فشربوا منه الا قلیلا منهم
فلما جاوزه هو والذین امنوا معه قالوا
لا طاقة لنا الیوم بجالوت وجنوده قال
الذین یظنون انهم ملٰقوا اللہ کم من
فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ
واللہ مع الصٰبرین ۝ (بقرہ - ۲۴۹)

فلما فصل طالوت بالجنود جب طالوت لشکر لے کر اپنی حد اور اپنے شہر سے باہر نکلا تو اس نے کہا۔ قال ان اللہ مبتلیکم بنھر۔ فمن شرب منہ فلیس منی ومن لم یطعمہ فانہ منی۔ تو اس نے یہ کہا کہ اللہ جو ہے تمہارا امتحان نہر سے لے گا۔ پس جس شخص نے اس نہر سے پانی پی لیا تو وہ میرے میں سے نہیں ہے اور جس نے اس کو زبان تک پر نہیں رکھا۔ اس کو چکھا نہیں لم یطعمہ جس نے اس کو طعام نہیں کیا۔ اور چکھا نہیں۔ فانہ منی وہ مجھ میں سے ہے۔ الا من اغترف غرفۃ بیدہ مگر جس نے اپنے ہاتھ سے ایک چلو لے لیا۔ وہ مستثنیٰ ہے فشربوا منہ تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس نہر سے پانی پی لیا۔ الا قلیلا منھم سوائے ان میں سے چند کے۔ کہ چند نے نہیں پیا اس نہر سے۔

طالوت جب لشکروں کو لے کر چلا تو اس نے کہا لوگوں سے کہ جو مکان بنوا رہا ہے وہ میرے ساتھ نہ چلے اور جو تجارت کر رہا ہے وہ میرے ساتھ نہ چلے جو کاروبار میں مصروف و مشغول ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہے یہ تقسیم کار ہے نا۔ انجینئر کو لے جائے گا تو یہاں کا کام رہ جائے گا۔ تجارت والوں کو لے جاتے گا تو بربادی ہوگی۔ کاروبار ختم ہو جائے گا۔ کام تقسیم ہے۔ لڑنے والی جماعت الگ ہو اور کام کرنے والا جو کام کر رہا ہے کرے۔ جبکی شادی ہوئی ہے نئی وہ شادی میں مشغول ہے اسے بھی نہیں جانا چاہیئے۔ تو کافی تعداد میں ۸۰ ہزار کے قریب آدمی جمع ہو گئے اس کے لشکر میں۔ ان کو لے کر وہ چلا تو جب یہ چلا تو قال ان اللہ مبتلیکم بنھر تو اس "قال" کے معنی ہیں اس نے کہا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ طالوت نے کہا۔ یا اس لشکر میں وہ نبی جس نبی نے طالوت کو مقرر کرایا تھا۔ خلیفہ اور امام۔ اس نے کہا دو گروہ ہیں علماء کے۔

ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ طالوت نے کہا۔ کیونکہ قرآن کا لفظ یہ ہے کہ

جب طالوت لشکر لے کر چلا۔ اپنے شہر سے جدا ہوا تو اس کے بعد کہا کا لفظ آیا تو
'کہا' کا کہنے والا جو ہے ظاہر یہ ہے کہ طالوت ہے۔

ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نہیں۔ ان سے نبی نے یہ کہا کہ اللہ تمہارا نہر کے بارے
میں امتحان لے گا۔ نہر سے امتحان لے گا۔

یہ دونوں معنی لگتے ہیں۔

اگر طالوت نے یہ کہا کہ اللہ تم کو نہر سے آزمائے گا تو طالوت کے پاس وحی آئی
اور طالوت نبی ہو گیا۔ اور اس نبی نے یہ کہا تو طالوت نبی نہیں رہا۔ اب یہ کہ تم کو آزمائے
گا تمہارا امتحان لے گا۔ نہر سے۔ تو وہ نہر جو ہے وہ فلسطین اور اردن کے درمیان
ہے۔ بعض علمار کے نزدیک فلسطین کی نہر ہے اور ایک جماعت علمار کی یہ کہتی
ہے کہ جب یہ چلے ہیں تو گرمی بہت شدید تھی۔ جنگل میں چلے جاتے تھے۔ بہت
پیاس لگ رہی تھی تو انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ تم پانی کا کوئی انتظام کرو۔ ہمارے
لئے ایک نہر جاری ہو تو خلاف عادت معجزانہ طریقہ پر اللہ پاک نے ایک نہر جاری
کر دی اور اس نہر سے۔ نہر کے بارے میں امتحان لیا۔ گویا نہر کا مطالبہ ہوا۔ نہر کا معجزہ
گویا مانگا۔ جب معجزہ مانگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت یہ جاری ہوئی ہے کہ معجزہ
کے بعد نہایت سخت امتحان لینا ہے۔

اذ قال الحواریون یا عیسی ابن مریم هل یستطیع ربك ان ینزل
علینا مائدۃ من السماء۔ (مائدہ ۱۱۲)

حواریوں نے یہ کہا کہ اے عیسیٰؑ ہمارے لئے آسمان سے ایک خوان تیرا رب
اتار سکتا ہے۔

قال اتقوا اللہ ان کنتم مومنین

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ ڈرو اللہ سے اگر مومن ہو تو۔ خدا کی شان میں

ایسی بات نہ کہو کہ وہ ایسا کرسکتا ہے کہ نہیں۔ وہ تو سب ہی کچھ کرسکتا ہے۔

قالو نرید ان ناکل منہا وتطمئن قلوبنا۔ (مائدہ۔ ۱۱۳)

وہ کہنے لگے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں کھائیں اور ہمارا دل مطمئن ہو۔ تو حضرت عیسٰے نے ان کے لئے دعا کی۔

قال عیسٰی ابن مریم اللھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء

اے ہمارے پروردگار تو ہمارے اوپر آسمان سے ایک خوان اتار۔

تکون لنا عیدا لاولنا واٰخرنا واٰیۃ منک۔ (مائدہ۔ ۱۱۴)

تاکہ وہ ہمارے پہلے اور پچھلے سب کے لئے ایک عید اور خوشی کی چیز ہو اور تیری طرف سے ایک معجزہ اور آئے۔ وارزقنا وانت خیر الرازقین اور ہم کو رزق عنایت کر تو ہم کو بہترین رزق دینے والا ہے۔ قال اللہ انی منزلہا علیکم اللہ نے فرمایا کہ نازل کروں گا میں تمہارے اوپر خوان فمن یکفر بعد منکم پھر اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کیا۔ فانی اعذبہ عذابًا لا اعذبہ احد من العالمین تو میں اس کو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ عالم میں کسی کو نہیں دیا تھا۔ (مائدہ۔ ۱۱۵)

تو گویا معجزہ کے بعد جو انکار ہوتا ہے وہ اللہ کے عذاب کا سبب ہوتا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام عالم کے لئے رحمت ہیں۔ اس لئے ایسا بیّن معجزہ ان کے ہاتھ سے نہیں ہوا۔ پھر لوگ انکار لازمی کرینگے۔ پھر لازمی طور پر عذاب آئے گا اور قوم تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے ایسے بیّن معجزے ہمارے نبیؐ پر نہیں آئے۔ جیسے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام یا حضرت موسٰیؑ کے تھے۔ وہ زیادہ بیّن معجزے تھے۔ کیونکہ ان قوموں کو تباہ و برباد کرنا تھا۔ اور اس قوم کو باقی رکھنا تھا۔ اس لئے ایسا بیّن معجزہ نہیں آیا۔ معجزہ ضرور ہوا۔ لیکن اتنا بیّن نہیں کہ اس کے انکار پر عذاب آجائے۔

تو جب انہوں نے نہر کی درخواست کی اللہ تعالٰے

نے کہا اچھا نہر جاری کر دیتا ہوں
لیکن یہاں تمہارا امتحان ہو گا۔ اور تمہیں مبتلا کروں گا آزمائش کروں گا جس نے اس
نہر سے پانی پی لیا۔ اس نہر سے پانی پینے کے معنی یہ کہ نہر میں منہ ڈال کر پانی پی لیا۔
فمن شرب منه فلیس منی ۔ جس نے اس نہر سے پانی پی لیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔
یعنی میرے دین میں سے نہیں ہے۔ یا وہ میرے ساتھ جالوت سے لڑنے جانے کے
لئے نہیں ہے۔ اس قابل نہیں ہے کہ وہ جہاد اور قتال میں میرے ساتھ جائے۔ ومن لم
یطعمه اور جس نے اس کو چکھا تک نہیں۔ فانه منی وہ مجھ میں سے ہے اور یہ
استثنیٰ کر دیا الا من اغترف غرفة بیدہ کہ اگر وہ چلو لے کر اپنے ہاتھ سے پی لے
استعمال کر لے تو جن لوگوں نے چلو لیا تھا اس چلو کو زبان پر لگاتے ہی ان کی پیاس بجھ
گئی۔ اور ان کے جانوروں کی ۔ ان کے تمام ساتھیوں کی۔ اس چلو میں اتنی برکت ہوئی
کہ وہ سب کے لئے گویا کافی ہو گیا اور اکثر جماعت جو تھی وہ اس میں کود پڑی۔ پیاس
کی وجہ سے اور انہوں نے خوب منہ ڈال کر پیا۔ ان کے کالے منہ ہو گئے اور بہت بزدل
ہو گئے۔ اور لڑائی پر جانے کے قابل نہ رہے۔ یہ اس کا شان نزول ہے۔

اب اس کے معنی پر آپ غور کریں کہ " اللہ تعالےٰ نہر سے تمہارا امتحان لے
گا۔" اس امتحان کے معنی یہ ہیں کہ ایک جماعت علماء کی یہ کہتی ہے کہ اس لئے یہ امتحان
ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ وہ معجزہ کو دیکھ کر بھی انکار کیا کرتے تھے اور
نبی کی فرماں برداری نہیں کیا کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالےٰ نے پہلے سے ان کا امتحان
لے لیا کہ ان میں کون شخص ہے جو جہاد کرے گا۔ اور کون ہے جو جہاد سے بھاگے گا اس
لئے ان کو پیاس میں مبتلا کیا۔ پیاس کے وقت پانی پینے سے روک دیا۔ تو جب اس

مصیبت تکلیف اور پیاس کا عادی ہو جائے گا۔ تو ممکن ہے کہ میدان جنگ میں جنگ کا اور قتال کا بھی عادی ہو جائے گا۔ اور ایک وجہ یہ بیان کی ہے علمائے کہ ان کو مصیبت پر اور شدت پر صبر کرنے کی عادت ہو جائے اس لئے یہ امتحان لیا۔ یہ دو باتیں بیان کیں ہیں۔

لیکن میرے خیال میں یہ دو رائیں جو ہیں یہ صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو امتحان لینے میں اور تکلیف دینے میں کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کا چاہے وہ امتحان لے لے۔ جو چاہے سو کہہ دے جو چاہے سو کر دے۔ دونوں باتوں کا اس کو اختیار ہے۔ وہ کسی وجہ کی بنا پر حکم نہیں دیتا۔ بلکہ یفعل ما یرید جو ارادہ وہ کر لیتا ہے۔ اس ارادہ کے مطابق وہ حکم دیتا ہے یفعل ما یشاء جو چاہتا ہے وہ فعل کر دیتا ہے۔ (آل عمران ۴۰) اس کا فعل اور حکم صرف اس کی مشیت اور اس کے ارادہ کے تابع ہے کسی وجہ کے تابع نہیں ہے۔

اب یہاں بڑے بڑے لوگ جو ہیں ائمہ۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ جو امتحان ہے امتحان اس لئے ہوتا ہے کہ شے ظاہر ہو جائے۔ یعنی جو اس کی حالت ہے کہ یہ اس قابل ہے یا نہیں۔ شے کے ظہور کے لئے ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل بات ہے۔ امتحان جو کرتا ہے۔ کوئی شخص کسی شخص کا یا کسی چیز کا وہ اس شے کے ظاہر ہونے کے لئے کیا کرتا ہے۔ اور جب وہ شے کے ظاہر ہونے کے لئے کرتا ہے۔ تو یہ شے کا ظاہر ہونا ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ عمل نہ کرے۔ یعنی جب تک وہ عمل نہ کرے اس وقت تک اس شے کا ظہور نہیں ہوتا۔ امتحان شے کے ظاہر ہونے کے لئے ہے کہ یہ ثابت قدم ہے یا یہ بزدل ہے۔ اس چیز کے اظہار کے لئے امتحان ہو رہا ہے۔ تو یہ امتحان ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ عمل نہ ہو۔ لوگوں کا عمل جب تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک ان کو عمل کرنے کا حکم نہ دیا جائے۔

یہاں جو امتحان ہے یہ درحقیقت خدا کا حکم اور خدا کی تکلیف ہے۔ اس تکلیف کا نام اس نے امتحان رکھ دیا۔ اس وجہ سے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کے بعد سزا اور جزا دے گا۔ تو خدا تعالیٰ اپنے علم پر سزا اور جزا نہیں دیتا جب تک ان سے وہ عمل ظاہر نہ ہو جائے جو ثواب کا یا عذاب کا موجب ہے۔ اور عمل جب ہوگا جب اس کا حکم ہوگا۔ تو معلوم یہ ہوگیا کہ امتحان کے یہاں معنی حکم دینے اور تکلیف دینے کے ہیں۔ یہاں جو امتحان کا لفظ بولا ہے اللہ پاک نے مبتلیکم کے معنی ممتحینکم کے ہیں۔ اللہ تمہارا ممتحن ہے۔ امتحان لینے والا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب اور عقاب اپنے علم پر نہیں دیتا۔ جب تک کہ وہ عمل ظہور میں نہ آئے۔ خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص کو عذاب ہوگا اور فلاں کو ثواب ہوگا۔ یہ سب اس کو علم ہے۔ لیکن ثواب وعقاب وہ دے گا نہیں۔ جب تک کہ وہ شخص" عمل نہ کرلے ثواب کا یا عذاب کا۔ جیسا کہ ابوجہل ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ اسے عذاب ہوگا لیکن اس کو عذاب نہیں دے گا۔ جب تک اس کو ایمان لانے کا حکم نہ دے دے پہلے۔ اور وہ عمل کرے گا کفر کا۔ تو پھر اسے وہ عذاب دیگا۔ اور کوئی عمل کرے نیکی کا اور ثواب کا تو پھر اس کو ثواب دے گا۔ تو گویا خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم پر سزا اور جزا نہیں دیتا۔ بلکہ جب وہ عمل ظاہر ہو جاتا ہے اس وقت دیتا ہے۔ تمام علماء کا اتفاق ہے اس پر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم پر سزا اور جزا ثواب اور عقاب نہیں دیتا جب تک کہ وہ عمل ظاہر نہ ہو جائے۔ یہ اصول ہے تمام علماء کا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اصول غلط ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم پر ثواب اور عقاب نہیں دیتا۔ یعنی بغیر عمل کے سزا اور جزا نہیں دیتا۔

نئی بات اور عجیب بات ہے یہ بات تمام علماء میں مشہور ہے۔ مگر یہ ہے

بالکل غلط۔

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں ساتھ چلے تو پہلی بار تو انہوں نے ایسا کیا کہ انہوں نے کشتی کو توڑ دیا۔ جب وہاں سے فارغ ہو گئے اور آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا انوکھا کام کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہ نہیں رہ سکو گے۔ میری بات پر ٹھہر نہیں سکو گے۔ صبر نہیں کر سکو گے۔ تو انہوں نے کہا کہ معاف کرو۔ مجھے۔ میں اب ایسا نہیں کروں گا۔

قال لا تؤاخذنی بما نسیت (کہف۔۷۳) آپ میری بھول کو معاف کر دیجئے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ ولا ترھقنی من امری عسرا ۔ اور میرے معاملہ میں مشکل نہ ڈالیے یعنی ایک چیز پیش نظر رکھ کے اور گرفت کر کے میری۔ اپنے سے جدا نہ کیجئے۔ فانطلقا پھر چلے دونوں۔ حتیٰ اذا لقیا غلٰما ان دونوں کو ایک بچہ ملا۔ فقتلہ خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا۔ تو یہ دیکھ کر ان کو بڑا غصہ آیا۔ قال اقتلت نفسا زکیۃ بغیر نفس۔ تم نے قتل کر دیا ایک بے گناہ اور معصوم بچے کو۔ بے گناہ لقد جئت شیئا نکرا۔ تم نے بڑا برا کام کیا۔ (کہف۔۷۴)

اب جو اس کی تاویل ہوئی ہے۔ یہ جو فعل ہوا اسکی وجہ انہوں نے بعد میں بتائی کہ کشتی تو اس لئے توڑ دی تھی کہ سالم کشتیوں کو وہاں کا بادشاہ غصب کر لیتا تھا ان بیچاروں کو نقصان ہوتا۔ ٹوٹی ہوئی کشتی دیکھ کر چھوڑ دیا ان کو۔ اور اس بچہ کو جو ہم نے قتل کیا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ فکان ابوہ مومنین فخشینا ان یرھقھما طغیانا وکفرا (کہف۔۸۰)۔ اس کے ماں باپ جو تھے مومن تھے۔ دیندار تھے۔ تو ہمیں یہ ڈر ہوا ہمیں یہ خیال ہوا کہ بڑے ہو کر اپنے ماں باپ کو کفر میں گناہ اور معصیت میں مبتلا نہ کر دے۔ اس خیال سے ہم نے اس کو مار ڈالا۔ تو اس بچہ کو بغیر عمل کئے قتل کر دیا۔

تو تمہارا یہ کہنا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سزا نہیں دیتا۔ بغیر عمل کئے تو وہاں اس

غلام نے تو کچھ عمل نہیں کیا تھا۔ اب رہ گئے حور اور فرشتے۔ ان کو کبھی حکم نہیں دیا کہ تم عبادت کرو یا نیکی کرو یا ایمان لاؤ۔ جیسا کہ اور جماعتوں کو حکم دے رکھا ہے۔ ان کو حور دل کو کوئی حکم نہیں دیا عبادت کا۔ انہوں نے کوئی عبادت نہیں کی اور ان کو بغیر عمل نیک کے جنت الفردوس میں رکھا اور کتنی آسائش اور راحت میں رکھا۔ تو وہ اصول ٹوٹ گیا یہ کہنا کہ اللہ تعالےٰ بغیر عمل کے ثواب اور عقاب نہیں دیتا یہ غلط ہے۔ غلطی کو میں نے آپ کو بتا دیا۔

اللہ تبارک کے متعلق چونکہ ایک مخیلہ یہ قائم ہو گیا پڑھے لکھے لوگوں کا خاص کر ذی علم لوگوں کا کہ اس کے کام میں کوئی مصلحت ہو فائدہ ہو۔ کوئی مقدس چیز ہو انہوں نے گویا اپنے رب کو ایک معقول انسان پر قیاس کر کے جو ایک معقول انسان کے افعال ہیں ویسا ہی اپنے رب کو جانچا۔ حالانکہ وہ معقول اور نامعقول دونوں انسانوں کا خالق ہے اس لئے اس میں دونوں خصلتیں نہیں ہونے کی۔ جیسے عام تہذیب میں ہے کسی بے گناہ کو دکھ دینا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اب خدا کے متعلق تو بہت ہی زیادہ ہونا چاہیئے کہ وہ بے گناہوں کو دکھ نہ دے حالانکہ یہ غلط ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ مبتلائے مصیبت انبیا ہوتے ہیں۔ پھر اولیا ہوتے ہیں۔ پھر ان جیسے۔ پھر ان جیسے بہرحال اکابرین زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نبی سب معصوم اور بے گناہ ہیں انہیں جا کسی کی تکلیف دیتا ہے۔ اور بہت سے نبی جو ہیں وہ قتل کر دیئے گئے وہ دیکھتا رہا تو بتاؤ کہ اللہ پاک ان کو روک سکتا ہے یا نہیں روک سکتا۔ بولو کیا کہتے ہو نبیوں کو جو لوگ بے گناہ قتل کر رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کو قتل ہونے سے روک سکتا ہے یا نہیں روک سکتا۔ اگر یہ کہو نہیں روک سکتا تو عاجز ہو گیا۔ اللہ۔ اگر کہو روک سکتا ہے اور پھر نہیں روکا تو معلوم ہو گیا کہ پھر وہ اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ اب انبیاء بیگناہ ہیں ان کو دکھ پہنچ رہا ہے یا نہیں پہنچ رہا ہے تمام

جانور کھانے پینے کے جو ہیں۔ گائے بکری وغیرہ یہ سب بے گناہ ہیں۔ ان کو برابر مار رہا ہے۔ کینسر اور خبر نہیں کیا کیا بیماریوں میں ختم کر رہا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کو اپنے خیال کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ ہم میں جو چیز اچھی ہے ہم اپنے رب میں بھی دیکھ لیں۔ نہیں۔ جس کو وہ اچھا کہہ دے وہ اچھا ہے۔

اللہ کے متعلق ایسا مخیلہ قائم کر لیا اس بنیاد پر یہ اصول گھڑے گئے ہیں۔ تو بعض تو ٹھیک ہیں بعض غلط ہیں۔ ٹھیک جو ہیں وہ وہی ٹھیک ہیں جبکی اس نے اجازت دے دی ہے اور جہاں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اجازت نہیں دی ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہیں اور جن کی ممانعت کر دی وہ بالکل غلط ہے۔

تو کسی معقول اور مہذّب انسان کے متعلق جو مخیلہ ہو وہ اپنے رب کے متعلق مخیلہ نہیں قائم کرنا چاہیئے۔ ان کا رب جو ہے وہ پاک ہے ان تمام چیزوں سے۔ ایک ہی فعل ہے کہ وہ اگر آپ کریں تو بُرا ہے وہ کرے تو اچھا ہے۔ بے گناہ کو آپ دکھ دیں تو آپ ظالم اور وہ بے گناہ کو دکھ دے تو وہ رحیم۔ مشاہدہ موجود ہے روزانہ لاکھوں گائیں بکریاں وغیرہ ذبح ہو رہی ہیں۔ یہ بے گناہ ہیں ان کو دکھ پہنچ رہا ہے۔ لاکھوں بچے مر رہے ہیں ان کو دکھ پہنچ رہا ہے۔ اب کسی کے گھر کے سامنے کوئی بچہ یا آدمی پیاسا مر جائے اور وہ پانی مانگے اور گھر والا دیکھتا ہو اسے کہ پیاسا مر رہا ہے بھوکا مر رہا ہے اور گھر میں لاکھوں من کھانا ہو۔ روپیہ اور پیسہ سب جمع ہو۔ اور ایک گھونٹ پانی کا اس کے منہ میں نہ ڈالے اور ایک ٹکڑا روٹی کا نہ ڈالے تو ساری دنیا اس کو کہے گی کہ بڑا بخیل ہے۔ کنجوس ہے۔ پاجی ہے کہ اس کے گھر کے سامنے بچہ بھوکا پیاسا مر گیا۔

تو یہ فعل وہ خود بھی دیکھ رہا ہے۔ ہزاروں من پانی بھی لا سکتا ہے۔ روٹی بھی لا سکتا ہے۔ اور بغیر ان چیزوں کے وہ دکھ دور بھی کر سکتا ہے۔ یہ سب خدا دیکھ رہا

ہے اور کر رہا ہے۔ اسے کوئی نہیں کہنے کا کہ تو ظالم ہے۔ اور تیری نگاہ میں یہ سب فعل ہو رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کے متعلق اپنے اوپر قیاس مت کرو۔

تو اللہ تعالیٰ کو حق ہے اس نے امتحان کر لیا اس میں کیا حرج ہے یہ امتحان اس لئے ہو رہا ہے کہ میدان جنگ میں کون ثابت قدم رہتا ہے۔ تو میدان جنگ میں وہ جاتے پھر وہاں سے بھاگتے تو جب ہی حال کھل جاتا۔ پہلے سے امتحان کی کیا ضرورت تھی۔ یہ امتحان اس لئے ہو رہا ہے کہ کون وہاں ڈٹ کر لڑتا ہے۔ کون وہاں سے بھاگتا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہاں جاتے جو بھاگتے ان کو سزا دیتا۔ جو نہیں بھاگتے انعام دے دیتا۔ یعنی اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے اللہ کو حق ہے کہ وہ جہاد کا حکم دے رہا ہے۔ یہ الگ ہے اور اس سے پہلے ان کو ایک اور مصیبت میں ڈالا۔ ان کا امتحان لیا۔ اس کو امتحان لینے کا حق ہے۔ جو چاہے سو حکم دے دے بے وجہ ان الله مبتليكم بنهر اللہ تعالیٰ نہر سے تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور وہ امتحان کیا ہے۔ وہ امتحان یہ ہے کہ تم نہر سے منہ لگا کر پانی نہ پیو ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے ایک چلو پانی لے لو۔ تو اب جن لوگوں نے چلو لیا تھا اس میں اتنی برکت ہوگئی کہ گویا نہر سے بھی زیادہ۔ وہ ساری نہر پی جاتے تب بھی پیاس نہ بجھتی۔ کیونکہ حکم الہٰی کے خلاف کیا انہوں نے اس لئے کہا فليس منى یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔ اب یہاں نکتہ کی بات ہے ذراسی۔ یہ فرمایا کہ ومن لم يطعمه جس نے اس پانی کو چکھا تک نہیں وہاں تو یہ تھا فمن شرب منه جس نے اس نہر سے پانی پیا۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ ومن لم شربوه جس نے اس نہر سے پیا نہیں بلکہ اس پانی کو نہیں چکھا کہا جس نے پانی کو چکھا ہی نہیں۔ پانی کی صورت یہ ہے۔ نہر میں تو منہ لگایا نہیں۔ اس نے ہاتھ میں پانی بھر کے پی لیا تو منہ میں لے لیا۔ کلی ولی کر کے یا غرارا وغیرہ کر کے۔ وہ ' يطعمه ' میں آگیا۔ اس نے پانی چکھ لیا۔ خواہ وہ پیا نہیں۔ کلی

کردی ہے۔ اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ پیا بلکہ چکھا۔ تو چکھنے کی بھی ممانعت کرتا ہے۔ اب دقّت کیا ہے۔ یہاں بڑی دقّت ہے۔ اس دقت پر متقدمین مطلع نہیں ہوئے۔ یہاں یہ دقّت ہے کہ ایک "غرفہ" ایک چلو پانی کی اجازت دیدی۔ وہ چلو کتنا ہی کم سہی زبان سے تو لگا دے گا تو "لیطعمہ" ہو گیا۔ چکھ ضرور لیا۔ تو جس نے چکھ لیا۔ یہاں کہہ رہا ہے کہ جس نے نہیں چکھا وہ مجھ میں سے ہے تو جو چکھ لے گا وہ مجھ میں سے نہیں ہونے کا۔ اور ادھر چکھنے والے کو جو ایک چلو میں چکھنے والا ہے۔ اجازت دے دی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ یہ ایسی دقت ہے جسے

حل نہیں کر سکتا۔ ذی علم آدمی۔ بڑا بڑا عالم حل نہیں کر سکتا۔ کیا کہہ رہا ہے وہ۔ جب یہ کہا، فمن شرب جس نے پانی پیا۔ یعنی منہ لگا کر پینا تو اس میں شامل ہے۔ منہ کے معنی من النهر نہر سے پیا۔ یعنی نہر میں منہ ڈال کر پیا۔ اور اگر پانی لے کر گلاس میں پیا تو وہ اس میں شامل ہی نہیں ہے۔ اور جب احتمال تھا شامل نہ ہونے کا۔ کیونکہ حنفی مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی قسم کھالے کہ میں اس نہر سے پانی نہیں پیوں گا اور وہ پانی نکال کر گلاس میں پی لے تو یہ قسم توڑنے والا نہیں ہے۔ قسم جب ٹوٹے گی جب منہ ڈال کر پیئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ گلاس میں پانی بھر کے وہ پی لے تو وہ منہ میں شامل نہیں رہا۔ تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا ومن لم یطعمہ جس نے اس میں سے چکھا تک نہیں۔ اس کو گویا یہ پتہ چل گیا کہ گلاس میں نکال کر پیئے گا۔ تو وہ بھی گویا ملعون۔ ناجائز ہے۔ یا برا ہے۔ فاسق ہے یا فاجر ہے یہ معنی ہیں اس کے۔

اب دقّت یہ ہے جو میں نے آپ کو بتائی کہ الا من اغترف غرفۃ وہ چلو سے لے کر استعمال کرلے وہ مستثنیٰ ہے۔ اس کی اجازت ہے۔ مگر چلو جب منہ کو لگے گا تو ضرور چکھے گا۔ اور جب چکھے گا تو جو نہ چکھنے والا ہے وہ تو مجھ میں سے ہے

چکھنے والا مجھ میں سے نہیں ہونے کا۔ اور وہاں یہ کہا کہ جو اس نہر سے پئے وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔ اور یہاں جو چکھنے والا ہو گا وہ بھی اسی میں شامل ہو جائے گا یہ تق ہے۔

تو معنی کیا ہیں آیت کے آپ سمجھ لیں۔" ان اللہ مبتلیکم بنھر" بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لے رہا ہے نہر سے فمن شرب منہ فلیس منی "جس نے اس نہر سے پانی پی لیا وہ مجھ میں سے نہیں ہے" مگر جس نے چلّو بھر لیا۔ اس کو استثنیٰ کر دیا۔ یہ ٹکڑا استثنیٰ کا وہ پہلے سے لگتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ فمن شرب منہ فلیس منی الا من اغترف غرفۃ بیدہ اور بیچ میں یہ ٹکڑا آ گیا ومن لم یطعمہ فانہ منی اس میں بیچ میں ٹکڑا لانے میں حکمت یہ ہے کہ بہت زیادہ گویا ارادہ ہے اس بات کا کہ اس میں سے نہ پیا جائے تو اب کیا حل ہوا اس کا۔ حل اس کا یہ ہے۔

کہ جس نے اس میں سے یعنی نہر میں پانی پی لیا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے چلّو بھر لیا ہے۔

بات تو یہ ہے کہ جو لے زبان تک نہ لگائے وہ ہے اصل میں۔ صابر، ضابط اور میرا بندہ۔ ویسے خیر میں نے اجازت دے دی کہ ایک چلو لے لے۔ اب معاملہ حل ہو گیا۔

اب ترجمہ یوں کیا جائے کہ جس نے زبان سے چکھا تک نہیں۔ وہ کامل اور مکمل بندہ ہے اور جو پئے گا۔ وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔ اور جو چلو بھر لے گا اس کو میں نے استثنیٰ کر دیا۔ اب فرق معلوم ہو گیا مقام مشکل تھا میں نے اس کو حل کر دیا۔ فشربوا منہ الا قلیلا منھم پانی پی لیا اس نہر سے تقریباً بہت لوگوں نے سوائے ان میں قلیل اور چند کے۔ بعض روایتوں میں چار ہزار ہے۔ لیکن زیادہ معتبر یہ ہے کہ ۳۱۳ آدمی تھے جتنے جنگ بدر میں تھے۔ سوائے چند کے وہ چند ۳۱۳ تھے فلما جاوزہ ھو والذین

آمنو معہ جب عبور کیا نہر کو طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے جو عبور کرنے میں اس کے ساتھ تھے۔ قالو لا طاقۃ لنا الیوم جب یہ عبور کر کے آگے چلے کہنے لگے کہ ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں ہم صرف ۳۱۳ آدمی ہیں۔

اب یہاں یہ بات ہے کہ عبور کرنے والے تھے مومن اور پہلے بھی مومن کا لفظ آیا ہے۔ والذین آمنو امعہ طالوت کے ساتھ جو مومن تھے جب وہ اس نہر کو پار کر چکے تو اس کے بعد انہوں نے یہ کہا تو ایسا کہنا علامت نفاق کی ہے کہ ہم میں کہاں طاقت؟ اور چونکہ وہ صابر۔ ضابط تھے، مومن تھے تو ان کو کچھ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ یا ان کو کم سے کم ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی کہ ہم میں کہاں برداشت ہے کہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کریں۔ تو ظاہر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پانی پیا تھا۔ انہوں نے یہ وجہ بیان کی کہ ہم میں اس کے لشکر کی طاقت نہیں ہے۔ اس ہم پی کر سیدھے اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے اس نہر سے پانی پی لیا۔ تو جب پوچھا کہ کیوں پیا نہر میں سے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس لشکر سے۔ جالوت اور بادشاہ سے لڑنے کی تاب و طاقت نہیں ہے۔ اس لیئے ہم تو یہیں ٹھہر گئے اور پانی پیتے ہیں۔ تو گویا یہ پار ہونے والے نہیں ہیں۔ اور یہاں آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہر کو پار کر کے جو لوگ آئے تھے انہوں نے یہ کہا۔ لا طاقۃ لنا الیوم ـــــ آج ہم میں لڑنے کی طاقت نہیں تو جب یہ لوگ پار کر چکے۔ کون؟ مومن۔ طالوت۔ نبی اور یہ لوگ جو ان کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں لڑنے کی تاب و طاقت نہیں ہے۔ تو جب انہوں نے یہ لفظ کہا تھا۔ تو اس کا نبی نے یہ جواب دیا۔ قال الذین یظنون انہم ملاقو اللہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی ملاقات کا گمان کرتے ہیں یا جنہیں

ظن تھا۔ اپنے رب سے ملنے کا۔ کہا انہوں نے کم من فئۃ قلیلۃ غلبت کثیرۃ باذن اللہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ تھوڑی سی جماعت بہت بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہے بحکم الٰہی۔ تم اس خیال میں بھی نہ رہو کہ ہم اتنی تاب و طاقت نہیں رکھتے۔ اکثر تھوڑی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ان کی مدد فرماتا ہے۔

☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ ۞ (البقرہ)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ حی ہے اور قیوم ہے۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند
سب اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کوئی اسکی بارگاہ میں سفارش نہیں کرسکتا
بلا اسکی اجازت کے۔ وہ ان کے آگے اور پیچھے کی سب باتیں جانتا ہے۔ اس کے علم کا
کوئی جز بھی کوئی نہیں جان سکتا۔ مگر جتنا وہ چاہتا ہے۔ اسکا تصرف زمین اور تمام آسمانوں
پر ہے۔ اور انکی تدبیر اسکو نہیں تھکاتی۔ اور وہ بڑا عالی مرتبت اور عظمت والا اور شان والا ہے

فائدہ۔ رسول مقبول صلعم نے فرمایا کہ جو شخص آیتہ الکرسی سوتے وقت پڑھ
لے گا۔ وہ اور اسکے پڑوسی رات بھر مامون و محفوظ رہیں گے۔ اور جو شخص اس کو پڑھے
گا تیس دن تک اس گھر میں شیاطین کا داخلہ نہیں ہوگا۔ اور چالیس دن تک کوئی ساحر
ساحرہ اس کے گھر میں نہیں آئے گی۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جنگ بدر
میں مجھے خیال آیا کہ دیکھوں حضور صلعم کیا کر رہے ہیں تو میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں یاحی
یاقیوم پڑھ رہے ہیں اور کئی بار میں نے دیکھا کہ آپ اسی حالت میں ہیں اور یہی پڑھ رہے
ہیں۔ یہاں تک کہ فتح ہوگئی۔

يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ

کے معنی تمام علمائے متکلمین نے یہ بتائے ہیں کہ جس شے میں صلاحیت علم و قدرت
کی ہو وہ حیّ ہے۔ صلاحیت کی قید اس لئے لگائی کہ کبھی آدمی سوتا بھی ہے اس وقت

اس میں علم و قدرت نہیں ہوتی مگر وہ حی ہوتا ہے۔ اس میں دِقّت یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے آپ کو حی کہا ہے۔ اور جانور بھی حی ہیں۔ یہ ایسا حی ہونا کوئی کمال نہیں ہے۔ اللہ پاک کی صفت تو بہت افضل ہونی چاہیئے۔

امام فخرالدین رازیؒ نے یہ فرمایا کہ جب کوئی شے اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کو حی کہا جاتا ہے۔ انسان اور جانور اپنے کمال کو پہنچ گئے اس کا نام حیات ہے اور اللہ پاک چونکہ اکمل ہے اس لئے اس نے اپنے آپ کو حی کہا۔ میں نے یہ کہا کہ یہ کمال بھی مشترک ہے۔ انسان میں اور جانور میں کوئی ایسی تخصیص ہونی چاہیئے جو خدا میں ہو اور کسی میں نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ حیات نام ہے حس و حرکت کا۔ ڈاکٹر دل کی حرکت دیکھتا ہے۔ حرکت پاتا ہے تو کہتا ہے زندہ ہے حرکت نہیں پاتا تو کہتا ہے مردہ ہے ایک حرکت ہوتی ہے جسمانی اس میں حس و حرکت ہوتی ہے۔ اور ایک حرکت ہوتی ہے نورانی اس میں حرکت نہیں ہوتی نہ حس ہوتی ہے۔ جیسے فرشتوں کی ابدال کی۔ جسمانی حرکت کو مسافت طے کرنے کے لئے وقت چاہیئے۔ نورانی حرکت کے لئے زمانے کی ضرورت نہیں وہ بیک آن بلکہ اس سے بھی کم میں پوری مسافت طے کر لیتی ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا۔ وَلا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط بل احیاء ولکن لا تشعرون (البقرہ-۱۵۴)
جو لوگ قتل ہو گئے اللہ کی راہ میں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا پتہ نہیں ہے۔ عام طور پر علما یہ بتاتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ان کی حیات کا شعور نہیں ہے۔ نہیں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ حیات ایسی ہے کہ جس حیات کو تم نہیں جانتے یعنی وہ حس و حرکت والی حیات نہیں ہے بلکہ وہ اس سے مختلف قسم کی حیات ہے۔

ھم عند ربھم - وہ اللہ کے پاس ہیں۔ جب تم ان کی حیات کو نہیں
(آل عمران-۱۶۹)

سمجھ سکتے تو بھلا اللہ پاک کو کیا سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیسا حی ہے۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ وہ حی کیوں ہیں۔ شہدا حی اس لئے ہیں کہ وہ فی سبیل اللہ قتل ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ جو موت فی سبیل اللہ ہو وہ حیات ہے جب کسی مقید کی طرف کوئی حکم مرتب ہوتا ہے۔ تو وہ حکم قید کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ مثلاً ٹھنڈا پانی مضر ہے جو مضرت ٹھنڈک کی طرف رجوع ہوگی۔ یعنی ٹھنڈک باعث مضرت ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ تو للّٰہیت علت ہوئی حیات کی۔ اب فرمایا قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین (انعام - ۱۶۲) نبیؐ سے فرمایا کہ بتا دے کہ تیری نمازیں اور قربانیاں اور موت یعنی پوری زندگی اللہ کے واسطے ہے۔ شہید کی موت للّٰہ ہے۔ اس کو حیات ملے گی۔ تو نبیؐ کو جس کی پوری زندگی کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا جملہ حرکات وسکنات اللہ کے لئے ہیں تو اس کو ایسی بڑی حیات ملے گی کہ اس سے بڑی حیات کسی کو نصیب نہیں ہوگی۔

اب جو للّٰہیت موجب حیات ہے تو معلوم ہوا کہ وہ جو اصل حیات ہے اسی کا نام اللہ ہے۔ اس کو مثال سے سمجھ لیں کہ ایک آدمی خواب میں کھاتا ہے پیتا ہے محفلیں مرتب ہوتی ہیں۔ اب کسی نے جگا دیا تو اس محفل سے تو وہ مرگیا۔ اب اس محفل کے آدمی کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کی حیات میں چلا گیا۔ صرف اللہ پاک حی ہے۔ کل شیءٍ ھالک (قصص - ۸۸) ہر شے فنا ہونے والی ہے الا وجہہ سوائے ذات باری کے۔ اب شہدا کو اس نے کہدیا کہ یہ زندہ ہیں اور ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کو اس نے کہدیا کہ یہ مردے ہیں۔ تم ان کو سنا نہیں سکتے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اصل مختار ہے وہ مردہ کو چاہے تو زندہ کہدے اور زندہ کو چاہے تو مردہ نام رکھدے تو اصل حی تو وہ خود ہے۔ اس نے ہمارا نام بھی زندہ رکھ دیا اس لئے ہم زندہ کہلاتے ہیں۔ وہ چاہتا تو ہمارا نام مردہ رکھ دیتا اور جو قبر میں لوگ ہیں ان کا نام زندہ رکھ دیتا تو ہم مردہ اور وہ زندہ کہلاتے۔ حقیقی حی تو وہی ہے۔

اب ہم بول رہے ہیں۔ سب کام کاج کر رہے ہیں۔ ایک منٹ بعد ہارٹ فیل ہونے

ہی سب ختم تو یہ کیا حیات ہوئی ؟

اب اس نے فرمایا القیوم ۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قیوم اسکو کہتے ہیں کہ خود قائم ہو اور دوسرے کو قائم کردے ۔ مقوم ہو۔ قائم بالذات اور مقوم بالغیر وہ کل اشیاء کا مدبر ہے تو اس نے فرمایا کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم ۔ کسی ہاتھ میں کوئی چیز ہو اور وہ اونگھ جائے تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اور گرفت قائم نہیں رہے گی تو اس نے فرمایا کہ نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند کیونکہ وہ تو مدبر ہے کائنات کا اگر اسکو اونگھ آجائے تو سارا عالم تباہ ہو جائے ۔ یہاں ذرا سا شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اونگھ ہی نہیں آتی تو پھر نیند نہ آنے کا ذکر کیوں کیا ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نیند کا کیا ذکر اس کو اونگھ تک نہیں آتی ۔ نیند غفلت جہول ہے ۔ یا تو علم کا نہ ہونا ہے یا علم کی ضد ہے ۔ علم کا عدم یا اس کی ضد دونوں نقص اور عیب ہیں ۔ اور وہ ہر عیب سے پاک ہے ۔ لہذا وہ غافل ، کاہل ، جاہل نہیں ہو سکتا ۔ لہ ما فی السموٰت وما فی الارض آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے ۔ یہ تاکید ہے قیوم کی سب کی تدبیر وہی کر رہا ہے ۔ اسی کی تدبیر سے یہ قائم ہیں تو یہ اسی کی ملکیت ہیں ۔ تمام زمین و آسمان ۔ اب اسکی فرع یہ ہے کہ جب وہ مالک کل ہے تو جو غیر اللہ ہے ۔ وہ اسکی ملکیت ہے تو کسی غیر اللہ کو حق تصرف نہیں ہے ۔ تو فرمایا من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ ۔ کسی کو حق تصرف نہیں ہے بجز اسکی اجازت کے ۔ اسکے علاوہ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شاء وہ آگے پیچھے کی سب چیزوں کو جانتا ہے اور غیر اللہ کچھ بھی نہیں جانتے بجز اس کے کہ جتنا اس نے ان کو بتادیا ہے ۔ تو تصرف کے لئے علم ضروری ہے ۔ جب وہ کچھ جانتے ہی نہیں تو تصرف کیا کریں گے ۔ یہاں ایک دقیقہ ہے ۔ لفظ من یہ ظاہر کر رہا ہے کہ علم کے اجزاء کی طرف اشارہ ہے ۔ اور اللہ کا علم

ناقابل تقسیم ہے تو مفسرین نے اسکے معنی معلومات کے کئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی معلومات میں سے
وہ کسی معلوم کو نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں کہ اس تاویل کی ضرورت نہیں اور عقلی تاویل کرنی بھی نہیں چاہیئے جب تک کہ رسول اللہؐ کا فرمان یا اجماع امت یا نص صریح سے ثابت نہ ہو۔ بلکہ یا تو اس کے معنی یہ ہیں۔ ایک خدا کا علم ہے اور ایک وہ علم ہے جو اس نے مخلوق کو عطا کیا ہے تو اس علم میں سے بھی تم خود کچھ نہیں جان سکتے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جو سمجھ رہے ہو کہ یہ اللہ کا علم ہے تو تم اس کو نہیں جان سکتے ہاں اگر وہ تم کو خود بتانا چاہے تو تم جان سکتے ہو۔

وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ولا یؤدہ حفظہما

صرف یہی زمین آسمان نہیں بلکہ ان سے بھی بڑا ایک اور عالم ہے۔ اس کا بھی مدبر ہے اور اس کا تصرف اسکو بھی محیط ہے اور وہ اسکی تدبیر سے بالکل نہیں تھکتا۔ ذرا بھی غافل نہیں ہوتا۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ اللہ پاک نے اتوار کو کائنات بنانا شروع کیا اور جمعہ کو مکمل کیا اور سنیچر کو آرام کیا۔ تھک گیا تھا۔ تو اس نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بکتے ہیں۔ وہ نہیں تھکتا۔ وھو العلی العظیم وہ بہت بلند اور عظمت والا ہے اور یہ بلندی مکانی نہیں ہے۔ بلکہ تصرف اور امر کی بلندی ہے۔ کیونکہ مکانی بلندی ہوگی تو مکان مکین سے بلند ہوتا ہے۔ غیر اللہ، اللہ سے بلند ہوجائے گا۔ وہ بڑا عالی مرتبت اور عظمت وشان والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ
الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ
بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ
لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔـهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ
مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۵۶-۲۵۷)

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت

دین میں جبر و زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت اور ضلالت کو واضح کر دیا پس جس نے طاغوت سے کفر کیا

ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع

اور ایمان لایا اللہ کے ساتھ تو اس نے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا ہے جس میں انفصال نہیں ہے۔ اللہ سمیع و

علیم ہ اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور۔ والذین کفروا

علیم ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں انکا ولی اللہ ہے۔ وہ انکو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ اور جو لوگ

اولیٰھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمٰت۔ اولٰئک اصحاب النار

کافر ہیں ان کے ولی طاغوت ہیں وہ انکو ہدایت سے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہیں اور

ھم فیھا خٰلدون۔

ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

لا اکراہ فی الدین

دین میں جبر، زبردستی نہیں ہے۔

اکراہ بمعنی جبر = جبر کے دو معنی ہیں ایک تو معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق کہ اللہ پاک نے بندہ کو مجبور پیدا نہیں کیا ہے وہ مختار ہے چاہے وہ ہدایت کو قبول کرے چاہے رد کر دے۔ اہل سنت والجماعت اور دوسرے گروہ جو بندہ کو مجبور رکھتے ہیں وہ جبر کے معنی یہ بتلاتے ہیں کہ یہ جبر نہیں ہے بلکہ حکم ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی پر جبر مت کرو کہ اگر تو ایمان نہیں لایا تو قتل کر دوں گا۔ اور بعض علماء نے اس کو مخصوص کر دیا ہے۔ جزیے کے ساتھ کہ جو غیر مسلم جزیہ دینا قبول کرلیں ان پر دین کے معاملہ میں جبر نہ کرو۔

قد تبین الرشد من الغی =

اللہ پاک نے ایسے بین دلائل بیان کر دیئے ہیں کہ ہدایت اور ضلالت صاف طور پر متمیز ہو گئی ہے۔ دلائل واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں کہ اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی پر واضح ہو یا نہ ہو۔

فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ

جس نے طاغوت سے کفر کیا یعنی طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پاک کے ساتھ ایمان لایا۔

طاغوت کے پانچ معنی ہیں۔ شیطان۔ بت۔ بہکانے والے جن اور انس کے ہیں۔ ساحر کے معنی ہیں اور ایک معنی کاہن کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذرائع ہیں جن سے انسان بہک جاتا ہے اور بغاوت کرتا ہے۔ باغی ہو جاتا ہے۔ یہ طغٰی سے مشتق ہے باغی ہونا۔

فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی

(تو اس نے بہت کمال کیا ہے) اور اس نے ایک مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ عروہ یعنی کڑا لوہے کا جو رسی میں پڑا ہوتا ہے۔ وثقٰی مضبوط جو ٹوٹ نہ سکے۔ لا انفصام لہا جس میں انفصال نہ ہو۔ واللہ سمیع علیم اللہ سمیع علیم ہے یعنی وہ لا الٰہ الا اللہ جو کہتا ہے اس کو بھی سنتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ دل سے کہہ رہا ہے یا منافقت کر رہا ہے۔

اللہ ولی الذین اٰمنوا ۔ جو ایمان لائے اللہ ان کا دوست ہے رفیق ہے۔ مددگار ہے۔ ولی کے تینوں معنی ہیں۔

یخرجھم من الظلمٰت الی النور ۔ اور اس کو کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے آتا ہے۔ اور ایک معنی یہ ہیں کہ جو شروع سے مسلمان ہیں۔ ان کو ایسی توفیق عنایت کرتا ہے کہ وہ ظلمات کفر کی طرف نہیں جا سکتے

والذین کفروا۔ اولیاء ھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت ۔
اور جن لوگوں نے کفر کیا اللہ پاک سے انکار کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دوست رفیق اور مددگار طاغوت ہیں اور وہ ان کو نور ایمان سے نکال کر ضلالت کے اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ اولئك اصحاب النار ھم فیھا خلدون۔
یہی وہ لوگ ہیں جو اصحاب نار ہیں اور اسی میں وہ سدا رہیں گے۔
یہاں ذرا سی بحث ہے اسے سمجھ لیں۔ کثیر جماعت مسلمانوں کی جو تقریباً کلیت ہے۔ یہ کہتی ہے کہ کفار کو ابدی عذاب ہوگا۔ بعض حکماء اسلام یہ کہتے ہیں کہ یہ محض دھمکی ہے عذاب حقیقتاً نہیں ہوگا اور حکمائے غیر مسلم یہ کہتے ہیں کہ عذاب نہیں ہوگا۔ یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عذاب دے کیونکہ یہ فعل خالص ضرر ہے۔ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ ایک ضرر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آخر میں راحت مقصود ہوتی ہے۔ جیسے جراحی کا عمل۔ لیکن دائمی عذاب ایسا فعل نہیں ہے کیونکہ راحت اور منفعت اگر ایسی ہوگی تو یا عذاب دینے والے کو ہوگی یا عذاب پانے والے کو ہوگی۔ یا ان دونوں کے علاوہ کسی کو ہوگی۔ تو اللہ پاک تو منفعت اور راحت کا خالق ہے۔ اس کو تو ہوگی نہیں جہنمی تو خود عذاب میں گرفتار ہے اس کو کوئی منفعت و راحت نہیں پہنچ رہی ہے اور تیسرے آدمی کو فائدہ پہنچانا کسی ایک آدمی کو دکھ دے کر یہ خلاف عقل ہے اس سے یہ بہتر ہے کہ اس کو فائدہ نہ پہنچے اور اس کو دکھ نہ پہنچے۔ کیونکہ دکھ سے بچنا یہ زیادہ اہم ہے۔ فائدہ پہنچنے سے۔ دکھ سے بچنا یہ راجح ہے اور فائدہ پہنچنا یہ مرجوح ہے۔ ایک شخص کو فائدہ پہنچانے کے لئے دوسرے کو دکھ دیا جائے یہ غیر معقول ہے اور اللہ تعالےٰ غیر معقول فعل نہیں کرتا۔ اس لئے خدا کفار کو عذاب نہیں دے گا۔ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ کہا کہ خدا رحیم و کریم ہے اور اسکی رحمت و شفقت سے یہ بعید ہے کہ وہ عذاب دے۔ یہ محض ڈراوا

اور دھمکی ہے۔ تاکہ لوگ اس وعید سے ڈر کر نیکی اختیار کرلیں۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ خدا کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ جھوٹ بات کہے۔ اس کا جواب ایک بہت بڑے عالم دین ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں ان کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔ انہوں نے یہ فرمایا کہ یہ اگر خدائے تعالیٰ وعید کرے اور پھر عذاب نہ دے تو یہ اس کا جود ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ اسکی شان کے منافی نہیں ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ عذاب فعل قبیح ہے اور اللہ پاک کا فعل قبیح نہیں ہوتا۔ اس لئے عذاب نہیں ہوگا۔ اہل سنت نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہم کو رسول اللہ صلعم سے یہ خبر تواتر سے پہنچی ہے کہ عذاب ہوگا۔ اس لئے عذاب ہوگا۔ اور تمہاری دلیل عقلی ہے۔ اور ہم عقل کو حاکم تسلیم نہیں کرتے اس لئے تمہاری بات صحیح نہیں ہے۔ یہ جواب تو ان کا ٹھیک ہے۔ مگر عقلی بات کا جواب عقلی دلیل سے دینا چاہیئے۔ یہ ان کے جواب میں خامی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عقل حاکم نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک عقل کام کرسکتی ہے۔ وہاں تک اس سے کام لینا چاہیئے۔

پہلے یہ جان لیں کہ عقل کہتے کس کو ہیں۔ واقعات اور حقائق جو آسمان و زمین اور اس کے درمیان ہیں۔ ان کے صحیح تصور کو عقل کہتے ہیں۔ وہ تصور خواہ بذریعہ حس ہو یا بذریعہ فطرت ہو۔ مکان نظر آتا ہے یہ مشاہدہ حسی ہے۔ اپنے مرنے کا کوئی تجربہ نہیں لیکن ہر شخص کو یقین ہے کہ مر جائے گا۔ یہ فطری ہے یہ ابتدائی مرتبہ عقل کا ہے۔ بکری بھیڑیے کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ جانتی ہے کہ موت آئے گی۔ ان اشیاء کے علم کے بعد جو نتائج نکلتے ہیں۔ وہ حکمت نظری کہلاتی ہے یہ عقل کا علم ہے حسیات اور مشاہدات کی صحیح ترتیب سے جو نتائج نکلتے ہیں۔ وہ

عقل کا علم کہلاتا ہے۔

اول دہلے میں سامنے کی شے نظر آئے گی۔ پیچھے کی نظر نہیں آئے گی۔ پیٹھ کا نشان دیکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ اس نشان کو سامنے لایا جائے اور اس کا عمل یہ ہوگا کہ ایک آئینہ پیچھے رکھا جائے تاکہ نشان کا عکس اس آئینہ میں آجائے اور ایک آئینہ سامنے اس طرح رکھا جائے کہ پہلے آئینہ کا عکس اس میں آجائے تو سامنے دیکھتے ہی کہدے گا کہ پیٹھ پر نشان ہے۔ یہ عمل عقل کا ہے۔ یہ علم نظری کہلاتا ہے اور آئینوں کو جس طرح جمایا اسی طرح واقعات اور حقائق کو جمانے کا نام منطق ہے اور اس کا وضع کرنے والا خدا ہے۔ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں یہ بھرا ہوا ہے۔ حکمائے یونان نے اس کو لے کر اور اس میں اپنی طرف سے کچھ گھٹا بڑھا کر اس کا نام فلسفہ رکھ لیا ہے۔ یہ عمل عقل کا ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ وہ جو یہ کہتے ہیں کہ عذاب دینا خالص ضرر ہے تو اللہ پاک نے جو فرمایا وہ جھوٹ ہوا کہ عذاب نہیں دے گا اور یہ کہہ رہا ہے کہ میں عذاب دوں گا۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ ایسے جھوٹ میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کا یہ عمل اس کا جود ہے۔ بات ان کے سمجھ میں نہیں آئی دیکھئے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انبیاء بے گناہ ہیں۔ ان کو قتل کرا رہا ہے۔ طرح طرح کی ایذائیں دے رہا ہے جو اسکے خالص بندے ہیں۔ ان کو تکلیف میں رکھ رہا ہے۔ جو اس کے دشمن ہیں ان کو مالا مال کر رکھا ہے۔ بچے معصوم ہیں انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا ان کو طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر رہا ہے۔ جانوروں کو بے قصور ذبح کرا رہا ہے۔ بلکہ کہا کہ ان کو ذبح کرو خود بھی کھاؤ اور خاک بسر فقیر کو بھی کھلاؤ اور مزید انعام پاؤ۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی وہ رحیم و کریم عادل ہے یا نہیں اگر یہ سب کچھ اس کی رحمت و کرم اور عدل کے منافی نہیں ہے تو عذاب دائمی

وہاں دینا بھی اس کے رحیم وکریم ہونے کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ گناہ گار کو دائمی عذاب دینا اتنا اہم نہیں ہے۔ جتنا بے گناہ کو بے قصور دکھ دینا۔ تو جس طرح دنیا میں دکھ دے کر وہ رحیم وکریم ہے۔ اسی طرح آخرت میں دائمی عذاب دیکر بھی وہ رحیم وکریم ہے۔ اس لئے جو کچھ اس نے فرمایا وہ حق ہے کفار کو عذاب دائمی ہوگا۔ سب عقل کے مطابق ہے۔ غور نہیں کیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ دائمی عذاب دینے میں تو صرف گناہ گار ہی کو تکلیف پہنچتی ہے وہی تباہ ہوتا ہے۔ اور اللہ پاک کے جھوٹا ہونے میں تو الوہیت تباہ ہوتی ہے۔ اگر سارا عالم تباہ ہوجائے اس میں کوئی حرج نہیں مگر الوہیت پر آنچ نہیں آنی چاہیئے۔

اس بات کو یاد رکھیں کہ رحمت وہ ہے۔ جس کو وہ رحمت کہے۔ کرم وہ ہے جس کو وہ کرم کہے عدل وہ ہے جس کو وہ عدل کہے۔ آپ جس کو رحمت سمجھتے ہیں۔ کرم وعدل سمجھتے ہیں اس کا رحمت کرم اور عدل ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب وہ کہتے ہیں کہ عذاب دینا فعل قبیح ہے اور حکیم کا فعل قبیح نہیں ہوتا میں کہتا ہوں کہ یہاں بھی انہوں نے غور نہیں کیا۔ اس نے شیطان۔ فرعون۔ خنزیر۔ ٹی بی۔ کینسر جیسی چیزیں پیدا کیں۔ یہ سب قبیح ہیں یا نہیں۔ اس کے باوجود وہ حکیم ہے۔ بتاؤ خدا جو سزا دے رہا ہے وہ اچھا ہے یا برا ہے۔ برا کہو تو کفر ہوگیا اور اگر کہو اچھا ہے تو اللہ سے دعا کرو کہ یہ اچھائی تمہیں بھی میسر ہو۔ کچھ نہیں بول سکتے بس جو کچھ وہ کہدے اور جو کچھ وہ کردے اسی کو حق اور عدل کہتے ہیں۔

ایک لطیفہ یہاں اللہ پاک نے مجھے سمجھایا کہ سب اہل علم " اہل عقل اور اہل مذہب اس پر متفق ہیں کہ یہ عالم دلالت کر رہا ہے۔ خدا کے ہونے پر۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایک وقت تھا جب وہ تھا اور عالم نہیں تھا۔ یہ عالم اس کے

وجود کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے صانع ہونے کی دلیل ہے۔ یہ ہوسکتا ہو کہ اس وقت بھی عالم نہ ہو مگر وہ ہو گا۔

ایک باریک بات اور ہے جس کو وہ نہیں سمجھے۔ جو بدی کر رہا ہے اگر اس کو بھی عذاب نہیں ہو گا۔ اور نیکی جو کر رہا ہے۔ اس کو بھی نہیں ہو گا۔ تو دونوں برابر ہو گئے۔ پھر نیکی کر کے تکلیف بھی اٹھائی اور فائدہ بھی نہ ہوا۔ پھر نیکی کرنا ہی غلط ہو گیا۔ نظام عالم تباہ ہو جائے گا۔ فلسفیوں کی باتیں بڑی باریک ہوتی ہیں۔ لیکن سمجھ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس عالم کو یا تو نفع پہنچانے کے لئے پیدا کیا یا نقصان پہنچانے کے لئے پیدا کیا یا دونوں کے لئے نہیں پیدا کیا۔ اگر دونوں کیلئے پیدا نہیں کیا تو یہ فعل عبث ہے۔ یعنی اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بات نہ پیدا کرنے میں حاصل تھی تو یہ تحصیل حاصل ہے۔ لہذا ایسا نہیں ہے کہ بے مقصد پیدا کیا۔ اب اگر نقصان پہنچانے کے لئے پیدا کیا تو وہ حکیم و رحیم ہے۔ ایسا نہیں کرے گا۔ اور اگر فائدہ پہنچانے کے لئے پیدا کیا ہے تو دائمی عذاب فائدہ نہیں نقصان ہے۔ اس لئے دائمی عذاب نہیں ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ تشقیق نامکمل ہے۔ ایک شق رہ گئی اور وہ یہ ہے کہ دونوں کے لئے پیدا کیا۔ نقصان اور فائدہ دونوں مقصود ہیں۔ نیکوں کو فائدہ اور بدوں کو سزا دینا مقصود تھی۔ اور یہی حق ہے۔ مشاہدہ بھی یہی ہے کہ یہاں دونوں چیزیں ہیں۔ فائدہ بھی نقصان بھی۔ بیماری بھی صحت بھی۔ بھوک بھی سیری بھی۔ زندگی بھی۔ موت بھی۔ نہ صرف فائدہ کے لئے پیدا کیا نہ صرف نقصان کے لئے اور نہ عبث پیدا کیا۔ بلکہ دونوں باتوں کے لئے پیدا کیا۔ یہ صحیح جواب ہے۔ جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں دیا۔

انہوں نے یہ بھی اعتراض کیا کہ اگر کوئی نیکی کرتا ہے یا بدی کرتا ہے تو اپنے فائدہ یا نقصان کے لئے کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اسکی سزا دے۔ یہ غیر مناسب ہے میں

کہتا ہوں کہ جزا و سزا نیکی و بدی کی نہیں ہے بلکہ فرماں برداری اور نافرمانی کی ہے جو اسکی فرماں برداری کرے گا اس کو جزا ملے گی جو نافرمانی کرے اس کو وہ اسکی سزا دے گا اگر اپنے دل سے کوئی نیکی آپ کریں گے۔ اسکی کوئی جزا نہیں ہے۔ اب انہوں نے ایک بات یہ بھی کہی کہ زندگی انسان کی سو سال حد ۱۵۰ سال اگر پوری زندگی اس نے گناہ کیا تو جتنا اس نے گناہ کیا اتنی سزا ملنی چاہیئے ۱۵۰ سال کے گناہ کی ابدی سزا اسکی رحمت کے منافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کے کوئی تھپیڑ مارے اسکی کیا سزا ایک نہیں چلو دو تھپیڑ سہی۔ اگر صدر مملکت کے کوئی تھپیڑ مارے تو جیل ہوگی۔ تو اصول یہ بنا کہ جیسے جیسے مراتب بڑھتے جائیں گے سزا بھی بڑھتی جائے گی۔ اگر کوئی ایسا بڑا ہو کہ اس سے بڑا کوئی نہ ہو تو سزا بھی اسی مناسبت سے اتنی ہی بڑی ہوگی کہ اس سے بڑی سزا ممکن نہ ہو۔ اور یہ عقلاً بھی صحیح ہے۔ میں جس مثال سے ثابت کرتا ہوں کہ اگر آپ کی انگلی میں زخم آجائے تو زخم جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ وقت لگے گا۔ مگر وہ اچھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر بالکل کٹ کر الگ ہو جائے تو جب تک زندہ رہے گا انگلی کٹی ہی رہے گی۔ اسی طرح فاسق اپنے فسق کے اعتبار سے سزا بھگت کر معاف کر دیا جائے گا۔ مگر کافر جو بالکل انکار کرتا ہے گویا وہ خدا سے کٹ گیا تو جب تک زندہ رہے گا کٹا ہی رہے گا۔ اگر وہ زندہ ابد تک رہے گا۔ تو ابد تک کٹا رہے گا۔ اور دائمی عذاب میں مبتلا رہے گا لہذا جو قرآن کہہ رہا ہے وہ بالکل حق ہے۔ کافر کو عذاب ہوگا۔ اور دائمی ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ (بقرہ۔۲۵۸)

کیا تو نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جو ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں حجت بازی کر رہا تھا۔ اس وجہ سے کہ اللہ پاک نے اس کو بادشاہت عطا کی۔ جب ابراہیم نے فرمایا۔ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے فرمایا میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو اس کو مغرب سے نکال۔ اس جواب پر وہ کافر مبہوت ہو گیا اور لاجواب ہو گیا اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا

الم تر کا لفظ تعجب کے لئے ہوتا ہے۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں دیکھا آپ نے اس بد بخت کو کیسا دھوکا دیا اس نے۔ تو فرمایا تم نے اس شخص کو دیکھا جو ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں الجھا اس الجھنے کی وجہ یہ بتائی کہ اللہ پاک نے اس کو بادشاہت دی یہ وہ موقع ہے جیسے کہیں کبھی کیا تباہیں روتا ہوا آیا تھا ملازمت دلوائی رہنے کے لئے مکان دیا بس روٹیاں لگ گئیں۔ اب ہماری دشمنی پر اتر آیا سارے احسان بھلا دیئے۔ آپ غور کریں۔ اللہ پاک کی اتنی کثیر مہربانیاں ہیں کہ وان تعدو نعمت اللہ لا تحصوھا اگر اللہ پاک کی نعمتوں کو تم شمار کرنا چاہو تو گن

(نحل۔۱۸)

نہیں سکو گے۔ اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو جائے تو ہر شخص پوچھتا ہے کب سے بیمار ہیں۔ لیکن کسی نے آج تک کسی سے یہ دریافت نہیں کیا کہ میاں کتنے دن سے سرخ وسفید اور صحت مند ہو۔ دکھ کے دن گنے جاتے ہیں سکھ کے دن نہیں گنے جاتے اللہ کی نعمتیں لاتعداد ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت کی وجہ سے بھول جاتا ہے۔ سورج کی طرف دیکھئے چاہیئے تو یہ کہ زیادہ روشنی سے زیادہ نظر آئے مگر اس کا الٹا ہوتا ہے۔ اندھا ہو جاتا ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوا کہ شدت ظہور حجاب کا سبب بن جاتی ہے۔

لڑکوں کو آپ نے دیکھا ہو گا کوئی دوست ان کو ہوٹل میں ایک پیالی پلا دے تو جب وہ ملے گا تو اس کو دور سے سلام کرے گا۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملائے گا۔ اس کے برخلاف ماں روزانہ اس کو سوتے سے اٹھا اٹھا کر دودھ کے کٹورے پلاتی ہے لیکن اس سے اکڑا ہی رہتا ہے۔ وجہ ماں کی محبت کا شدت ظہور اس کے کفر کا باعث ہو جاتا ہے۔ یہ راز میں نے حسی مثال سے آپ کو سمجھا دیا۔ تو اللہ پاک نے اس کو بادشاہت دی اور اس شدت نعمت کی وجہ سے وہ اکڑ گیا اور اتنے بڑے نبی سے الجھ گیا۔ جہاں بھی قرآن شریف میں اس قسم کا ذکر آیا ہے نبی پہلے یہ بتاتے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ یہاں یہ بات محذوف ہے۔ اس پر نمرود نے پوچھا تیرا رب کون ہے۔ اپنے رب کی تعریف اور شناخت بتاؤ اس کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ربی الذی یحی و یمیت میرا رب وہ ذات ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ یہ دلیل بیان کی کہ جلانا اور مارنا جس کی خصلت ہے وہ ہے میرا رب یہ بہت قوی اور حسین دلیل بیان کی اور اللہ پاک نے اس دلیل کو اپنا یا وتلک حجتنا اتینھا ابراھیم علی قومہ یہ دلیل ہم نے بتائی۔ ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے

ہیں۔ اس دلیل کا حسن میں بتاتا ہوں غور کریں۔

جب کسی نامعلوم شے کی بابت دریافت کیا جائے کہ یہ کیا ہے تو اس سے ملتی جلتی چیزیں لائی جاتی ہیں کہ اس قسم کا ہے۔ مثلاً بچہ کو شیر بتایا جائے گا تو کہیں گے کہ بلّے کو گدھے کے برابر بنا لو بس یہی شیر ہے چھپکلی کو بل کے برابر فرض کر لو یہ نگرمچھ ہے اگر سمجھانا ہو تو نیم کی پتی کی مثال دی جائے گی۔ یہی شناخت کا طریقہ ہے۔ اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کی مثال دیکر خالق کائنات کو بتایا جائے کہ وہ ایسا ہے۔ ذاتی مشابہت چونکہ نہیں ہے اس لئے ذات کی معرفت تو محال اور ناممکن ہے۔ عمارت کو دیکھ کر انجینئر کے کمال سے تو آگاہی ہو جاتی ہے مگر اس کی ذات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ جوان ہے بوڑھا ہے کالا ہے گورا ہے وغیرہ ذات کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا البتہ ایک صورت ہے کہ انجینئر خود وہاں کسی ضرورت سے آ جائے اور آپ اس کو دیکھ لیں بس یہی صورت الطاف ربانی کی ہے کہ اللہ جس پر چاہتا ہے اپنی تجلی کر دیتا ہے تو اس کو کچھ معرفت ہو جاتی ہے۔ اس کی معرفت کا ضابطہ کوئی نہیں ہے صرف اس کی عنایات پر موقوف ہے۔ اور جس کو معرفت ہو گئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو نہیں جانتے وہ غلط سلط باتیں اپنے خیال سے کرتے رہتے ہیں یہ کائنات اس کی صنعت ہے تو ہمیں اس کی صناعی کا تو پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کی ذات یا اس کے علاوہ کوئی اور صفت کسی کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اس کی یہ ایجاد اس کے وجود پر دلالت کر رہی ہے۔ اس کائنات میں دو قسم کی چیزیں ہیں ۔

۱۔ قادر جیسے انسان، فرشتہ، جن وغیرہ اور ۲۔ غیر قادر جیسے نباتات، جمادات وغیرہ ان کو بے اختیار اور مضطر بھی کہتے ہیں۔ اب جتنی چیزیں مضطر

اور بے اختیار ہیں وہ تو ایجاد کر نہیں سکتیں مشاہدہ برابر ہو رہا ہے۔ تو اب اگر موجد ہو سکتا ہے تو قادر ہی ہو سکتا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑھیا انسان ہے۔ جو ظاہر ہے۔ فرشتہ اور جن تو ہمیں نے بتایا کہ ہیں ورنہ ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ اب اگر انسان کسی فعل کو نہ کر سکے، اس کے کرنے سے عاجز ہو اور وہ فعل متحقق ہو جائے تو اس فعل کا جو کرنے والا ہے وہی خدا ہے۔ اس قسم کے افعال میں جو سب سے نمایاں چیز ہے وہ حیات اور ممات ہی ہے۔ یہ ایسا فعل ہے کہ اس پر انسان بالکل قادر نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ مرجائے مگر اس کی کوئی تدبیر وہ نہیں کر سکتا فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْظُرُونَ جس وقت جان حلقوم میں آ جائے گی تم تکتے کے تکتے رہ جاؤ گے إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ (واقعہ۔ ۸۳) تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (واقعہ۔ ۸۷) اگر تم کسی کے بس میں نہیں ہو اور مختار ہو تو یہ جان جو حلقوم میں آ گئی ہے اس کو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔ جب لوٹا نہیں سکتے تو معلوم ہوا کہ تم کسی اور کے بس میں ہو۔ اور جس کے بس میں ہو وہی ہے تمہارا رب۔ مزید وضاحت کے لئے کہتا ہوں کہ مرنے سے پانچ منٹ پہلے زمین آسمان چاند سورج کواکب حکیم ڈاکٹر دوا کی شیشیاں بہن بھائی ماں باپ ہوا پانی سب موجود ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد یہ سب چیزیں جوں کی توں موجود ہوتی ہیں اور مر جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی زندگی میں دخل ہوتا تو یہ نہ مرتا۔ جب مر گیا تو ثابت ہو گیا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس کی موت میں دخل نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ کوئی اور طاقت ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے، اس طاقت کا نام خدا ہے۔ آتنی بڑھیا دلیل ہے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے فرمائی ہے کہ دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی اس کا جواب نہیں دے سکتیں انبیاء کا قاعدہ یہی رہا ہے کہ

ایسی بات کہیں کہ عقلمند سے عقلمند اور کم سے کم عقل کا آدمی دونوں سمجھ لیں اس لئے کہ وہ دونوں کی طرف مبعوث کئے جاتے ہیں۔

ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ احیاء و اماتی کا جو فاعل ہے اس کا یہ فعل اضطراری ہے یا اختیاری ہے۔ اگر وہ قوت اضطراری ہوگی تو ہر اضطراری فعل کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ذات کو لازم ہوتا ہے۔ جیسے سورج روشنی دینے کا فعل کرتا ہے تو روشنی اس کی ذات سے الگ نہیں ہو سکتی۔ سورج جب ہوگا جہاں ہوگا روشنی دیگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ سورج ہو اور روشنی نہ ہو۔ تو اگر حیات دینے کا خاصہ اضطراری ہوتا تو جب سے وہ ہے تب ہی سے حیات انسانی بھی ہوتی۔ اور خلاف حیات فعل یعنی ممات نہ ہوتی من کل شیء خلقنا زوجین ہم نے ہر شے کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ مقابلے کی چیزیں بنائی ہیں (ذریت ۴۹) لعلکم تذکرون شاید تم سوچو۔ اگر دائمی اثر ہوتا تو ایک حال پر رہتا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ قوت غیر اختیاری نہیں ہے۔ بلکہ وہ قوت با اختیار ہے۔ اور وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہو سکتی جو ہمارے مشاہدہ میں ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو جس طرح ان کو بنانے کیلئے ایک قوت کی ضرورت ہوئی اسی طرح اس کو بنانے کے لئے بھی ایک اور بنانے والے کی ضرورت ہوگی پھر اس کے لئے ایک اور قوت کی ضرورت ہوگی اس طرح یہ سلسلہ لا انتہا جائے گا اور لا انتہا جا نہیں سکتا تو پھر یہ کہیں نہ کہیں جا کر ٹھہرے گا جہاں جا کر ٹھہرے گا اسی کا نام خدا ہے۔

مفسرین حضرات یہ بتلاتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کا تعارف احیاء و اماتی کی صفت سے کرایا تو نمرود نے کہا کہ یہ صفت مجھ میں بھی ہے

اور اس نے دو آدمیوں کو بلا کر ایک کی گردن مار دی اور ایک کو چھوڑ دیا۔ اس پر ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دلیل بیان فرمائی فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بہا من المغرب میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو رب ہے تو سورج کو مغرب سے نکال فبہت الذی کفر یہ سنتے ہی وہ کافر مبہوت اور لاجواب ہو گیا۔

مفسرین کی یہاں دو رائیں ہیں ایک جماعت کہتی ہے کہ جب نمرود نے پہلی دلیل کا جواب دیا تھا تو وہ یہ سمجھے کہ یہ نہایت بیوقوف آدمی ہے کہ احیاء اور اماتت کا مطلب بھی نہیں جانتا تو انہوں نے دوسری زیادہ واضح دلیل بیان فرمائی اور یہ انہوں نے ٹھیک کیا۔

علمائے محققین یہ فرماتے ہیں کہ نہیں جب دلیل پر اعتراض ہو تو انہیں جواب دینا چاہئیے۔ دوسری دلیل کی طرف جانا صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ دراصل دوسری دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل ایک ہی ہے کہ حوادث جو رونما ہوئے ہیں ان کا جو حادث کرنے والا ہے۔ وہ ہے رب اور یہ دونوں باتیں اس ایک ہی دلیل کی دو مثالیں ہیں اور دلیل کی مختلف مثالیں دینا جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

مفسرین کی پہلی رائے میں خرابی یہ ہے کہ دلیل پر اگر اعتراض ہو جائے تو اس کا شافی جواب دینا چاہیئے۔ یہ قاعدہ کی غلطی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر جواب شافی نہ دیا جائے تو معترض یہ سمجھے گا کہ دلیل کمزور تھی اور اس نے اس کی کمزوری پکڑ لی۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ دوسری دلیل پہلی دلیل کے مقابلہ میں زیادہ واضح نہیں ہے کیونکہ جسم کو حرکت دینا خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا یہ تو ممکن ہے۔ یعنی جسم کو حرکت دینے میں انسان کی مجبوری ایسی نہیں ہے جیسی پیدا کرنے میں احیاء اور اماتت پر تو کوئی قادر ہی نہیں ہے۔ لہٰذا دوسری دلیل پہلی دلیل کے مقابلے میں زیادہ قوی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سورج کی رفتار

میں یکسانیت ہے۔ ایک ہی سمت میں حرکت کر رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں احیاء و مماتی
میں تغیر ہر ہر منزل میں پایا جاتا ہے جو تغیر کرنے والے پر زیادہ واضح دلیل ہے۔ اس
دلیل پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر وہ چاہتا تو یہ جواب دے سکتا تھا کہ اچھا تو اپنے رب سے
کہہ کر اس کو مغرب سے نکال اس اعتراض کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ خدا نے یہ جواب اس کو
بھلا دیا۔ لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ جو آدمی جواب دیدے کہ میں جلاتا اور مارتا ہوں۔
اتنی بڑی بات جو آدمی کہدے وہ اتنی چھوٹی سی بات کہ "اس کو تو مغرب سے نکلوا کر دکھا نہ کہے

میری رائے میں مفسرین حضرات کی رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اگر اس نے اعتراض
کیا تھا تو قاعدہ میں جواب دینا چاہیئے تھا۔ پھر جواب میں ایک آدمی کو قتل کرنا اور ایک کو
چھوڑ دینا یہ حماقت کے ساتھ جنون بھی ہے اور یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ اللہ پاک
اپنے رسول کو ایسے احمق اور پاگل آدمی کے پاس بھیجے۔ اسے صاحب عقل آدمی کے پاس
جانا چاہیئے جو بات سمجھے۔

ایک بات آپ سمجھ لیں کہ ایک تو فعل ہوتا ہے عادتاً اور ایک فعل خلاف عادت ہوتا
ہے۔ پیاس لگی ایک گلاس پانی پیا پیاس بجھ گئی یہ فعل عادت کے مطابق ہوا۔ گلاس پر گلاس
چڑھا لیے اور پیاس نہ بجھی یا صرف ایک قطرہ پانی منہ میں ڈالا اور پیاس بجھ گئی یہ فعل عادت کے
خلاف ہوا۔ لہٰذا مارنا یا جلانا اگر عادت کے مطابق ہوگا تو یہ عادت خدا کی ہے بندہ کی نہیں ہے
یہ فعل خدا کا ہی ہوگا اگر بندہ سے مارنا یا جلانا صادر ہوگا تو یہ اس کی عادت نہیں ہے۔ یہ
اس کا نہیں بلکہ کوئی اور طاقت ہوگی جو اس سے یہ فعل صادر کرا رہی ہوگی ابراہیم علیہ السلام نے
رب کی پہچان یہ بتائی کہ وہ جلاتا اور مارتا ہے۔ یہاں یہ معارضہ ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام
نے مردوں کو زندہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا ہیں۔ اس کا

جواب یہی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنا یہ عیسیٰ علیہ السلام کی عادت نہ تھی بلکہ یہ خلاف عادت کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا اس لئے یہ ان کی الوهیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ الوهیت کے لئے فعل کا عادتاً ہونا ضروری ہے۔ یہ ان کی نبوت کی تصدیق کی دلیل ہے کہ وہ جو احیاء اور اماتت کا فاعل ہے۔ ان سے یہ فعل کرا رہا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسی کے آدمی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دلیل کہ رب جلاتا ہے مارتا ہے بہت بین دلیل ہے۔ کیونکہ حیات و ممات یہاں دونوں متحقق ہیں اور یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ جانور بھی اس کو جانتا ہے۔ اگر بکری یہ نہ جانتی کہ بھیڑیا اس کی موت کا باعث ہو سکتا ہے تو اس سے ہرگز نہ ڈرتی۔ بکری کا ڈرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بھیڑیئے کو وہ اپنی موت کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ تو انہوں نے یہ فرمایا کہ یہ بدیہی فعل جو ہر آن یہاں ہو رہا ہے اس کا فاعل خدا ہے۔

اس بارے میں میرا قیاس ہے ویسے اللہ بہتر جانتا ہے کہ اصل بات کیا ہے میرے خیال میں بات یوں ہوگی کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہوگا کہ میں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں تیری ہدایت کے لئے آیا ہوں۔ نمرود نے سوال کیا تیرا رب کون ہے آپ نے فرمایا کہ اس کا خاصہ جلانا اور مارنا ہے اس پر اس نے کہا کہ احیاء و اماتت تیرا رب براہ راست کر رہا ہے یا بالواسطہ اسباب کے ذریعہ کر رہا ہے۔ براہ راست اگر کر رہا ہے تو مشاہدہ کے خلاف ہے کہیں نہیں نظر آتا کہ خدا کسی کو جلا یا مار رہا ہو اور اگر ذریعہ اور اسباب ارضی و سماوی کے تحت یہ کر رہا ہے تو اس پر ہر مخلوق قادر ہے۔ یعنی ہر شخص بچہ پیدا کر سکتا ہے اور زہر دیکر مار سکتا ہے۔ یہی اس نے کہا کہ میں بھی اسباب کے ذریعہ زندہ اور مار سکتا ہوں انا احیی و امیت : افلاک کی حرکات کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو حیاۃ و ماۃ کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ واسطے ہی

سے کر رہا ہے حرکات ارضی وسماوی کے ذریعہ ہی حیاۃ وممات دے رہا ہے
مگران حرکات پر کوئی انسان قادر نہیں ہے۔ ان پر خدا ہی قادر ہے ان اللہ
یاتی بالشمس من المشرق حرکات سماوی پر وہی قادر ہے اگر انسان بھی
ان حرکات پر قادر ہوتا تو بیشک وہ دعویٰ کرسکتا تھا ۔ کہ وہ احیاء و اماتت پر
قادر ہے۔

اگر اسباب وحرکات پر قدرت ہوتی تو گیہوں کا ایک دانہ بنالیتا لیکن دنیا بھر
کی طاقت خرچ کر رہا ہے مگر ایک دانہ گیہوں نہیں بنا سکتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر تو اس
بات پر قادر ہے تو نکال سورج کو مغرب سے۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ دونوں باتیں
ایک ہی دلیل کے دو ٹکڑے ہیں دوسرا ٹکڑا دلیل پر جو اعتراض ہوا اسکا جواب ہے
فبھت الذی کفر اس پر کافر مبہوت ہوکر رہ گیا کوئی جواب نہ بن پڑا بغلیں جھانکنے
لگا واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔
جہاں تک راہ دکھانے کا تعلق ہے وہ راہ سب کو دکھاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام
اس کے پاس راستہ دکھانے ہی گئے تھے لیکن اس راستے پر چل کر منزل مقصود پہنچانا
یہ بھی ہدایت ہے مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔
اللہ تعالےٰ آپ کو توفیق دے اور مجھے بھی اب اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ
عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ
قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ
قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ
وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ۜ
وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ
كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا
تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

(البقرۃ - ۲۵۹)

اوپر کی آیت ہے کیا تم نے نہیں دیکھا اس شخص کو کہ حجت بازی کی ابراہیمؑ سے رب کے معاملہ میں یہ اسی سلسلے کی آیت ہے۔ اَوْ کَالَّذِیْ میں "ک" زائد ہے۔ اس کے بغیر صحیح ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جو ترجمہ مفسرین نے کیا ہے یہ ہے کہ دیکھا تو نے اس شخص کو جو تھا اس شخص کی مثل جو گذرا ایک بستی سے۔ اگر ترجمہ یوں کیا جائے کہ کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے حجت بازی کی ابراہیم سے یا اس شخص کو جو گذرا اس بستی پر سے تو یہ ترجمہ صحیح ہو گیا۔ کاف زائد ہے۔ اَوْ کَالَّذِیْ جو ہے اَوْ لَّذِیْ کے مفہوم میں ہے اب اس کو سمجھنا چاہیئے۔ ایک بڑی دقت ہے بڑے بڑے امام اس میں الجھ جاتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں زائد الفاظ کے کیا معنی جیسے فرمایا مامنعک ان لا تسجد اذ امرتک۔ (اعراف-۱۲) تجھے کس نے روک دیا ابلیس سجدہ کرنے سے۔ ان تسجد کے بجائے ان لا تسجدہ فرمایا۔ یہاں لا زائد ہے۔ یا جیسے فرمایا لَا اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَامَۃِ (قیامہ) (کو بلد ۱) اقسم کی جگہ لا اقسم فرمایا۔ بڑے بڑے اماموں کی کتابوں میں میں نے دیکھا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں زائد لفظ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس خیال سے وہ طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں۔ ان کو اس کا جواب نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (شعراء ۱۹۵) قرآن فصیح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔

قرآن فصیح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ تو فصیح عربی زبان کے محاورہ

کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ فصیح عربی میں لا زائد آیا کرتا ہے۔ اس لئے یہاں لا زائد ہے۔ میں نے آپ کو بہت اچھی بات بتادی اس لئے کاف یہاں زائد ہے اَوْ کالذی مر علیٰ قریۃ کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بستی پر سے گذرا خاویۃ علیٰ عروشھا اور وہ جڑ سے اکھڑ کر اپنی چھتوں کے بل گرا ہوا تھا۔ خاویہ کے معنی جڑ سے اکھڑ کر۔ ایسی بات دیکھ کر وہ بولا اَنّٰی یُحْیِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ان کو اللہ پاک کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا۔ بڑا استعجاب ہوا فاماتہ اللّٰہ مِائَۃَ عَامٍ پس اللہ پاک نے اس کو موت دیدی۔ ۱۰۰ سال تک ثم بعثہٗ پھر اس کو دوبارہ زندہ کیا قال کم لبثت اللہ پاک نے دریافت کیا کہ اس حالت میں کتنے عرصہ رہا قال لبثت یوما او بعض یوم اس نے کہا کہ ایک دن یا اس سے کچھ کم کیونکہ جس وقت اس کو مردہ کیا تھا وہ شروع دن تھا اور جب اٹھایا گیا تو سورج غروب ہو رہا تھا تو اس نے کہا ایک دن یا اس سے کچھ کم۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ نہیں بلکہ تو سو سال رہا فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنہ دیکھ تو کھانے کو اور پینے کو وہ متغیر نہیں ہوا وانظر الی حمارک اور اپنے گدھے کی طرف دیکھ کر وہ بھی اپنی حالت پر ہے یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے تجھے سو برس کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور گدھے کو زندہ کیا اور کھانے پینے کی چیزیں نہیں سڑیں خراب نہیں ہوئیں یہ ہم نے اس لئے کیا کہ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ہم تم کو نشانی بنادیں لوگوں کے لئے اور وانظر الی العظام کیف ننشزھا (بقرہ ۲۵۹) ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم ان کو کیسا جوڑتے ہیں ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں فلما تَبَيَّنَ لَهٗ جب اس شخص نے یہ سب چیز دیکھ لی قال اعلم تو کہا کہ اب میں

جان گیا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ یہ ترجمہ ہو گیا بہت اچھا۔

اب یہاں مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ شخص کافر تھا کیونکہ بعث بعد الموت میں جس کو شک ہو وہ کافر ہے اور اس نے بعث بعد الموت میں شک ظاہر کیا تو یہ کافر ہی ہوا۔ اور فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت اس پر پہلے ظاہر نہیں تھی۔ اور اس کے یہ کہنے سے کہ اعلم ان اللّٰہ علی کل شیءٍ قدیر کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کو علم نہیں تھا۔ یہ خلاصہ ہے ان کے اعتراض کا یا ان کی دلیلوں کا یہ معتزلہ ہیں ان میں دو ایک سنّی بھی شامل ہیں۔ اور بقیہ تمام مومنین کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ شخص مومن تھا۔ بلکہ نبی تھا ان کا نام عذیر ؑ ہے۔ قصہ یہ بتلاتے ہیں کہ بخت نصر ایک بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو شکست دی اور بیت المقدس کو مسمار کر دیا اور بستیاں جلا دیں اور ان لوگوں کو گرفتار کر کے بابل لائے جب یہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ شہر الٹا پڑا ہے۔ وہاں آپ کو استعجاب ہوا۔ یہ اس موقع کا ذکر ہے وہ عذیر علیہ السلام تھے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان سے کہا کم لبثت یعنی اللہ پاک نے ان سے کلام کیا۔ اللہ پاک جس سے کلام کرتا ہے وہ نبی ہوتا ہے ۔ پھر اللہ پاک نے معجزہ دکھایا یہ بھی نبی کا خاصہ ہے۔ غیر نبی کو معجزہ نہیں دکھایا جاتا اور پھر اللہ پاک نے یہ فرمایا کہ یہ ہم تم کو آیت اور معجزہ بنا دیں گے تاکہ لوگوں کو حیات بعد الموت کا یقین ہو جائے۔ یہ سب باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ نبی ہی تھے۔

اللہ پاک ان کو کس طرح زندہ کرے گا۔ یہ شک ظاہر کر رہا ہے۔ اس کا

جواب سُنیتوں نے یہ دیا کہ یہ شک نہیں تھا بلکہ استبعاد تھا۔ عجوبہ پن تھا۔ جو انسانی فطرت میں ہوتا ہے۔ تعجب سا تھا۔ عادۃً دیکھنے کے بعد اطمینان ہوگیا۔ ویسے یقین تھا۔ پہلے استدلالی علم تھا۔ اب مشاہداتی علم ہوگیا تبین لہ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے استدلال سے ظاہر ہوا تھا اب مشاہدہ سے ظاہر ہوگیا۔ اسی طرح اعلم ان اللہ علی کل شئی قدیر میں جو کچھ کہا کہ میں نے اب جانا تو یہ بھی وہی بات ہے کہ استدلال کے ذریعے تو پہلے بھی جانتا تھا اب مشاہدہ سے بھی جان لیا۔ یہ اعتراضات کے جوابوں کا خلاصہ ہے تو تمام بڑی بڑی تفسیروں میں میں نے دیکھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اور بڑے بڑے صحابیوں اور آئمہ نے یہی فرمایا ہے۔ سو سال کے بعد جب عذیر علیہ السلام اپنی امت کی طرف تشریف لے گئے تو ان کے پوتے زندہ تھے سفید ریش انہوں نے اپنے آپ کو پہچنوایا۔ تو یہودیوں نے جب ان کو پہچان لیا تو اس موقع پر انہوں نے عذیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مشہور کر دیا تمام بڑے بڑے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ جو استبعاد۔ عجوبہ پن اور تعجب ہے وہ عادتاً ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی عجیب چیز کو دیکھ کر کہہ دے سبحان اللہ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے اس کو شک تھا اب یقین ہوا نہیں اس کو پہلے سے یقین تھا اب عادتاً استعجاب ہوا اس پر اس نے سبحان اللہ کہا۔ اب یہاں ایک بڑی دقت ہے۔ اگر خدا کی قدرت میں شک ہو تو قطعاً کفر ہے ہی تو کیا اگر ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی شک کرے تو کافر ہو جائے گا۔ اب رہا استبعاد اور استعجاب۔ تو استعجاب ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی بات خلاف توقع ہو اگر توقع کے مطابق ہو تو تعجب بالکل نہیں ہوتا۔ تعجب تب ہی ہوتا ہے جب آپ کو اس بات کی توقع نہ ہو اور وہ فعل ہو جائے۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کو توقع کے خلاف نہیں یہ بات عقل میں نہیں

آتی۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند کو، تارہ کو کہہ دیا کہ ھذا ربی یہ میرا رب ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے۔ اسی طرح اعمال کے متعلق بھی آیات آئی ہیں جن سے بظاہر نبی کی غیر معصومیت ثابت ہوتی ہے یہ بڑی حیران کن ہیں۔ تمام ائمہ نے فیصلہ کیا ہے۔ ایسی آیات خواہ عقیدہ کی ہوں یا اعمال کی جن سے نبی کی غیر معصومیت ثابت ہوتی ہو ان کی تاویل کی جائے یعنی اس کے معنی کچھ کے کچھ بتائیے۔ ایک جماعت جو انبیاء کی معصیت کے قائل ہے یہی آیات پیش کرتی ہے، جیسے فرمایا انی سقیم میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہیں تھے۔ یا جیسے ابراہیم سے جب پوچھا کہ کس نے بت توڑے ہیں تو انہوں نے فرمایا اس بڑے بت سے پوچھو۔ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ (انبیاء۔ ۶۳) یا جیسے یوسف نے اعلان کیا اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ (یوسف ۷۰) تو انہوں نے اس کے یہ معنی بتا دیئے کہ انہوں نے یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام کو چرایا تھا اس لئے ان کو چور بتایا۔ نبیوں کو الزام سے بچانے کے لئے عقلی کوششیں کی ہیں۔ تو ہم نے جہاں موقع آیا ہے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ باتیں غلط ہیں۔ اس کا حل کیا ہے؟ اس کا حل یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں کچھ بین آیات ہیں اور کچھ متشابہات ہیں هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ (آل عمران۔ ۷) تو جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (عمران ۷) وہ متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں۔

نبی جب ثابت ہو گیا تو نبوت دلیل ہے معصومیت کی۔ تو نبی کیلئے معصومیت قطعی ثابت ہو گئی اور یہ قطعی طور پر کلام اللہ ہے۔ اور اس سے نبی کی معصیت ثابت ہوئی تو دونوں میں تشابہ ہو گیا۔ تو یہ سب متشابہات ہیں۔ ان کے معنی سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ان کو اللہ پر چھوڑنا چاہیئے اور توقف کرنا چاہیئے۔ تو ایسی باتیں نہیں

کرنی چاہئیں۔ جب استعداد کر کے آدمی نبی ہو سکتا ہے تو عام آدمی استعداد کر کے کیسے ملزم ہو سکتا ہے۔ تو یہ آیات ایسی ہیں کہ جیسے الم، الر، کھیعص ان کے معنی خدا ہی جانتا ہے۔ ان کی پیروی نہیں کرنی چاہئیے ان کی تحقیق نہیں کرنی چاہئیے ان کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ کلام کی تعریف یہ ہے کہ بات سمجھ میں آئے ۔ اور کھیعص سے بات سمجھ میں نہیں آتی تو تشابہ ہو گیا تو یہ متشبہات میں شامل ہو گئیں۔ ان پر عمل نہیں کرنا چاہیئے۔ آنکھ ہے یہ دیکھنے کا ذریعہ ہے۔ فرمایا ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا تو یہ متشابہ ہو گئی نہ معلوم وہ کیسی آنکھ ہے۔

اس کا مطلب بیان کرنا یہ نہیں چاہیئے غلط ہے توقف کرنا چاہیئے۔ اللہ کے کلام میں نبی کے کلام میں جب بات عقل میں نہ آئے۔ ایک بات تو ہے عقل کے خلاف جیسے ۳ اور ۲ پانچ ہوتے ہیں اب اگر ایسا کلام ہو کہ ۳ اور ۲ سات ہوتے ہیں۔ تو یہ تو ہے عقل کے خلاف یہ دوسرے قسم کی چیز ہے ایسی دین میں کوئی بات نہیں ہے جو عقل کے خلاف ہو۔ اور ایک یہ ہے کہ عقل میں نہ آئے یہ اور بات ہے۔ تو ایک الماری میں اگر الماری سے بڑی کتاب رکھنا چاہو تو ہرگز نہیں آئے گی۔ اس طرح عقل کی چھوٹی سی الماری میں اللہ اور نبی کی بات نہیں آئے گی اب اگر کہو کہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تو مکلف کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے ساتھ مکلف نہیں ہے اس کی ممانعت ہے

فاما الذین فی قلوبھم زیغٌ فیتبعون ما تشابہَ منہ ابتغاء الفتنۃ ہ

اس کے معنی حاصل کرنے کے لئے اور رخنہ پھیلانے کے لئے کہ ایک بات ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب ایسی بات کیوں رکھی کہ سمجھ میں نہ آئے اور رخنہ پھیلے تو اس لئے رکھی کہ آزمائے کہ نہ سمجھنے کے بعد بھی اطاعت کرتا ہے یا نہیں یعنی ایک چیز ایسی ہے کہ اسکی

خوبی اور منفعت سمجھ میں آ رہی ہے تو اس کی پیروی کر رہا ہے۔ ایک چیز ایسی ہے کہ جس کی کوئی خوبی کوئی منفعت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ پھر اس پر عمل ہو یہ صحیح تکلیف ہے کیونکہ منفعت حاصل کرنے کے لئے تو مجبور ہے اور اس میں مختار ہے۔ جو زبردست عالم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر بے سوچے سمجھے ایمان لائے والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (آل عمران) اس لئے اللہ اور اس کے رسول کو پاک کرنا چاہیئے اور جو آیت ایسی ہو اس کو متشابہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کے غور میں نہیں پڑھنا چاہیئے۔

اب جو یہ فرمایا اعلم ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر ط اللہ تعالےٰ ہر شئے پر قادر ہے۔ تو ایک فرقہ جہمیہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے۔ انسان بالکل مختار نہیں ہے۔ بلکہ جمادات نباتات کی طرح مجبور محض ہے۔ اس کا جو بڑا ہے۔ اس کا نام جہم ابن صفوان ہے۔ اس نے بہت باتیں نئی نئی ایجاد کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ شئے نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت سے معلوم ہوا کہ ہر شئے مقدور ہے اور اللہ پاک مقدور ہے نہیں تو نتیجہ نکلا کہ اللہ شئے نہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے۔ اس کا جواب نہیں دے سکے۔ اناپ شناپ باتیں کہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دلیل غلط ہے اس دلیل میں ضابطہ کی خامی ہے۔ اللہ مقدور نہیں ہے یہ مقدمہ حق ہے۔ اگر دوسرا مقدمہ کہ ہر شئے مقدور ہے۔ یہ حق ثابت ہو جائے تو قطعی اللہ ثابت ہو جائے گا کہ شئے نہیں ہے۔ لیکن یہ دوسرا مقدمہ متشابہ ہے اس لئے کہ یہ جو ہر شئے ہے۔ اس میں اللہ شامل ہے۔ یا اس "ہر شئے" سے اللہ پاک کی ذات مستثنےٰ ہے۔ یعنی یہ اللہ کے علاوہ "ہر شئے" مقدور ہے یا ہر شئے خواہ وہ اللہ ہو یا غیر اللہ وہ مقدور

ہے۔ اگر اس میں اللہ شامل ہے تو اللہ شے ہو گیا اور مقدور ہو گیا اور کلیہ ٹوٹ گیا۔ اور اگر اللہ پاک کی ذات مستثنیٰ ہے تو یہ دلیل ہی بے معنی ہو گئی۔ اور یہ اعتراض مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ پھر اس نے یہ کہا کہ لیس کمثلہٖ شئی (شوریٰ - ۱۱) اللہ کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ اگر الف کی مثل ب ہے تو ب کی مثل الف ہو گا۔ یعنی الف کی مثل کا مثل الف ہو گا تو اللہ کی مثل کی مثل اللہ کی ذات ہوئی اور اوپر کی آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی مثل کی مثل شے نہیں ہے لہٰذا اللہ شے نہیں ہے یہ اس کی دوسری دلیل ہے اس میں دو خامیاں ہیں ایک تو یہ ہے کہ جس طرح تو مثل کی مثل کو ذات ٹھہرا رہا ہے۔ اسی طرح مثل کی مثل اور شے بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اکثر ہوتی ہے۔ اک مثل ب ہے تو ب کی مثل د۔ ج وغیرہ ہو سکتی ہے اہو نا ضروری نہیں یعنی حصر نہیں ہے۔ تو جو کچھ کہہ رہا ہے کہ مثل کی مثل شے نہیں ہے۔ تو اس مثل کی مثل میں باری تعالیٰ شامل ہے یا شامل نہیں ہے۔ اگر باری تعالیٰ شامل ہے تو شے ایسی شے نہیں ہے جس سے باری تعالیٰ مستثنیٰ ہو اور اگر باری تعالیٰ شامل نہیں ہے تو وہ شے وہ ہے جس میں باری تعالیٰ شامل نہیں ہے۔ یعنی وہ شے ممکنات ہے مخلوقات ہے یعنی باری تعالیٰ مخلوقات نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اس کلیہ سے بلیسیوں بڑے بڑے عالموں کو دھوکا لگا ہے۔ ہر شے پر قادر ہے۔ تو تمام نجاسات شریک باری تعالیٰ تمام کمالات تمام عیوب تمام نقائص ہر شے میں شامل ہو کر اور ان کے علاوہ تمام نامعقول چیزوں پر اللہ تعالیٰ قادر ہو جائے گا۔ جیسے جھوٹ بولنا ہے مرنا ہے۔ یہ عیوب ہیں۔ نقائص ہیں ان سب پر اللہ تبارک تعالیٰ قادر ہو جائیگا

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے یعنی جھوٹ بول سکتا ہے۔ وہ دلیل میں یہی آیت پیش کرتے ہیں۔ ہزار سال پہلے کے بعض علماء کو جو دھوکا لگا وہ یہی لگا۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھا وہ کتابیں مولوی اسماعیل شہید نے دیکھیں۔ وہ کتابیں جو مولوی اسمٰعیل کے پاس تھیں وہ میں نے بھی بالاستیعاب دیکھیں۔ یہ سب باتیں اس میں انہوں نے پڑھیں اور وہ بھی یہی کہنے لگے۔ جب وہ یہ کہنے لگے تو ان کے جو دو شاگرد ہیں ایک دیوبندی اور دوسرا غیر مقلد یہ بھی یہ کہنے لگے۔ پانچویں صدی میں ایک بہت بڑا عالم گزرا ہے۔ ابن حزم اس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شئے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نفی کرنے میں ان کو عیب لگتا ہے انہیں یہ برا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو غیر قادر کہیں اور ان کو اس بات میں عیب نہیں لگتا کہ اپنے رب کو جھوٹا کہیں۔ یا اس کو مردہ کہیں۔ تو قدرت کی تعمیم کے لئے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ اس واسطے ان سے یہ غلطی ہوئی۔

اب اس میں ایک عجیب ضابطہ پنہاں ہے جو کسی کو نہیں سوجھا۔ قادر نہ ہونے کی صورت میں بگڑتا کیا ہے یہی ہوگا نا کہ عالم نہ بنے۔ کیونکہ یہ عالم قدرت ہی کا تو نتیجہ ہے تو اگر وہ تمام عیوب سے متصف ہو کر خود فنا ہو جائے گا تو اس کے فنا ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ یہ عالم فنا ہو جائے۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا ایک صورت میں تو صرف عالم فنا ہوتا ہے ہو جائے پہلے نہیں تھا بعد میں بھی نہ ہوتا کچھ حرج نہیں تھا۔ وہ تو باقی رہتا ہے۔ دوسری صورت میں تو وہ خود فنا

ہو جاتا ہے۔ جب وہ فنا ہوا تو تمام عالم بھی فنا ہو گیا دونوں گئے۔ تو اگر وہ یہ بھی کہتے ہوں تب بھی دونوں میں دوسری بات ہی بہتر ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ جو کسی امام کے سمجھ میں نہیں آئی۔ اس عالم کا تعلق قدرت سے ہے۔ اگر قدرت نہیں ہوگی تو یہ عالم نہیں ہوگا۔ بس اور اگر اس کے اور کمالات نہیں ہوں گے تو وہ خود نہیں رہے گا۔ تو اس کے فنا ہونے سے یہ بہتر ہے کہ عالم نہ ہو — معدودات کے نہ ہونے میں کیا ہرج ہے۔ انہوں نے جو دلیلیں دی ہیں، ان میں بڑی غلطی کی ہے۔ ان لوگوں نے۔ ان کی تقلید کی اور یہ بھی دہی کہنے لگے۔

اس کا میں آپ کو ایک ضابطہ بتا دوں ایجاد و خلق اور چیز ہے۔ قدرت اور چیز ہے۔ قدرت کا جو تعلق ہے۔ اس کا نام ہے ایجاد، خلق، تکوین۔ مقدورات لاانتہا نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اگر قدرت مقدور کے ساتھ متعلق نہ ہو تو قدرت رہے گی۔ ایجاد نہیں ہوگا۔ مقدورات لاانتہا نہیں ہونگے کیونکہ جب قدرت ان سے متعلق ہوگی تب وہ ہوں گے تو تعلق متعلق سے پہلے ہوگا اور متعلق پیچھے ہوگا۔ تو مقدورات کبھی لاانتہا نہیں ہو سکتے۔ اور قدرت فی نفسہ لاانتہا ہے۔ اور اس کا جو تعلق ہے وہ متناہی ہے۔ وہ لاانتہا متعلق نہیں ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ لاانتہا متعلق ہوگی تو وہ ختم ہو جائے گی۔ اور ختم ہونے والی لاانتہا نہیں ہو سکتی۔ جتنی قدرت میں ہیں تمام چیزیں بنا ڈالے تو قدرت ختم ہو جائے گی۔ بہت باریک بات ہے مگر قدرت ختم نہیں ہوگی۔ تو جتنی چیزیں بنائے گا محدود ہوں گی۔ سورج ایک بنایا۔ جتنے اجزائے عالم ر[illegible] ہیں ان کی

تعداد کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ سورج بنا سکتا ہے۔ اور وہ سب بیک آن بنا سکتا ہے۔ وہ کس طرح بنائے گا۔ یہ بعد میں بتاؤں گا ماخلقکم ولا بعثکم تم سب کو پیدا کرنا اور مرنے کے بعد سب کو دوبارہ زندہ کرنا یہ کیسا ہے اِلّا کنفسٍ واحدۃ (لقمان-۲۸) یہ ایسا ہے جیسے ایک آدمی کو پیدا کرنا۔ تو جو لاگت ایک شخص کو پیدا کرنے میں آئے گی وہ ہی لاگت سب کو پیدا کرنے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے میں آئے گی کچھ بھی تو فرق نہیں ہے۔ اب آپ غور کریں بہت باریک بات ہے۔ ایک تو یہاں وہ اشیاء ہیں جو ضروری ہیں ضروری معنی یہ کہ جدا نہ ہو سکے جیسے آگ کو گرمی سورج کو روشنی۔ برف کو ٹھنڈک ضروری ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اگر ہو جائیں تو فنا ہو جائیں نہ آگ آگ رہے گی نہ برف برف رہے گا نہ سورج سورج رہے گا۔ یہ ضروری جو ہیں یہ تو علاقے اور نسبتیں ہیں اور ایک شے وہ ہے کہ اس کا وجود ضروری ہے، یعنی وجود اس کی ذات سے جدا نہیں ہو سکتا۔ ایسا وجود جو ذات سے جدا نہ ہو سکے وہ کسی کا اثر نہیں ہو گا۔ اگر وہ کسی کا اثر ہو گا تو وہ موثر کے تابع ہو گا۔ تو جدا ہونا ممکن ہو گیا۔ جیسے گوشت چھری سے کاٹا۔ تو کٹنا جو ہے وہ اثر ہے چھری کا۔ اگر چھری نہ ہو تو کٹنا نہیں ہو گا۔ اگر کٹنا اثر نہ ہوتا اور ذاتی ہوتا تو چھری کے تابع نہ ہوتا یعنی جو شے باہر سے آئے گی وہ جدا ہو سکے گی۔ علت خواہ اختیاری ہو، یا اضطراری اس کا جو اثر ہے وہ ضروری نہیں ہو گا۔ علت کے ہٹتے ہی، تاثیر ہٹتے ہی وہ ختم ہو جائے گا۔ اور جو باہر سے نہیں آیا۔ خود اس کی ذات کے اندر ہے تو یہی معنی ضروری ہونے کے ہیں۔ یہی معنی واجب الوجود کے ہیں تو

واجب الوجود کی تعریف یہ ہے کہ جو شے کسی علت کا معلول، کسی موثر کا اثر
کسی مختار کا فعل نہ ہو تو واجب الوجود جب کسی علت کا معلول کسی موثر کا اثر نہیں ہے
تو اس کا نہ ہونا محال ہے۔ کیونکہ کسی شے کا نہ ہونا یہ فرع ہے اس علت کے نہ ہونے
کی۔ یعنی علت کی نفی سے اس وجود کی نفی ہو گی۔ اب جو اصل وجود ہے اس کی
علت ہی نہیں ہے تو اس کے "نہ ہونے کا" سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ ہونے کا
عدم واجب ہو گیا۔ اور وجوب عدم کا نام محال ہے۔ تو اس وجود کا عدم محال
ہو گیا۔ عدم جو بغیر علت کے ہے اس کا نام محال اور وجود جو بغیر علت کے ہے
اس کا نام واجب اور جو عدم اور وجود دونوں بالعلت ہوں اس کا نام ممکن۔
تو اب جو محال ہے فرع ہے اس کے وجود کی علت کی نفی کی۔ اب جو وجود کی
علت ہی نہ ہو تو اس کی نفی کہاں سے ہو گی تو وہ بالذات محال ہو گیا۔ تو اب
جس شے پر قادر ہو گا۔ تو قادر بعلت مقدور کی ہو جائے گا اب وہ شے بلا
قدرت تو جو شے بلا قدرت ہے وہ بالقدرت ہو جائے گی تو محال تو بلا قدرت
ہے وہ بالقدرت کیسے ہو گا۔ وہاں سوال ہی غلط ہے۔ کہ محال پر قادر ہے یا
نہیں۔ وہاں قادر کہنا بالکل حماقت اور جہالت ہے۔ وہ سوال کے اندر بات نہیں
آنے کی نہ وہاں یہ کہا جائے گا کہ قادر ہے نہ یہ کہا جائے گا کہ قادر نہیں ہے دونوں
باتیں غلط ہیں۔ اور جھگڑا اچل رہا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے قادر ہے دوسرا کہتا ہے
قادر نہیں ہے۔ خدا ہر شے پر قادر ہے تو انہوں نے کہا کہ محال پر بھی قادر ہے
اپنے فنا ہونے پر بھی قادر ہے۔ محال تو اس کو کہتے ہیں جو لا بالقدرت ہو اور اگر وہ
اس پر قادر ہو گا تو وہ مقدور ہو گیا اور بالقدرت ہو گیا تو سوال یہ ہو گیا کہ بالقدرت

بالقدرت ہے یا نہیں اور یہ سوال مہمل ہوگیا۔ یہ سوال غلط ہے وہ جو قباحتیں ہیں کہ
وہ اپنے آپ کو مٹا سکتا ہے جھوٹ بول سکتا ہے وغیرہ وہ اس کی نفی کررہی ہیں
وہ ضد ہیں اس کی وہ اس کا عدم ہے اور عدم بلا قدرت ہے اس کے قادر
ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ عدم مقدور ہے۔ تو اس سوال میں قانونی غلطی ہے
سوال صحیح نہیں ہے۔ جب وہ سوال غلط ہوگیا تو پھر اللہ ہر شئے پر قادر ہے، بالکل
حق ہے جو اس نے فرمایا۔ اب اگر جزئیات میں گفتگو کریں گے تو وہ ناجائز ہوگا۔
پریشانی ہوگی۔ اور صحیح بات قطعی معلوم نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کو جو چیزیں معلوم
ہیں ظاہر ہے کہ بہت سی اس میں سے مقدور نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کو اپنی
ذات کا علم ہے۔ مگر وہ مقدور نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ کو اپنی صفتیں معلوم ہیں۔ مگر
وہ مقدور نہیں ہیں۔ متعلق علم جو ہے وہ عام ہے متعلق قدرت خاص ہے پھر
وہ ایک کیسے ہوں گے وہاں قدرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ
جن چیزوں سے قدرت متعلق نہیں ہوئی ان پر وہ قادر ہے یا نہیں یہ مہمل
بات ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ یہ سوال غلط ہے۔ اگر یہ کہیں کہ نہیں
تو عاجز ہو جائے گا اور اگر یہ کہیں گے کہ قادر ہے تو عیب دار ہو جائیگا۔ دونوں
باتیں غلط ہیں صحیح جواب یہ ہے کہ سوال غلط ہے۔ اگر کہیں گے کہ اللہ جھوٹ
بول سکتا ہے تو یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ کا ناقص ہونا محال ہے اور محال
اس کی وجود کی ضد ہے وہ متحقق ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ عدم جس کے وجود
کی علت کی نفی نہ ہو اور اس کی علت ہے نہیں تو سوال غلط ہوگیا ایسا سوال کرنا
ہی نہیں چاہیئے۔ آپ کے مخیلہ میں جو شئے آئے گی ان سب پر وہ قادر ہے

اس کے وجود کا عدم تو آپ کے مخیلہ میں آ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ مخیلہ میں جب آئے گا جب اس کی علت ہو۔ اس کی علت ہے نہیں تو اس کا عدم مخیلہ میں نہیں آ سکتا۔ باقی جو شے مخیلہ میں آسکتی ہے اس سب پر وہ قادر ہے۔ ایک بات اور ہے۔ ایک تو ہے نفس کذب اور نفس صدق۔ اس پر تو وہ قادر ہے وہ ان دونوں کا خالق ہے جس طرح کافروں میں کفر اور مومنوں میں ایمان پیدا کرتا ہے اسی طرح کاذبوں میں کذب اور صادقوں میں صدق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ قدرت تو ہے اور چیز ایک یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے یعنی وہ جھوٹ بول سکتا ہے یہ سوال غلط ہے اور اگر بالفرض اس کو صحیح سمجھ بھی لیا جائے تو جس شے پر وہ قادر ہے وہ محض اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ ادھر اس کی مشیت متعلق ہوئی ادھر وہ ہو گیا ادھر اس نے جھوٹ بولا اس کے بولتے ہی وہ سچ ہو گیا۔ لکڑی حیوان ہے۔ آگ ٹھنڈی ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہیں مگر جو نہی اس کے کہتے ہی لکڑی حیوان ہو گئی اور آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ تو وہاں جھوٹ کا سوال ہی کہاں رہا۔ ارادہ متعلق ہوتے ہی وہ سچا ہو گیا۔ ادھر قدرت متعلق ہوئی ادھر وہ ہو گیا۔

اس میں بھید کیا ہے۔ اس پر ہمیں مطلع ہوا کہ ہم اگر سچ بولیں گے تو وہ حکایت ہو گی میکیالو کی جس کی ہم حکایت کر رہے ہیں۔ اگر ہماری یہ حکایت اس میکیالو کے تابع ہے اور اس کے مطابق ہے تب تو ہم اس کو سچا کہیں گے۔ اور اگر یہ اس کے مطابق نہیں ہے تو اس کو جھوٹا کہیں گے۔ ہمارے یہاں انسانوں میں متکلمین میں یہ رواج ہے کہ اگر حکایت واقعہ کے مطابق ہو تو اس کو سچا کہیں گے یا اس کے مطابق نہ ہو تو اس کو جھوٹا کہیں گے۔ دودھ سفید ہے یہ بات سچی ہے

کیونکہ یہ بات دودھ پر صادق آتی ہے۔ جھوٹ بات یہ ہے" کہ دودھ کالا ہے"
کیونکہ دودھ اس کا مصداق نہیں ہے تو ہمارے اقوال اور حکایات جو ہیں وہ
واقعات کے تابع ہیں۔ اشیاء کی تابع ہیں اور اللہ پاک کی حکایات ہیں ۔ وہ
واقعات کی تابع نہیں ہیں بلکہ واقعات اس کی حکایات کے تابع ہیں وہ واقعات
کے تابع نہیں ہیں بلکہ واقعات اس کی حکایات کے تابع ہیں۔ اس نے کہہ دیا دودھ
کالا ہے۔ دودھ فوراً سیاہ ہو جائے گا۔ پیلا کہدے پیلا ہو جائے گا۔ جس
رنگ کا کہدے اسی رنگ کا ہو جائے گا اور پھر کہنے کے بعد وہ اگر منسوخ کر دے تو
پھر دودھ سفید ہو جائے گا۔ ہمارے قول واقعات کے تابع ہیں اور واقعات اس
کے قول کے تابع ہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ جو وہ کہدے وہی حق ہے۔ تو اب اس
کے قول کو واقعات پر پرکھیں یہ انتہائی غلطی ہے بلکہ واقعات کو اس کے قول کے
مطابق پرکھنے چاہئیں۔ بڑی غلطی ہوئی ہے فعل قول کے تابع ہے یہاں بھی
دیکھ لیجیئے۔ آپ کہیں پانی لاؤ، تو یہ آپ کی ضرورت واضح ہوگی اور اگر ہاتھ کو منہ
کے پاس رکھ کر اشارہ کریں تو سمجھ میں تو آئے گا کہ پانی کی طلب ہے لیکن ہوسکتا
ہے کوئی اور مطلب ہو تو قول فعل سے ہمیشہ قوی ہوتا ہے۔ زیادہ قابل قبول
ہوتا ہے۔ زیادہ قابل عمل ہوتا ہے۔ تو کائنات کے مقابلے میں اقوال زیادہ قابل
قبول زیادہ قابل عمل زیادہ قابل تعظیم ہیں۔ ابھی آپ کے حلق میں نوالہ اٹک
گیا پانی مانگا نوکر نے دیدیا۔ آپ نے پی لیا۔ اب نوکر نے سمجھا کہ پانی مایہ حیات ہے
مالک کی جان بچ گئی۔ چنانچہ اس نے بہت سے گلاس اور گھڑے بھر کر لا کر آپ کے
پاس رکھ دیئے۔ ایسے نوکر کا کیا حشر ہوگا۔ نکالدیا جائے گا۔ اگر وہ یہ دلیل پیش کرے گا

کہ میں تو تیرے لئے مایۂ حیات لایا اور تو نے مجھے نکال دیا تو جواب اس کو یہ
ملے گا۔ کہ میں نے کہا کب تھا۔؟ یہ تو مایۂ ممات ہو گئی تو اپنی عقل سے کسی شے کو
مایۂ حیات سمجھنا اس کی منظوری کے بغیر مایۂ ممات ہے۔ بس اس کے فضل پر دارومدار
ہے۔ نہ کوئی عمل کام آئے گا نہ عقل کام آئے گی۔ اللہ آپ پر اور مجھ پر اپنا
فضل کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ان اللہ علی کل شئ قدیر ۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (بقرہ۔ ۲۵۹)

اب اگر تو یہ کہے کہ محال اور ممتنع شئ ہے اور ہر شئ پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اس سے قطعاً یہ نتیجہ نکلا کہ محال پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اور محال مقدور ہے حالانکہ محال کہتے ہی اسے ہیں جو مقدور نہ ہو تو جو شئ مقدور نہ ہو وہ مقدور ہو گئی اس کا کیا حل ہے نیز اللہ تعالیٰ شئ ہے اور فرمایا قل ای شئ اکبر شہادۃ کون سی شئ شہادت کی رو سے سب سے بڑی ہے ۔ قل اللہ ۔ کہدے اللہ ہے ۔ اور فرمایا کل شئ ھالك الا وجھہ (انعام ۱۹) سوائے ذات باری تعالیٰ کے ہر شئ ہلاک ہونیوالی ہے ۔ (قصص ۸۸) ہر شئ میں سے اللہ پاک نے اپنی مبارک ذات کو مستثنیٰ کیا پس معلوم ہوا کہ اللہ پاک شئ ہے اور ہر شئ پر اللہ تعالیٰ قادر ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مقدور نہیں ہے تعالیٰ اللہ عنہ ۔ خلاصہ یہ ہے کہ واجب اور ممتنع دونوں شئ ہیں اور ہر شئ مقدور باری تعالیٰ ہے لہذا واجب اور ممتنع دونوں مقدور ہو گئے حالانکہ دونوں میں سے کوئی بھی مقدور نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی تعمیم کی یہ شبہہ ان پر وارد ہوتا ہے اور اور جن لوگوں نے تخصیص کی ان پر تعجیز رب لازم آتی ہے یعنی اگر قادر کہتے ہیں تو محال مقدور ہوا جاتا ہے اور قادر نہیں کہتے تو باری تعالیٰ عاجز ہوا جاتا ہے اور اس شبہ کا حل اب تک نہیں ہو سکا جاننا چاہیئے کہ اس شبہ کی بہت سی جزئیات ہیں جیسے کذب باری تعالیٰ شئ ہے اور ہر شئ پر اللہ تعالیٰ قادر ہے اور جب حرکت کے وقت سکون اور اجتماع الضدین اور اجتماع النقیضین اور سلسلہ حوادث لا اول اور شریک باری تعالیٰ اور مثل باری تعالیٰ وغیرہ یہ سب اشیاء ہیں اور ہر شئ پر اللہ تعالیٰ قادر ہے لہذا یہ سب مقدور ہو گئے اس وقت سے بچنے کے لئے اکثر صورتوں میں رؤساء معتزلہ نے قدرۃ باری تعالیٰ کی تخصیص کی اور حکماء نے بھی تخصیص کی وغیرہ وغیرہ ان پر باری تعالیٰ کا عاجز ہونا لازم آیا جو محال کے مقدور ہونے سے بھی زیادہ بدتر ہے میں کہتا ہوں

واجب وہ وجود ہے جو بے علت ہے اور ممتنع محال وہ عدم ہے جو بے علت ہے۔ یعنی جس
وجود کے لئے علت نہیں ہے اس وجود کے عدم کے لئے کبھی علت نہیں ہے کیوں کہ عدم کی
علت اس وجود کی علت کا عدم ہے اور جب سرے سے علت ہی نہیں ہے تو اس کا عدم کیسا
ہے یعنی عدم علت وجود علت عدم ہے اور یہاں علت وجود ہی نہیں تو عدم علت متصور ہی نہیں
لہٰذا عدم وجود بے علت ہے بس اسی عدم کا نام محال ہے اور اس کے مختلف افراد اور جزئیات
ہیں اب یہ بات واضح ہو گئی کہ وجود بے علت واجب ہے اور عدم بے علت محال ہے تو اب سوال
کرنا کہ واجب اور محال مقدور ہے یا نہیں یہ سوال صحیح نہیں ہے کیوں کہ واجب وہ وجود ہے جو
لا بالعلۃ یا لا بالقدرت ہے اور محال وہ عدم ہے جو لا بالعلۃ اور لا بالقدرت ہے۔ تو اب سوال
کا حاصل یہ ہو گیا کہ لا بالعلۃ اور لا بالقدرت بالعلۃ اور بالقدرت ہے یا نہیں اور یہ مہمل اور
لغو بات ہے اس لئے واجب اور محال کے مقدور اور غیر مقدور ہونے کا سوال ہی صحیح نہیں
ہے کیوں کہ تقسیم کے لئے مقسم کو مشترک ہونا چاہئے اور یہاں مقسم قسم کی نقیض اور ضد ہے
اس لئے سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ یہ کہنا کہ لا بالقدرۃ یعنی غیر مقدور بالقدرۃ مقدور
ہے یا نہیں کیوں کہ جزو اول غیر مقدور جزو ثانی مقدور کی نقیض ہے اس لئے یہ سوال غلط ہے
اور شاید اسی وقت سے بچنے کے لئے جہم بن صفوان نے اللہ تعالیٰ کے شئی ہونے سے انکار
کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ مقدور نہیں ہے اور ہر شئی مقدور ہے جکم شکل ثانی یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ
تعالیٰ شئی نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ ہر شئی مقدور ہے اس کلیہ میں اللہ تعالیٰ داخل ہے یا نہیں
اگر داخل ہے تو اللہ تعالیٰ شئے ہو گیا اور اگر داخل نہیں ہے تو قیاس کی یہ صورت ہو گی کہ
اللہ تعالیٰ مقدور نہیں ہے اور ہر شئی سوائے باری تعالیٰ کے مقدور ہے اس سے یہ نتیجہ
نکلا کہ اللہ تعالیٰ ایسی شئی نہیں ہے جو باری تعالیٰ کے سوا ہو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ شئی
نہ ہو میں کہتا ہوں اس وقت مقدمہ کبریٰ یعنی ہر شئی علاوہ باری تعالیٰ کے مقدور ہے یہ مقدمہ
کلیتہ نہیں ہے لہٰذا بغیر کلیت انتاج صحیح نہیں ہے اس کے علاوہ جہم نے یہ بھی کہا کہ

لیس کمثلہ شیءٌ (شوریٰ - ۱۱) یعنی لیس کمثلہ کے معنی لیس مثل مثلہ کے ہیں یعنی اس کے مثل کی مثل شئ
نہیں ہے اور اس کے مثل کی مثل اس کی ذات ہے لہذا اس کی ذات شئ نہیں ہے میں کہتا
ہوں کہ اللہ پاک کی مثل کی مثل جس طرح اللہ پاک کی ذات ہے اس طرح کی مثل کی مثل اللہ پاک
کی ذات کا غیر بھی ہے یعنی جس طرح اللہ پاک کی مثل کی مثل خود اللہ پاک ہو سکتا ہے اسی طرح
اللہ پاک کی مثل کی مثل غیر اللہ بھی ہو سکتا ہے تو جس طرح اس استدلال سے اللہ پاک کے شئ ہونیکی
نفی ہو گئی۔ اسی طرح غیر اللہ کے شے ہونے کی نفی ہو گئی۔ اور ہر شے یا اللہ تعالےٰ ہے یا غیر اللہ
ہے اور اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ دونوں شئ نہیں ہیں تو لابد ہر شے شئ نہ ہوئی جہم کی سمجھ میں یہ بات
نہیں آئی میں کہتا ہوں کہ لیس کمثلہ شیءٌ میں شے نکرہ منفیہ ہے
اور نکرہ منفیہ عام ہوتا ہے تو آیت شریفہ کے معنیٰ یہ ہوئے کہ کوئی شے اس کی مثل نہیں ہے
اور کاف کمثلہ کا زائد ہے یعنی لیس مثلہ شئ یعنی کوئی شئ اس کی مثل نہیں ہے یہاں مثلہ کی نفی
ہے شے کی نفی نہیں ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ کاف کو زائد نہ کہا جائے تو کیا معنی ہوں گے تو اس
وقت آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس جیسے کی کوئی مثل نہیں ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کسی بزرگ یا عالم
کے متعلق کہ اس جیسے عالم کی کوئی مثال نہیں ہے جیسے سے مثلیت کی نفی درحقیقت اس کی
مثلیت کی نفی ہوتی ہے غور کر۔ امام ابن حزم نے کہا کہ اللہ تعالےٰ محال پر قادر ہے اور اس کی دلیل
یہ بیان کی ہے کہ عالم ازل میں محال ہے اور اللہ تعالیٰ ازل میں عالم پر قادر ہے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ
تعالیٰ محال پر قادر ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ازل میں عالم پر قادر ہے اس کے معنی یہ ہوئے
کہ ازل میں عالم مقدور ہے اور پہلا فقرہ یہ ہے کہ ازل میں عالم محال ہے اس سے صاف یہ نتیجہ نکل
آیا کہ مقدور محال ہے اور محال غیر مقدور کو کہتے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ مقدور غیر مقدور ہے۔
اور یہ کتنی لغو بات ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ازل میں عالم پر قادر ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ
تعالےٰ کی قدرت ازل میں عالم کے ساتھ متعلق ہو سکتی ہے تو اس صورت میں عالم قدرت سے پیچھے
ہو گیا اور جو شئ کسی شے سے پیچھے ہے وہ ازل اور ازلی نہیں ہے لہذا یہ کہنا کہ اللہ تعالےٰ
ازل میں عالم پر قادر ہے بے معنی چیز ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے

کہ ازل کوئی معین ظرف نہیں ہے ازل کے معنی لا اوّل ہونے کے ہیں تو ازل میں قادر ہونے کے
معنی یہ ہوئے کہ قدرت کا عالم کے ساتھ تعلق کا سلسلہ لا اوّل ہے جیسا کہ دھریہ اور فلسفی کہتا ہے
یا ازل میں عالم کے ساتھ دفعتہً بغیر تسلسل کے قدرت متعلق ہو چکی تو اوّل تو اہل اسلام کے عقیدہ کے
خلاف ہے اور ثانیاً تعلق کو ازلی کہنا بے بنیاد ہے کیوں کہ تعلق قدرت قدرت سے پیچھے ہے اور ازل کسی
سے پیچھے نہیں ہے لہذا تعلق قدرت کو ازلی کہنا اور اللہ تعالیٰ کو ازل میں قادر عالم کہنا بے معنی بات ہے غور کر
ابن حزم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کذب پر قادر ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر
دی کہ زید جمعرات کے دن مرے گا اس خبر کے بعد بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ بدھ کے دن زید کو موت دینے پر
قادر ہے یا قادر نہیں ہے اگر یہ کہو کہ قادر ہے بدھ کے دن زید کو موت دینے پر اور جمعرات کے دن موت
کی خبر دینے کے بعد بدھ کے دن موت دینا کذب ہے اور اللہ تعالیٰ بدھ کے دن موت دینے پر قادر ہے
تو لا محالہ اللہ تعالیٰ کذب پر قادر ہو گیا اور اگر یہ کہو کہ قادر نہیں ہے تو تم نے اپنے رب کی تعجیز کی اور اپنے
رب کو عاجز قرار دیا گویا معتزلہ تو اس کا جواب دے نہ سکے اب میں کہتا ہوں کہ
جب کہ معتزلی عاجز مانتا ہے تو اس سے یہ کہنا کہ تم نے اپنے رب کو عاجز قرار دیا یہ بات بے
سود ہے تم کو تو دلیل سے عاجز ہونے کو باطل کرنا تھا اب رہ گئی پہلی شق کہ جمعرات کے دن موت
کی خبر کے اعلان کے بعد بدھ کے دن موت دینے پر قادر ہے ہم نے تسلیم کیا کہ بدھ کے دن موت دینے
پر قادر ہے لیکن یہ بات کہ بدھ کے دن موت دینا یہ کذب ہے یہ غلط ہے کذب تو جب ہوگا کہ جمعرات
کے دن موت واقع نہ ہو اور جمعرات کے دن موت کا واقع نہ ہونا قطعاً محال
اور ناممکن ہے یعنی ہم نے فرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بدھ کے دن موت واقع کرنے پر قادر ہے بدھ
کے دن موت کا واقع ہونا امر فرضی ہے تحقق نہیں ہے اگر حقیقتاً بدھ کو موت واقع ہوتی تو
بیشک بدھ کی موت کذب کہلاتی اور اللہ تعالیٰ کذب پر قادر ہوتا لہذا بدھ کی موت جمعرات کی موت
کے اعلان کے بعد فرضی ہے لہذا کسی طرح کذب لازم نہیں آسکتا ہاں بیشک جمعرات کے دن اگر موت
واقع نہ ہوتی تو بے شک کذب لازم آتا اور کذب متحقق ہوتا خواہ کسی اور دن ہوتی یا کسی اور
دن بھی نہ ہوتی مگر جمعرات کو نہ ہوتی جمعرات کے علاوہ کسی بھی دن موت ہوتی تو بیشک کذب لازم آتا یا نہیں بدھ کے

دن کی موت جمعرات کے دن کی موت کی خبر کے خلاف نہیں ہے بلکہ جمعرات کے دن کی موت کے خلاف ہے ۔ حاصل یہ ہے کہ خبر کے خلاف کذب ہے مخبر کے خلاف کا نام کذب نہیں ہے مخبر کے خلاف پر قادر ہونے سے یہ الزام نہیں آتا کہ خبر کے خلاف پر قادر ہو جس طرح فرعون کے جہنم میں داخلہ کی خبر دی اور جہنم میں داخلہ کے خلاف جنت میں داخلہ یہ مخبر عنہ کے خلاف ہے خبر کے خلاف نہیں ہے تاکہ کذب لازم آئے جہنم میں داخلہ کے اعلان کے بعد جنت میں فی نفسہ داخلہ مقدور رہے اور یہ کذب نہیں ہے کیوں کہ کذب خبر کی صفت ہے مخبر کی نہیں ہے ہاں بیشک اگر جہنم میں فرعون کا داخلہ اب نہ ہو خواہ جنت میں ہو خواہ جنت میں بھی نہ ہو بہر حال جہنم میں داخلہ نہ ہو تو جہنم کے داخلہ کی خبر قطعاً کذب ہو جائے گی اور نفس داخلہ جہنم و جنت صدق و کذب سے تعلق نہیں رکھتا کیوں کہ صدق و کذب حکایت اور خبر کی اوصاف ہیں غور کر۔

ابن حزم نے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ قالت الیہود عزیر ابن اللہ تو کہدے اور بغیر قالت الیہود کے صرف عزیر ابن اللہ نہ کہہ سکے اور عزیر ابن اللہ قطعاً کذب ہے مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جھوٹی بات نقل کر سکتا ہے تو جھوٹی بات کہہ بھی سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ قالت الیہود عزیر ابن اللہ صدق ہے اور عزیر ابن اللہ کذب ہے تو ابن حزم کا مطلب یہ ہوا کہ جب اللہ سچی بات کہہ سکتا ہے تو جھوٹی بات بھی کہہ سکتا ہے تو سچ بولنے پر قادر ہونے سے جھوٹ پر قادر ہونا کہاں لازم آتا ہے ۔

حاصل یہ ہے کہ حکایت پر قادر ہونے سے محکی عنہ پر قادر ہونا لازم نہیں ہے ہر شخص اس حکایت پر قادر ہے کہ سورج روشن ہے لیکن سورج کی روشنی پر قادر نہیں ہے اسی طرح یہود کذب کی حکایت پر اللہ تعالیٰ قادر ہے لیکن اس سے یہ الزام نہیں آتا کہ نفس کذب پر بھی قادر ہو ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بندہ کذب پر قادر ہو اور اللہ قادر نہ ہو یعنے بندہ کی قدرت خدا کی قدرت سے فائق اور بالاتر ہو گئی میں کہتا ہوں بندہ خودکشی پر قادر ہے تو چاہئیے معاذ اللہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی ہلاکت پر قادر ہو میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالےٰ تمام نقائص مخلوقی سے پاک ہے بلکہ تمام محاسن اور کمالات

مخلوق سے پاک ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ؕ (صٰفّٰت - ۱۸۰)

بعض ناواقف لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا صدق اس وقت قابل مدح ہے جب کہ وہ کذب پر قادر ہو جیسے زنا سے بچنا اس وقت قابل مدح ہے جس وقت زنا پر قدرت ہو میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قادر ہونا اس وقت قابل مدح ہوگا جب کہ وہ عجز پر قادر ہو اور عالم ہونا اس وقت قابل مدح ہوگا جب کہ وہ جہل پر قادر ہو اور رحیم ہونا اس وقت قابل مدح ہوگا جب کہ وہ ظلم پر قادر ہو اور حیّ ہونا اس وقت قابل مدح ہوگا جب کہ وہ اپنی موت پر قادر ہو اور یہ نہایت لغو اور بے ہودہ باتیں ہیں اتنا یہ لوگ نہیں سمجھے کہ صلاحیت اور قابلیت مخلوق کی صفت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مخلوقی صفات سے پاک ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ قضیہ حق ہے کہ اللہ تعالےٰ کاذب بالامکان ہے تو قطعی اس کی نقیض یعنی اللہ تعالیٰ صادق بالضرورۃ ہے باطل ہو جائے گی۔ کیوں کہ ممکنہ کی نقیض ضروریہ ہے یعنی امکان کذب کی نقیض ضرورت صدق ہے کیوں کہ صدق وکذب حل حکایت میں نقیضین ہیں یعنے کلام یا صادق ہے یا کاذب ہے لہذا ہر ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو اور ہر ایک کا کذب دوسرے کے صدق کو مستلزم ہے غور کر۔

تنبیہ۔ صدق ہمارے یہاں قول کا واقع کے مطابق ہونے کا نام ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک واقع اس کے قول کے تابع ہے یعنے اس نے کہدیا کہ آگ ٹھنڈی ہے تو آگ ٹھنڈی ہی ہوگی زندہ مردہ ہے تو مردہ ہی ہوگا۔ مردہ زندہ ہے تو زندہ ہی ہوگا لہذا یہاں جھوٹ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اگر وہ جھوٹ کہے گا تو جھوٹ کہتے ہی وہ سچ ہو جائے گا امکان کذب تو کجا فعلیۃ کذب فعلیۃ صدق کی موجب ہے کیونکہ قولہ الحق حق اور صدق اس کے قول کا نام ہے جو وہ کہدے وہی حق ہے اور صدق ہے۔

مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء - ۱۲۲) یعنے اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون اصدق القول ہوگا۔ یعنے اللہ ہی اصدق ہے اور سب صادق ہو سکتے ہیں لیکن اصدق نہیں ہو سکتے کیوں کہ اصدق

افعل التفضیل ہے یعنے صدق کا تاکد اور صدق کی زیادتی ہی زیادتی اور تاکد وجوب ہے اور وجوب منافی امکان ہے یہ بات پھر سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کے تمام کمالات بالفعل ہیں۔
بالاستعداد بالقابلیۃ بالصلاحیۃ بالامکان وغیرہ نہیں ہیں اور ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ ممکن اسے کہتے ہیں کہ جس کو واقع فرض کرلنے سے محال لازم نہ آئے اگر کذب باری تعالیٰ ممکن ہوگا تو اس ممکن کو واقع فرض کرلنے سے تمام نظام دنیا اور عقبیٰ سب کا سب تباہ اور برباد ہوگا۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ اگر حق ان کی رائے کے (مؤمنون - ۷۱) تابع ہو جائے گا تو کائنات آسمانی اور زمینی اور درمیانی سب تباہ ہو جائے گی حاصل یہ ہے کہ امکان کذب کی تقدیر کذب کو واقع فرض کرنے سے تمام کائنات کی تباہی یعنی محال لازم آتا ہے لہذا امکان کذب باطل ہے اور ضرورت صدق حق ہے۔

ابن حزم لنے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے خلاف پر قادر ہے چونکہ معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے خلاف پر قادر نہیں ہے اس لئے انھوں لنے معتزلہ کے رد میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے خلاف قادر ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ زید اتوار کو مرے گا لیکن وہ ہفتہ کو زید کو موت دینے پر قادر ہے تم اگر یہ کہو کہ وہ قادر نہیں ہے تو تم لنے اپنے رب کی تعجیز کی اور عاجز قرار دیا اگر یہ کہو کہ ہاں قادر ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ اپنے علم کے خلاف پر قادر ہو گیا میں کہتا ہوں کہ معتزلہ تو تعجیز کے قائل ہیں یہ بیان ان کے لیے رد میں کافی نہیں ہے کیوں کہ علم کے خلاف پر قادر نہ ہونا بعینہ علم کے خلاف پر عاجز ہونا ہے نیز میں کہتا ہوں کہ اتوار کے دن کی موت علم باری نہیں ہے بلکہ متعلق علم باری تعالیٰ ہے یعنے اتوار کے دن کی موت معلوم باری تعالیٰ ہے۔ اور ہفتہ کی دن کی موت خلاف معلوم باری تعالیٰ ہے لہذا باری تعالیٰ خلاف معلوم باری تعالیٰ پر قادر ہوا نہ کہ خلاف علم پر خلاف علم پر قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اتوار کے دن موت نہ ہوا اور یہ محال ہے کہ اتوار کے دن موت نہ ہو اور اگر اتوار کے دن موت واقع نہ ہوگی تو یہ علم جہل سے بدل جائے گا جو قطعاً محال ہے تعالی اللہ عن ذالک

خلاصہ یہ ہے کہ خلاف علم باری اور چیز ہے اور خلاف معلوم باری اور چیز ہے لہذا خلاف معلوم پر قادر ہونے سے خلاف علم پر قادر ہونا لازم نہیں آتا جیسے اتوار کی موت معلوم باری ہے اور اتوار کے علاوہ ہر دن کی موت خلاف معلوم باری ہے اور اس ہر دن کی موت پر جو خلاف معلوم باری ہے بیشک اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ اور اتوار کے علاوہ ہر دن موت دینے پر قادر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اتوار کے دن موت نہ دے تاکہ خلاف علم پر قادر ہونا لازم آجائے۔ غور کر۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۠ (البقرة ۲۶۰)

وہ واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کر کہ جب ابراہیمؑ نے اپنے رب سے کہا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ پاک نے فرمایا میں مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ اس پر تجھے ایمان ہے یا نہیں قَالَ بَلٰی جواب دیا کیوں نہیں تو بے شک مردوں کو زندہ کرے گا۔ لیکن یہ سوال میں نے اس لئے کیا ہے کہ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ اللہ پاک نے فرمایا اچھا چار پرندہ پکڑ لو اور ان کو ہلا لو یعنی پالتو بناؤ۔ یعنی اپنے ساتھ ہلا لو۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ان کو قطع کر دو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ دونوں معنی آتے ہیں۔ فَصُرْهُنَّ کے لیکن یہاں ایک دقت ہے۔ اِلَیْ صُرْ کا صلہ نہیں آتا۔ اگر پہلے معنی لئے جائیں تو "ان کو قطع کر دو" یہ محذوف نکالنا پڑے گا۔ یہ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ یہ اگلی آیت سے معلوم ہوا 'جز' کا لفظ استعمال کیا پھر ایک ایک جز کو پہاڑ پر رکھ دو۔ اب ان کو پکارو تو وہ تمہارے پاس اڑتے ہوئے آجائیں گے۔ سعی کے معنی دوڑنے کے آتے ہیں۔ لیکن میں نے ترجمہ ایسا کر دیا کہ دونوں معنی لگ جاتے ہیں پرندے دوڑتے ہوئے نہیں اڑتے ہوئے آتے ہیں۔ اور بہت تیز دوڑنے کو بھی اردو محاورہ میں اڑنا کہتے ہیں۔ دلی کی زبان میں۔ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ "عزیز" اسکو کہتے ہیں جس کو اپنے کام پر پورا کنٹرول ہو یا جس کو دشمن سے انتقام لینے سے کوئی روک نہ پائے وہ عزیز کہلاتا ہے۔ اردو میں اس کو زبردست کہہ دیتے ہیں۔ "حکیم"۔ عام طور پر ہمارے یہاں حکمت کے یہ معنی ہیں کہ فعل لغو نہ ہو بلکہ با مطلب

منفعت کے لئے ہو یا دفع مضرت کے لئے۔ ہمارے یہاں لغو کے مقابل کی چیز ہے۔
حکمت۔ لیکن اللہ پاک نفع اور مضرت دونوں سے پاک ہے تو اس کے یہاں حکمت کے یہ
معنی بیان کئے ہیں فعل مستحکم ہو یعنی ایسا فعل ہو جو قاعدہ کے اندر ہو اور اس میں کوئی
نقص نہ ہو فارجع البصر هل ترى من فطور۔ آسمان کی طرف نظر ڈال کے دیکھو۔ اس
(ملک پ ۳)
میں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی ثم ارجع البصر کرتین پھر دوبارہ نظر ڈالو ینقلب الیک البصر
خاسئاً وھو حسیر نظر خوار ہو کر واپس آجائے گی۔ اور آسمان کی تخلیق میں کوئی خامی
نہیں نظر آئے گی۔ یہ معنی مستحکم کے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ
شہد کی مکھی اور مکڑی اپنے چھتے اور جالے میں ایسی شکلیں بناتی ہے کہ بڑا بڑا مہندس
حیران ہے لیکن ہم ان میں سے کسی کو حکیم نہیں کہتے۔ تو حکیم کے یہ معنی اللہ پاک کے فعل
پر نہیں لگتے۔ ایک معنی یہ بتائے کہ حکیم اس کو کہتے ہیں جس کا فعل قابل اعتراض نہ ہو
یہ معنی نہیں ہیں۔ آپ غور کریں ایک بہترین صناع کو لے لیں اب جو چیز وہ بنانا
چاہتا ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور رہتی ہے۔ تب ہی تو وہ چاہتا ہے۔
کہ اس سے اور بہتر بنے اس سے اور بہتر بنے۔ اور جس قدر اس کی منشاء کے مطابق
بنتی ہے۔ اتنی ہی اس کو خوشی ہوتی ہے اور اگر حسب منشاء نہ بنے تو اداس رہتا
ہے۔ تو میرے نزدیک حکیم اس کو کہتے ہیں جس کا فعل اس کی مشیت کے مطابق ہو
غیر اللہ کا فعل کبھی مشیت کے مطابق نہیں ہوتا۔

انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ ہرگز نہیں ہو گا۔ مرضی
اور مشیت کے مطابق اللہ ہی کا فعل ہو گا۔ اس کے خلاف نہیں ہوئے گا کیسا بڑھیا سے
بڑھیا صناع آجائے۔ کوئی نہ کوئی خامی رہ جائے گی۔ خدا کے کام میں ایسا نہیں

ہے۔ اس کا فعل اس کی مشیت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ میں نے حکیم کے یہ معنی نکالے ہیں اور یہی صحیح ہیں۔ مجھ سے پہلے یہ معنی کسی نے نہیں بتائے۔

آیت کے معنی سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لیں۔ یقین اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

جو لفظ منہ سے نکلتا ہے۔ اگر اس سے کوئی بات سمجھی جاتی ہے۔ تو اس کو کلمہ کہتے ہیں۔ جیسے زمین آسمان پانی دریا ان الفاظ کے بولنے سے ایک چیز سمجھ میں آتی ہے۔ اگر کوئی ایسا لفظ بولا جائے جس سے کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے اس کو مہمل کہتے ہیں جیسے روئی دوئی اس میں جو لفظ دوئی ہے یہ تابع مہمل کہلاتا ہے اس سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اب کلمہ منفرد ہوتا ہے۔ اگر ایک کلمہ کیساتھ اور کلمہ ملا دیا جائے تو یہ مرکب ہو جاتا ہے۔ مرکب کی دو قسمیں ہیں۔ اگر متکلم کا بولنے کے بعد خاموش ہو جانا صحیح نہ ہو۔ جیسے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ "دیوار پر" تو مخاطب منتظر ہے کہ میں کچھ بتاؤں اور میں خاموش ہو گیا تو میری یہ خاموشی صحیح نہیں ہے ایسے مرکب کو مرکب ناقص کہتے ہیں۔

اب میں نے کہا کہ "دیوار پر کوا بیٹھا ہے" اور میں خاموش ہو گیا۔ تو اب مخاطب کو انتظار نہیں ہے۔ میری یہ خاموشی صحیح ہے ایسے کلمہ مرکب کو جملہ کہتے ہیں۔

اب اگر جملے میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ بات سچی ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹی ہو اس کو جملہ خبریہ کہتے ہیں۔ جیسے فلاں شخص آیا تھا اور کتاب لے کر چلا گیا۔ اور اگر صدق و کذب کا احتمال نہ ہو تو ایسے جملہ کو

جملہ انشائیہ کہتے ہیں۔ جیسے پانی لاؤ۔ اب جملہ خبریہ جب ذہن میں آئے اور صدق و کذب کی طرف ذہن منتقل نہ ہو تو اس کو تخیل کہتے ہیں جیسے شعر کہ شعر کے قافیہ اور وزن کی طرف تو ذہن منتقل ہوتا ہے۔ مگر اس کے صدق و کذب کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ شاعر مضمون کو شعر میں باندھتا ہے اس کے سچ اور جھوٹ سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس کو تخیل کہتے ہیں۔

اب اگر اس کے صدق و کذب کی طرف التفات ہو اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو التفات دونوں طرف ہوگا یا کسی ایک طرف اب اگر دو طرفہ التفات ہے تو یا تو یہ التفات دونوں طرف برابر ہوگا۔ اس کو شک کہتے ہیں اور اگر التفات ایک طرف زیادہ ہو اور ایک طرف کم تو جس طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اسے گمان کہتے ہیں اور جس طرف التفات کم ہو اس کو وہم کہتے ہیں۔ یہ وہم نام ہے یہ بیماری نہیں ہے۔ دو طرفہ التفات میں تین قسمیں ہوگئیں۔ شک، ظن اور وہم اور اگر التفات یکطرفہ ہو یعنی کذب کی طرف ہو تو صدق کی طرف بالکل نہ ہو اور صدق کی طرف ہو تو کذب کی طرف بالکل نہ ہو۔ اس التفات یکطرفہ کو قطع کہتے ہیں۔ فلاں بات قطعی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ جزم اور جسہ بولتے ہیں اور عام لوگ قطع بولتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ بات سچی ہے۔ یا جھوٹی۔ جھوٹی بات کو سچا جان گیا تو کہے گا یہ بات قطعی۔ اب یہ یکطرفہ التفات یا تو واقعہ کے مطابق ہوگا۔ یا واقعہ کے خلاف ہوگا جیسے آواگون تثلیث یہ سب جھوٹی باتیں ہیں لیکن جو ان کو ماننے والے ہیں وہ اس کو قطعی جانتے ہیں۔ تو یہ صورت کہ یکطرفہ التفات ہو اور واقعہ کے خلاف ہو اس کو جہل مرکب کہتے ہیں۔ اس لئے اس میں دو جہل شامل ہیں ایک تو وہ اصل شے کو نہیں جانتا اور

دوسرا اپنے نہ جاننے کو نہیں جانتا۔

اگر یکطرفہ التفات ہے اور واقعہ کے مطابق ہے تو اگر وہ ٹوٹ سکتا ہے ٹوٹے یا نہ ٹوٹے اس سے بحث نہیں لیکن اگر ٹوٹ سکتا ہے تو ایسے یکطرفہ واقعہ کے مطابق التفات کو تقلید کہتے ہیں اور اگر نہ ٹوٹ سکے تو اس کو یقین۔ ایمان کہتے ہیں۔ اس کو مثال سے سمجھیں ایک انگلی ہے اگر سارا عالم بڑے بڑے بزرگ اولیا رمل کر یہ کہیں کہ یہ دو انگلیاں ہیں ایک نہیں تو آپ کو اس ایک انگلی کے دو ہونے کا خطرہ بھی نہیں آئے گا۔ یہ ہے یقین اسی کی تلاش ہے۔ یہ انگلی بھی ایک ہے۔ اور اللہ وحدہٗ لاشریک بھی ایک ہے۔ انگلی کا ایک ہونا تو مشاہدہ ہے۔ اور اللہ کا ایک ہونا غیب ہے۔ تو یومنون بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ غیب کا ان کو اسی طرح یقین ہے جس طرح شہادت کا یومنون بالغیب (بقرہ-۳) کے معنی کما یومنون بالشہادۃ بالکل نئی تفسیر ہوگئی۔ اپنے بندوں کی مدح کی ہے۔ یہ ان کا ایمان بالغیب ایسا ہے جیسے ایمان بالشہادۃ ہو جسطرح ایمان بالشہادۃ نہیں ٹوٹ سکتا اسی طرح ایمان بالغیب نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔ کہ جب ایمان ایسا ہو کہ ٹوٹ نہ سکے اور کوئی شک شبہ جگہ نہ پاسکے تو دل میں استقرار ہو جاتا ہے ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی ثبوت کا نام اطمینان ہے۔ یہ ایمان اور یقین کی فرع ہے۔ جب کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے۔ دل میں بات جم جاتی ہے۔ اس جم جانے کا نام اطمینان ہے۔ یہ جو اسباب ہیں۔ بازار سے کپڑے میں گرم روٹی لائے کپڑا گرم ہوگیا۔ ؟ کیوں۔ اس لئے اس میں گرم روٹی لپیٹی تھی۔ روٹی کیوں گرم تھی جواب گرم توے پر سے اتری تھی۔ توا کیوں گرم ہے۔ آگ پر رکھا ہے۔ یہاں

سوالات ٹھہر گئے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آگ کیوں گرم ہے۔ گرم آگ فعل الٰہی ہے۔ معلوم ہوا کہ تمام اشیاء، تمام حقائق تمام واقعات اللہ کی ذات یا اس کے فعل پر آکر ٹھہر جاتے ہیں۔ تو سوالوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے یہ کیوں یہ کیوں یہ کیوں بالآخر اللہ پاک کی ذات پر آکر سلسلہ ٹھہر جاتا ہے یہی معنی ہیں الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (رعد)

یہ ضابطہ جو اللہ پاک نے بتایا ہے بالکل عقل کے مطابق ہے اور اس کو میں الجبرے کے مساوات کی طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ یہی بات صحیح ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ مجھے اور ملے مگر یہ کائنات محدود ہے ہر شخص چاہتا ہے کہ میں لے لوں لیکن یہ کتنی بھی کثرت سے مل جائے محدود ہی ملے گا۔ اور مزید کی خواہش باقی رہے گی تو کائنات کے خواہشمندوں میں ہمیشہ بیر ہوگا۔ دشمنی اور عداوت ہوگی۔ اللہ پاک لاانتہا ہے۔ اور ہر چاہنے والے کے لئے لاانتہا ہے۔ لہٰذا اس کے چاہنے والوں کی طلب مطمئن ہو جاتی ہے اور ان میں محبت ہوتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ‌ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۝ اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝ (بقرہ ۲۶۱-۲۶۲)

جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانے سے سات بالیں پیدا ہوئیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اور خدائے تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے دوگنا تین گنا چار گنا کر دیتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ کی قدرت وسیع ہے اور وہ جاننے والا ہے ہر شئے کو۔ ان کی مثال سے مطلب یہ ہے مثل صدقات الذین ان کے صدقے دینے کی مثال۔ اگر ایک دانہ صدقہ کیا جائے تو اس کے عوض میں ۷۰۰ دانے ملیں گے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی بال ایسی موجود ہے جس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس طرح آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ایک دانہ بونے سے سات سو دانے ہو جاتے ہیں اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ایک نیکی کے عوض ۷۰۰ نیکیاں اجر میں ملیں گی۔ فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بعض مفسرین نے یہ معنی بتائے ہیں کہ جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے اور دوسرے مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ اس سے تمام کار خیر میں خرچ کرنا مراد ہے مساکین پر خرچ کرنا۔ جہاد میں خرچ کرنا۔ انتظام عالم میں خرچ کرنا۔ پُل بنانا۔ سڑک بنوانا وغیرہ۔ تو جو لوگ اس میں خرچ کریں گے ان سے سات سو گنے کا وعدہ فرمایا اور فرمایا کہ اللہ پاک جس کو چاہے گا اس سے بھی زیادہ عنایت فرمائے گا۔

جس طرح انسان کو سودے میں اگر تھوڑا سا فائدہ بھی نظر آتا ہے اور

اس کا یقین ہوتا ہے تو فوراً اس سودے کو خرید لیتا ہے تو اگر اسی طرح اس کو اس کا یقین ہو جائے کہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا انعام اور فائدہ سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ ہے تو فوراً خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا وَاللہ یضعف لمن یشاء۔ اللہ جس کو چاہے گا بڑھائے گا مفسّرین نے یہ فرمایا ہے متقی لوگوں کا اجر بڑھا دیتا ہے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ سب کی نہیں بعض متقی کی بڑھاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کی نیت میں بے انتہا خلوص ہوتا ہے۔ اور لبقدر خلوص نیت ان کے اجر میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اللہ پاک نے یہ نہیں فرمایا کہ وَاللہ یضعف لمن تقیٰ بلکہ فرمایا یضعف لمن یشاء جس کو چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے تو وجہ صرف مشیت ہے اور وہاں اتقا اور غیر اتقا کا سوال ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک گناہ گار سے اللہ پاک سوال کریگا تعرف ذنبک کذا۔ تعرف ذنبک کذا۔ تعرف ذنبک کذا تو اپنے اس گناہ کو جانتا ہے اے بندے تو اپنے اس گناہ کو جانتا اور اس گناہ کو جانتا ہے۔ تمام گناہوں کا اقرار کریگا اور کوئی نیکی نہیں ہوگی تو اللہ پاک فرمائے گا اچھا جا تجھے بخش دیا۔ تو وہ بڑے تعجب سے پوچھے گا اللہ پاک میرے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہیں ہے اور پھر بھی تو نے بخش دیا ہے تو اللہ پاک فرمائے گا کہ ہاں ایک روز سوتے میں تو نے کروٹ لی تو تیری زبان سے "اللہ" نکلا تجھے وہ یاد نہیں رہا۔ مجھے یاد ہے۔ اس لئے میں نے تجھے بخش دیا۔ تو وہاں التقیٰ اور غیر التقیٰ کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہے حدیث اور قرآن یہ ہے کہ کل نمد هٰؤلاء وهٰؤلاء ہم سب کی مدد کرتے ہیں یہ ہوں یا وہ ہوں یعنی متقی غیر متقی سب (اسراء - ۲۰ - ۱۵) کی امداد فرماتا ہے من عطاء ربک تیرے رب کی مہربانی اور فضل سے (اسراء ۲۰)

وماکان عطاء ربک محظورا ۱ اور تیرے رب کی عنایت ایسی گھری ہوئی اور (اسراء - ۲۰)
محدود نہیں ہے کہ وہ نیکوں ہی کے لئے ہو۔ من یشاء کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ کوئی شرط
نہیں ہے۔ جس کو چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ میں ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کر رہا
ہوں بلکہ چونکہ وہ بہت متقی لوگ تھے ان کی نظر ہمیشہ اتقاء پر ہی رہتی تھی ہم چونکہ
اس درجہ کے نہیں ہیں۔ ان سے گھٹیا درجہ کے ہیں اس لئے ہماری نظر اس کے
رحم و کرم پر ہی رہتی ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس تو کوئی نیکی نہیں، عمل صالح نہیں، کچھ نہیں
تو اب صرف ایک ہی شئے رہ گئی اس کا فضل و کرم تو اسی قسم کے مضامین بیان
کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ انا عند الظن عبدی بی میں اپنے بندہ
کے گمان کے ساتھ ہوتا ہوں۔ (بخاری، مسند احمد وغیرہ) مجھے رحیم خیال کرے گا تو مجھے رحیم ہی پائے گا۔ لاکھ
سمجھے گا تو لاکھ دیدوں گا اور کروڑ سمجھے گا تو کروڑ دیدونگا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ
بدکاری کرنی چاہیئے بلکہ نہایت نیک عمل کرنے کے بعد اس کے فضل اور اس کے
کرم کا امیدوار رہنا چاہیئے۔ اس کے کرم کے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ تمام انبیاء
اولیاء ملائکہ سب یرجون رحمتہ ویخافون عذابہ اس کے کرم کے محتاج
ہیں اور اس کے خوف سے سب لرزاں اور ترساں ہیں۔ (اسراء - ۵۷) محض اس کے فضل سے ہی
خاتم النبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنّت میں جائیں گے۔ افضل الکائنات ہونے کی
بناء پر جنت میں نہیں جائیں گے اس کے کرم سے جائیں گے وکان فضل اللہ
علیک عظیما تیرے رب کا بڑا فضل ہوا تیرے اوپر۔ ان کی سب سے بڑھی بڑائی
(نساء - ۱۱۳) یہی ہے کہ ان پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

خاص بات سمجھنے کی یہی ہے کہ روپیہ خرچ کرنے میں اتنا عظیم الشان

بدلہ کیوں ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کوئی بڑی مکرم ہستی بڑا آدمی دوکان پر آیا اور کہا کہ میرا فلاں کام کرآؤ۔ میں دوکان پر اکیلا تھا تردد میں رہا کہ دوکان اکیلی چھوڑ کر کیسے جاؤں اور ان کی بزرگی اور اکرام کی وجہ سے ان سے کچھ کہہ نہ سکا کہا کہ دوکان اکیلی رہے گی میں یہاں بیٹھا ہوں اتنی دیر میں تمہارا کام کر دونگا۔ تم میرا کام کرآؤ تو چونکہ وہ باعزت آدمی تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر بیسیوں گاہک دوکان پر آ گئے۔ اور خوب مال بکنے لگا تو روزی کا پہنچانا تو خدا کا کام تھا۔ روزی کا پہنچانا تو اسی کے ذمہ ہے نا۔ تو آپ نے اس کا یہ کام کر دیا۔ اب چونکہ وہ بہت زیادہ معزز ہے۔ وہ بہت دیر تک آپ کا کام کرتا رہا اور آپ کو بہت زیادہ فائدہ ہوا بالکل واضح حسی مثال موجود ہے۔ روز تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ روزی پہنچانا اس کا کام تھا آپ نے اس کا کام کر دیا۔ اس کا ہاتھ بٹا دیا تو جتنی دیر آپ اس کا کام کرتے رہے اتنی دیر اس نے کہا کہ میں تیرا کام کرتا ہوں۔ کام کا حصول کام کرنے والے کی قوت پر ہے جو جتنا قوی ہوگا اتنا ہی بڑا اور زیادہ کام کر سکے گا۔ تو اگر ایسا قوی آجائے جس سے زیادہ قوی ممکن نہ ہو تو وہ جو کام کریگا اس کے منافع کا کیا ٹھکانا ہے یہ تو مبالغہ کے لئے سات سو کہہ دیئے سات سو گنتی میں آ سکتے ہیں جو شخص سب سے اخیر جہنم سے نکلے گا اس کو اس جہان سے دس گنا ملے گا۔ تو اوروں کو جو ملے گا وہ شمار میں نہیں آ سکتا۔ کیا کوئی شمار کرے گا۔ کہاں تک گنتی کرے گا۔ کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کی فہم کے مطابق کہ ان کا دل گنتی کی طرف راجع ہے سات سو کہہ دیا۔ وہ تو اتنا دے گا کہ ان کی گنتی نہیں ہوگی۔ بے حساب دے گا۔ اور اس کی دلیل ہے۔ واللہ واسع علیم۔

پہلے ایک نکتہ اور سمجھ لیں کہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے معنی جہاد، ہجرت، انتظام

عالم میں خرچ کرنے کے نہیں ہیں۔ یہ تفصیل تو صحیح ہے مگر یہ مفہوم یہ نہیں ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے کا مفہوم ہے "خدا کے حکم کے مطابق"۔ بیٹا، بیٹی، بیوی، ماں، باپ کو ایک پیسہ نہیں دیا اور دوسروں کو لاکھ روپیہ کھلا دے یہ راہ خدا نہیں ہے۔ راہ خدا وہ ہے جو وہ حکم دے۔ نہ راہ خدا مسجد کا بنوانا ہے نہ جہاد میں خرچ کرنا ہے، راہ خدا وہ ہے کہ کہدے کہ پھینکدے بس وہ پھینکنا راہ خدا ہے۔ حج میں لاکھوں جانور ذبح ہوتے ہیں۔ کسی مسکین وغیرہ کو نہیں ملتا۔ بس میرے حکم سے ذبح کردو چاہے مسکین فقیر کو ملے یا نہ ملے یہ راہ خدا ہے۔ مثال سے میں نے واضح کردیا کہ بیوی بچوں کو بھوکا رکھا اور سارا مال جہاد میں دے دیا یا غریبوں میں تقسیم کردیا یہ راہ خدا نہیں ہے۔ راہ خدا وہ ہے جو اس نے کہا۔ اپنے نبیؐ کے ذریعہ جو خدا نے بتایا وہ ہے راہ خدا۔ کوئی نیکی نیکی نہیں ہے بس اس کے حکم کے مطابق کرنا نیکی ہے۔ ورنہ نیکی دیکی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بیوی بچوں کو ماں باپ کو کھانا نہیں دیا اور لوگوں کو کھلا دیا تو مجرم بنے گا، سزا ملے گی۔ حقداروں کو محروم کردیا اور شدید ضرورتمندوں کو اپنا تمام مال وصیت کردیا تب بھی برا ہے۔ حکم خدا کے مطابق عمل کرنے کا نام دین اللہ، سبیل اللہ، راہ خدا ہے۔ علماء نے جو تفسیریں کی ہیں وہ ظاہر کے اعتبار سے کی ہیں۔ میں اعتراض ان پر نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ باقی بات یہی صحیح ہے جو میں کہہ رہا ہوں، واللہ واسع علیم۔ اللہ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے۔ کوئی یہ خیال کرے کہ اتنا کہاں سے دیگا تو فرمایا وان من شیٔ الا عندنا خزائنہ (حجر۔۲۰) کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے گودام کے گودام بھرے ہوئے ہمارے پاس نہ ہوں۔ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (حجر۔۲۰) میں بقدر ضرورت لوگوں کو دیتا ہوں ورنہ میرے پاس تو ہر شئے کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ معنی ہیں واللہ واسعٌ کے اب

کہا علیم۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ کس نیت سے دے رہا ہے۔ اپنے دل کی خوشی کے لئے دے رہا ہے۔ شہرت کے لئے دے رہا ہے یا کوئی اور مقصد ہے۔ یا میری خوشنودی کے لئے دے رہا ہے۔ اس بات کو فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ کس نیت سے دے رہا ہے۔

اب فرمایا اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًی (بقرہ-۲۶۲) غور سے سننا چاہئے۔ یہ احکام کی باتیں ہیں، یہ عمل کے لئے ہیں۔ خالی سننے کے لئے نہیں ہیں۔ سنکر عمل فوراً کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو علم العمل ہے اس میں عمل مقصود ہے۔ جو علم الحقیقت ہے اس میں علم مقصود ہے۔ جیسے اللہ کی ذات وصفات کا علم آخرت کا علم۔ اور جو علم العمل ہے اس میں عمل مقصود ہے۔ ایک جاہل آدمی ہے نماز پڑھ رہا ہے۔ ایک عالم ہے نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو وہ جاہل عالم سے زیادہ بہتر ہے اور عمل بھی جب کارگر ہے کہ وقت نہ نکل جائے۔ اس لئے کہ جو وقت گذر گیا۔ وہ حاصل نہیں ہو سکتا وہ برباد ہو گیا۔ آئندہ کی خبر نہیں کہ آتا بھی ہے یا نہیں تو بس یہی آن ہے فوراً عمل ہونا چاہئے اگر وقت نکل گیا تو وہ علم بھی بیکار ہے۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے سے کہے کہ سانپ نہ پکڑیو ڈس لے گا۔ تو مر جائے گا۔ وہ باپ کا کہنا نہ مانے اور پکڑ لے اور سانپ اس کو ڈس لے تو اب وہ پکارے کہ اے باپ میں تیرا حکم مانوں گا۔ اب میں سانپ کو نہیں پکڑوں گا تو اب بیکار ہے عمل کا وقت گذر گیا۔ اب تو جزا کا وقت ہے۔ اس عمل کی سزا مل رہی ہے۔ نکتہ کی بات میں نے آپ کو بتا دی۔ اسی وجہ سے نزع کے وقت کا عمل نامقبول ہے کیونکہ عمل کا وقت گذر گیا۔ اصل شئے عمل ہے۔ جس وقت علم ہو جائے کسی نیک کام کا اسی وقت اس پر عمل ہونا چاہئے۔ وقت ضائع نہیں

کرنا چاہیے۔ اب فرمایا الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منًا ولا اذًی (بقرہ-۲۶۲)۔ راہ خدا اوپر بتا چکا ہوں۔ خدا کے حکم کے مطابق خرچ کرنے کا نام ہے۔ اگر آپ اپنی مرضی سے ۲۴ گھنٹے نماز پڑھتے رہے تو وہ بیکار ہے اگر خدا کے کہنے سے ۵ وقت نماز پڑھی تو وہ مفید ہے۔ نماز بھی جب نیک کام ہے جب اللہ فرمائے کہ نماز پڑھو۔ اگر اللہ پاک نے نہیں فرمایا تو وہ نماز بیکار چیز ہے فضول مشقت ہے۔ اسی طرح صدقہ اللہ کے حکم کے مطابق صدقہ کیا تو وہ نیکی ہے اور حکم کے مطابق خرچ نہیں ہو رہی ہے تو وہ رقم ضائع ہو رہی ہے۔ آجکل کے لوگ کہتے ہیں کہ قوم کی ہمدردی یا دوسروں کی امداد یہ دھوکا ہے۔ اگر آگ لگ جائے۔ پانی میں ڈوبنے لگیں تو آپ خود کو بچائیں گے یا دوسروں کو سب ڈوب جائیں پرواہ نہیں۔ ہم بچ جائیں قوم کا فائدہ غلط، ملک کا فائدہ غلط۔ اپنا فائدہ ہونا چاہیے۔ پھر یہ قوم و ملک کا فائدہ کیا ہے۔ یہ اس وقت مفید ہے جب اللہ پاک حکم دے۔ اور اگر اس نے حکم نہیں دیا تو سب بیکار ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ پاک کے حکم کے مطابق عمل کرنے کا نام سبیل اللہ ہے۔ دین اللہ، سبیل اللہ یا مذہب، کیا چیز ہے اللہ کے حکم پر عمل کرنا۔ اس کے مطابق عمل کرنا۔ کوئی ولی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے لا تزکوا انفسکم اپنے آپ کو ولی مت سمجھو ھو اعلم بمن اتقیٰ (نجم-۳۲) وہ خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ خدا جس کو ولی کہدے وہی ولی ہے۔ جس کو نبی کہدے وہی نبی، جس کو مومن کہدے وہی مومن، جس کو کافر کہدے وہی کافر۔ عقل سے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اگر یہ کہو کہ اللہ تبارک تعالیٰ کو وحدہٗ لا شریک جاننا یہ ایمان ہے تو یہ غلط ہے۔ جنت، دوزخ پر ایمان لانا۔ ملائکہ پر ایمان لانا۔

اسی کو سب علماء کہتے ہیں کہ یہ ایمان ہے۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ ایمان وہ ہے جسے خدا ایمان کہے۔ شیطان کو پورا علم ہے کہ اللہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ جنّت میں رہا ہے۔ جنّت اور دوزخ کا علم ہے۔ قیامت تک کی ڈھیل مانگی، قیامت کا علم ہے۔ فرشتوں کا علم ہے۔ مگر اللہ پاک نے فرمایا وکان من الکافرین اللہ جس کو کہدے کافر بس وہی کافر ہے۔ وحدانیت کا اس شدّت سے قائل ہے کہ اس نے کہا کہ میں تیرے کہنے سے بھی شرک نہیں کروں گا۔ آدم کو سجدہ نہیں کروں گا تو معلوم ہوا کہ موحّد ہونا اور فرشتوں، جنّت، دوزخ، قیامت کا قائل ہونا ایمان نہیں ہے اور تم تو محض قائل ہی ہو اس کا تو مشاہدہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا قائل ہوگا۔ مگر ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین (البقرہ-۳۱) لیکن اس نے کہدیا کہ اس نے کہا نہیں مانا اور اکڑا تو میں نے اس کا نام کافروں کی فہرست میں لکھدیا۔ کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ بس ایک ہی ضابطہ ہے جو وہ کہدے وہی ٹھیک ہے۔ جو وہ کردے وہی عدل ہے۔ وہی صواب ہے۔ اب یہ بات عقل میں آتی ہے کہ فَقَالَ هٰذِهٖ لِهٰذِهٖ وَلَا اُبَالِیْ وَقَبَضَ قَبْضَۃً اُخْرٰی الخ روحوں کو ایک مٹھی میں بھرا جنت میں ڈالدیا۔ ایک مٹھی بھرا دوزخ میں ڈالدیا۔ اور فرمایا کہ مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ خدا تو ایسا ہی ہوگا۔ ولقد ذرانا لجہنم کثیرا من الجن والانس (اعراف ۱۷۹) ہم نے کثیر جن وانس کو جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے۔ ختم ہوگیا قصہ۔ جو اس نے پیدا کردیا وہ ٹھیک ہے اور اس مضمون کو منفردانہ اور مجتہدانہ طریقہ پر الگ ثابت کردیا ہے کہ یہی بات صحیح ہے۔ کہ جو وہ کہہ دے وہی بات ٹھیک ہے اور جو وہ کرے وہی صواب ہے اور عدل ہے۔ چاہے وہ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ شرعی دلیل تو یہ ہے کہ قولہ الحق (انعام ۷۳) جو وہ کہدے وہی حق ہے۔ اب یہ بات عقل میں آتی ہے کہ آگ گرم ہے۔ اس نے کہدیا نہیں آگ

ٹھنڈی ہے۔ یانار کونی برداً محض اس کے کہتے ہی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ جو آدمی قتل ہوگیا اس کو مردہ ہی کہیں گے۔ یہ بات عقل میں آتی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ نہیں اس نے (انبیاء-۶۹) کہدیا کہ شہید کو مردہ مت کہو میں نے اس کا نام زندہ رکھدیا۔ انک لاتسمع الموتیٰ تو مردوں کو نہیں سُنا سکتا تو ابوجہل اور ابولہب وغیرہ تو زندہ تھے وہ مردہ کب تھے (نمل-۸۰) لیکن اس نے کہا کہ نہیں میں نے ان زندوں کا نام مردہ رکھدیا۔ وہ مردہ ہیں۔

لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات پھر کہا کہو یہاں ھم محذوف ہے بل ھم احیاء بلکہ وہ زندہ ہیں ولکن لا تشعرون (بقرہ-۱۵۴) تم کیا جانو زندہ کس کو کہتے ہیں۔ طبیب جو نبض دیکھتے ہیں وہ کیا ہے۔ حرکت قلب دیکھتے ہیں۔ اگر حرکت دیکھی زندہ کہدیا اگر حرکت نہیں دیکھی مردہ کہدیا۔ تو تمہارے خیال میں حس و حرکت کا نام حیات ہے۔ انسانوں میں اور جانوروں میں بھی کیونکہ چیونٹی بھی زندہ اور مردہ میں فرق کرتی ہے۔ مردہ کی چارپائی کے پایوں کے نیچے پانی کے کٹورے رکھ دیتے ہیں تاکہ چیونٹی نہ چڑھ جائے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ جسم مردہ ہے اور اب وہ کھایا جا سکتا ہے۔ زندہ جسم کو چیونٹی نہیں لگتی۔ حس کیا چیز ہے وہ ہر شئے کا ادراک کرتی ہے۔ لیکن آج تک اس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ خود حس کیا ہے۔ اور حرکت کیا ہے۔ کسی جسم کا ایک حیز کو چھوڑ کر دوسرے حیز میں جانے کا نام حرکت ہے۔ اور اس کا ایک جز مٹتا ہے تو دوسرا پیدا ہوتا ہے۔ جیسے قدم ایک مٹتا ہے تب دوسرا پیدا ہوتا ہے۔

تو یہ مجتمع الاجزاء نہیں ہے۔ تو حرکت جمع کہیں نہیں ملے گی۔ اس کا مستقل وجود ہی نہیں ہے اور حس بے حس ہے اس کو اپنا ہی پتہ نہیں کہ وہ کیا ہے۔ اور ان دونوں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ تو دونوں مخلوق ہیں اور ناقص ہیں۔ اور مخلوق

ہونا اور ناقص ہونا یہ خدا کی شان کے خلاف ہے تو خدا میں نہ حس ہے نہ حرکت ہے تو بتاؤ کہ خدا بغیر حس و حرکت کے حی ہے یا نہیں۔ تو وہ زندگی کیسی ہے۔ ایسی زندگی ہے وہ جس کا تمہیں شعور نہیں ہے والشہداء عند ربھم. شہداء اپنے رب کے پاس ہیں تو ان کی زندگی بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ جس (اللہ) کے پاس وہ ہیں ولکن لا تشعرون۔ تم نہیں جانتے وہ زندگی کیسی ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ اس الجھن میں مت پڑو۔ جو میں نے کہدیا اس کو مان لو۔ اس کے ماننے میں فائدہ بھی ہے اور یہ حق ہے۔ اور اگر کہو تو یہ میں سمجھا دوں گا۔ یہ بھید اللہ کے فضل سے مجھے معلوم ہو گیا۔ قرآن بھرا پڑا ہے۔ کوئی کوئی بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ قوت ہے ورنہ اس انداز سے کوئی شخص بول بھی نہیں سکتا اتنی جرأت کہاں ہوتی ہے ایک حسی مثال سے اس کو سمجھ لیں کہ جب آدمی سوتا ہے اور خواب دیکھتا ہے تو خواب میں مجلس مرتب ہوتی ہے۔ کھاتا ہے۔ پیتا ہے۔ بات چیت کرتا ہے۔ یہ سونے والا اس محفل کا ایک فرد ہوتا ہے اب آپ نے اس کو جگا دیا تو وہ اس محفل سے مر گیا تو اس محفل والے یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ کس زندگی میں گیا۔ اس محفل کے آدمی اس زندگی سے کیسے مطلع ہو سکتے ہیں تو وہ فرماتا ہے کہ تم کیسے جان سکتے ہو اس حیات کو تم تو خواب کی محفل کے آدمی ہو۔ تم سمجھ رہے ہو کہ وہ مر گیا وہ دراصل ایسی زندگی میں چلا گیا جو تمہارے تصور میں بھی نہیں آ سکتی اگر ذرا سا علمی تعاون کریں تو جتنے دہریئے ہیں یورپ اور امریکہ کے سب کو اس وقت شکست دے سکتے ہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ الجبرے کی مساوات اور اقلیدس کے اشکال کی طرح حل کر کے بتادوں گا کہ عمر کہہ رہا تب وہی ٹھیک ہے۔ خواہ دل کو لگے یا نہ لگے۔ اگر آپ کے کوئی چھری ماردے تو دکھ تو ہوگا لیکن یقین تو ہوگا کہ دکھ ہو رہا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ دکھ بیماری، مفلسی

یہاں اور عذاب وہاں دیدے گا۔ لیکن اس کا تو یقین ہوگا کہ دینے والا اور کرنے والا ایک ہی ہے۔ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ ہاں تو اب آیت کی طرف لوٹتے ہیں۔ الذین ینفقون اَمْوالھُمْ فی سبیل اللہ۔

تو جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ نیکی بھی مراد نہیں ہے خواہ وہ شرع شریف سے ہی معلوم ہوئی ہو۔ غریبوں کو کھانا کھلانا شریعت کے مطابق۔ اس میں یہ قید لگی ہوئی ہے۔ حضور صلعم نے یہ فرمایا کہ سب سے بڑا صدقہ وہ ہے جو اپنے اہل وعیال پر صرف کیا جائے۔ پھر قرابت داروں پر پھر عام مسلمین میں۔ پھر جہاد میں۔ سب سے بڑا صدقہ کیا ہے۔ اپنے اہل وعیال اور ماں باپ گھر والوں پر صرف کرنا۔ انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ خرچ کرو اس مال میں سے جس کا ہم نے تم کو منیجر بنایا ہے تم مالک نہیں ہو۔ (حدید ۲) یہ کلرک ہیں۔ ایک بیوی ہے بچہ ہے۔ بیٹی ہے۔ بہن ہے۔ یہ سب میرے کلرک ہیں۔ میں نے تم کو ان کا منیجر بنایا ہے۔ یہ میرا مال ہے۔ اس میں سے ان کو اتنا اتنا دے دو۔ آپ اس کو اپنا مال سمجھ رہے ہیں۔ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ۔ اٹھنا، بیٹھنا لیٹنا، سونا، بولنا، چلنا، پھرنا۔ چپ رہنا۔ کل حرکت وسکون کے ساتھ حکم الٰہی متعلق ہے۔ تو جس طرح اس نے کہا حرکت کرو، اسی طرح حرکت کرو وہی عبادت ہے جس طرح اس نے کہا سکون کرو، اس طرح سکون کرو وہی عبادت ہے اگر مسجد میں ۵ منٹ پہلے چلے گئے اور نماز کا انتظار کیا تو اس نے کہدیا کہ اسی کا نام نماز ہے نماز کا انتظار نماز ہے۔ جس طرح میرے کہنے سے نماز کو تم نے نماز مانا ہے اسی طرح میرے کہنے سے مانو کہ نماز کا انتظار بھی نماز ہے۔ ہر چیز اسی کے کہنے کے مطابق ہونی چاہیئے۔ غسل کرو تو۔ وضو کرو تو۔ پخانہ جاؤ تو۔ پیشاب کو چلو تو کہا

کھاؤ تو۔ پانی پیو تو۔ ہر جگہ اس کی خوشنودی مقصود ہونی چاہئے۔ یہ سب دین ہے۔ یہ پوری دنیا دین ہے۔ اس کی مرضی کے مطابق چلاؤ دین ہے۔ اگر اپنی مرضی کے مطابق چلاؤ تو اسی کا نام دنیا ہے۔ یہ دھوکا ہوگیا ہے کہ مسجد میں خدا کا دین ہے اور بازار میں دنیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مسجد میں دنیا ہے۔ بازار میں خدا کا دین ہے۔ بازار میں بیٹھ کر پورا تول دیا تو یہ دین ہے۔ اور مسجد میں بیٹھ کر بکواس کی تو یہ دنیا ہے۔ اس نے بتایا یہ پوری دنیا جو ہے یہ میری فیکٹری ہے، کارخانہ ہے اور مسجد جو ہے یہ دفتر ہے۔ پانچ وقت آکر حاضری دو اور اپنے کام کی رپورٹ پیش کرو اگر بازار میں ٹھیک کام کیا تو نماز میں کوئی وسوسہ نہیں آئے گا۔ صحیح حلاوت آجائے گی اور اگر حلاوت نہیں ملی تو فیکٹری میں کام ٹھیک نہیں کیا اس نے بتا دیا کہ مسجد میرا دفتر ہے۔ اس میں آکر حاضری دو۔ اور اپنی رپورٹ پیش کرو۔ کیسا کام کیا رپورٹ صحیح ہونے پر اس کے فضل کی ضرورت ہے ہمیشہ اس کے فضل کا امیدوار رہنا چاہئے۔ برابر کہہ رہا ہے سئل اللّٰہ من فضلہ (ق ۳۲-۳) اس سے کوئی دعا مت مانگا کرو۔ اس کا فضل مانگا کرو اس کے کرم کا امیدوار رہنا چاہئے۔ یہ سب انبیاء اولیاء یرجون رحمتہ (اسراء ۵۷) اس کے رحمت و کرم کے امیدوار میں دیخافون عذابا اور اس کے خوف سے لرزاں اور ترساں رہتے ہیں۔ کوئی نیکی نیکی نہیں ہے مگر جو منظور ہو۔ جس کی اس نے ممانعت کر دی بس وہی بدی ہے۔ میں ایک جگہ دعوت میں گیا تو وہاں کوئی بہت بڑا آدمی بھی مدعو تھا بہت بڑھیا بڑھیا کھانے چنے ہوئے تھے۔ ہم سب وہی کھا رہے تھے مگر اس بڑے صاحب نے ٹماٹر کے ٹکڑے ذرا ذرا سے کتر لئے اور کالی سی چٹنی رکھی تھی اس سے لگا کر کھالی۔ بس اس کو تمام کھانوں میں پلاؤ، قورمہ، متنجن ہمہ اقسام کے کھانوں میں سے کچھ پسند نہ آیا تو جو اس کو

پسند آگیا وہی ٹھیک ہے۔ پلاؤ قورمہ کیا ہے۔ یہ حج، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور چپکے سے کسی غریب حاجتمند کو دو پیسے دے دے۔ یہ وہ چٹنی ہے۔ لاکھ عبادت کریں نامنظور ایک چھوٹی سی عبادت کریں منظور۔ بس یہی کار آمد اور مفید ہے۔ اس کا مجھے تجربہ ہوا ایک چھوٹی سی سنت پر آپ عمل کریں اور وہ دائم ہو رکے نہیں تو یہ بہت بڑی چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے افضل الاعمال اَدْوَمُھَا سب سے بڑا عمل وہ ہے جو دائم ہو۔ اس کا تجربہ مجھے یوں ہوا کہ کئی سال ہوئے یہاں بہت بڑا طوفان آیا تھا۔ ٹھٹھہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔ اور ایک گاؤں ہے گجو وہاں تک پانی آگیا تھا، سمندر بنا ہوا تھا۔ چند روز کے بعد وہی خاک اڑ رہی تھی۔ کہیں کوئی نشان بھی اس طوفان کا وہاں نہیں تھا۔ پھر ہم نے مسجد میں دیکھا کہ سائبان سے بارش کے بعد بوند پانی جو ٹپکتا ہے اس نے پتھر جیسی سخت چیز میں گھاؤ ڈال دیئے تھے۔ تو سیلاب ایک مرتبہ آیا اور چلا گیا اور قطرہ برابر پڑ رہا تھا۔ اس نے گھاؤ ڈال دیا۔ اسی طرح ایک چھوٹا سا عمل برابر کریں گے تو روح کے اندر گھاؤ ڈال دے گا اور اگر سیلاب کی طرح بڑھیں گے تو ادھر آئے گا ادھر نکل جائے گا۔ کچھ بھی اثر نہیں ہونے کا۔ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ اللہ کی راہ کے معنی تو آپ کو بتا دئے خدا کے حکم کے مطابق اور خدا کے حکم کے مطابق کے معنی بھی سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر آپ کو کوئی حکم نہیں دیا اس کے معنی ہیں۔ رسول کے حکم کے مطابق۔ جو رسول حکم دے بس وہی اللہ کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ درحقیقت ان کی زبان سے خدا کہہ رہا ہے۔ جیسے ٹیلیفون سے بات کرنے والا بول رہا ہے بلکہ آواز ٹیلیفون میں سے آ رہی ہے۔ نبی ٹیلیفون کی زبان جانتا ہے۔

وہ اس کو سُن رہا ہے، سمجھ رہا ہے اور آپ کو سمجھا رہا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ نبی خدا کے حکم کا بہت زیادہ پابند ہے اور ہم معمولی پابند ہیں۔ صحیح پابندی وہی کرے گا، ہم اس کی پابندی کریں گے۔ عابدِ حقیقی نبی ہوتا ہے۔ باقی سب اس کی ریس کرتے ہیں۔ نبی بھی نماز پڑھتا ہے۔ آپ بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ دیکھنے میں دونوں ایک ہیں فرق یہ ہے کہ وہ اُجالے میں پڑھ رہا ہے اور آپ اندھیرے میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ بہت منور ہے۔ آپ سایہ میں ہیں۔ نبی کا کہنا ماننا، نبی کی اطاعت کرنا خدا کی اطاعت کرنا ہے۔

ثم لا یتبعون ما انفقوا اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں۔ خرچ کرنے کے بعد وہ دو کام نہیں کرتے۔ کیا؟ ولا منین (۱) احسان نہیں جتاتے۔ اور ولا اذی دکھ نہیں دیتے، ستاتے نہیں۔ یہ دو شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ جو یہ دو شرطیں پوری کرتے ہیں فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے نہ ان کے لئے ڈر ہے اور نہ غم۔ خرچ کرنے کا راہ خدا میں اجر عظیم ہے مگر شرط یہ ہے کہ غریب کو دینے کے بعد اس پر احسان نہ جتاؤ اور اس کو دُکھ نہ دو۔ احسان جتانا گناہ کبیرہ ہے۔ دکھ دینا اور ستانا گناہ کبیرہ ہے اس کا نقصان یہ ہوا کہ جو اجر اس کا اللہ کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ جب آتے ہیں دس بیس روپیہ دیدیتا ہوں۔ ابھی دس دن ہوئے تو آئے تھے اس وقت تم کو دس روپیہ دے دیئے تھے۔ یہ احسان جتانا ہے۔ گھڑی گھڑی چلا آتا ہے۔ خدا اس کی صورت کو غارت کرے۔ جب آتا ہے کوئی نیا بہانہ لیکر آتا ہے۔ یہ دُکھ دینا ہوا احسان جتانا بہت بڑی بات ہے۔ ایک تو مصیبت کا مارا اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا، پھر آپ کا ہاتھ اونچا، اس کا نیچا روپیہ لیتے ہی اس کا دل اور ٹوٹا اب جو آپ نے

احسان جتایا تو بالکل ہی دل ٹوٹ گیا۔ تو بجائے فائدہ کے مضرت ہی ہوگئی، شرمندگی ہوئی، اور شدید تکلیف پہنچی۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ احسان جتانے کو کیوں منع فرمایا اور اس کے علاوہ اس سے ایک بہت بڑا نقصان ہوگا۔ وہ یہ کہے گا میاں کہیں اور سے لے لینا۔ فلاں صاحب کے پاس ہرگز نہ جانا۔ وہ دیتے تو ہیں لیکن بہت شرمندہ کرتے ہیں اور جگہ جگہ کہتے پھرتے ہیں۔ بہت ذلیل کرتے ہیں۔ تو اس سے ایک تو نقصان یہ ہوا کہ ضرورتمند کی ضرورت پوری ہو نہ سکی اور بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ جب اس کے پاس نہ آیا تو اس کو مدد کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور یہ اجر سے محروم ہوگیا۔ اس کے علاوہ ایک باریک بات ہے اسے بھی سمجھ لیں۔ کہ عام طور پر مال خرچ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت مجبوری ہوتی ہے۔ تو خرچ کرتا ہے اپنی اولاد کو بھی نہیں دینا چاہتا۔ کچھ دیتا ہے پھر جب اور مانگتا ہے تو بہلاتا ہے۔ بہلانا اس کی دلیل ہے کہ دینا نہیں چاہتا تو اولاد کو بھی نہیں دیتا خواہ مرنے کے بعد وہ بانٹ لیں یہ اور بات ہے وجہ یہ ہے کہ وہ شرک پسند نہیں کرتا۔ بلا شرکتِ غیرے وہ مالک رہنا چاہتا ہے اب آپ دیکھئے کہ میں نے آپ کو دس روپے دیئے اور کہا کہ وہ شخص کھڑا ہے اس کو جا کر دیدو۔ اب آپ نے اس کو دس روپے دیئے اور کہا کہ دیکھو تم جہاں بھی ملو ہم کو جھک کر سلام کہا کرنا اور یہ بات میں نے بھی سن لی تو اب مجھے کہنا بُرا معلوم ہوگا، کہ روپیہ تو میں نے دیئے آپ خواہ مخواہ اکڑ رہے ہیں۔ تو یہ احسان جتانا جو ہے وہ خدا کی ناراضگی کا سبب بن گیا۔ وہ دے کب رہا ہے اس سے تو خدا دلوا رہا ہے اس کو عزت کے ساتھ دینا چاہیئے کہ یہ آپ کے روپے ہیں۔ مالک حقیقی نے آپ کو بھجوا دیئے ہیں۔ تو خدا بھی خوش ہوگا اور لینے والا بھی خوش ہوگا۔ کہ بھئی

آپ ملازمت نہ چھوڑیئے گا۔ آپ کی وجہ سے ہمیں بھی مل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیتا تو میں ہوں یہ اس کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ شرک کا شائبہ لازم آتا ہے تو احسان جتانے کو اس لئے منع فرمایا۔ احسان نہیں جتانا چاہیے۔

اب احسان نہیں جتایا اور دُکھ بھی نہیں دیا تو کیا ہوگا۔ اللہ کے پاس اس کا اجر جمع ہو جائے گا۔ جب وہ اس کے پاس جائے گا تو وہ اس کو دے دیگا۔ اس کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم ہوگا۔ غم تو یوں نہیں ہوگا کہ اس کا گیا کیا وہ مال تو اس کا تھا ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ پتہ نہیں اس کا اجر ملے گا یا نہیں تو فرما دیا وَلاخوف اس کا بالکل ڈر نہیں ہے۔ ضرور ملے گا۔ آگے بڑا وسیع مضمون ہے بڑا بڑا عالم اس میں لگا ہوا ہے۔ میں سب کی غلطی بیان کروں گا۔ اور اپنی رائے بھی دوں گا۔ اب اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ۔ ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں۔ وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص جس کو شیطان جھپیٹا مار کر خبطی کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سود بھی بیع کی طرح ہے۔ اور اللہ پاک نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا۔ تو اس کے لئے وہی ہے جو اس نے پہلے کیا۔ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے؛ اور جس نے دوبارہ اس طرف رجوع کیا۔ وہ اصحاب نار میں سے ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر جھپیٹا مار کر خبطی کر دیتا ہے۔ سنا ہوگا کہ بعض لوگوں کو آسیب ہو جاتا ہے اور وہ غیر معمولی حرکتیں کرتے ہیں۔ آسیب زدہ کی طرح کھڑے ہوں گے کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ سود بھی بیع کی طرح ہے اور اللہ پاک نے حلال کر دیا بیع کو اور حرام کر دیا سود کو۔ بس جس شخص کے پاس نصیحت رب کی طرف سے آئی اور وہ باز آیا تو اس کے لئے وہی ہے جو اس نے پہلے کیا۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ پھر اگر دوبارہ رجوع ہوئے اس طرف تو یہی لوگ اصحاب نار ہیں اور یہ آگ میں رہیں گے۔

الذین یاکلون الربٰوا — جو لوگ سود کھاتے ہیں ربا کے معنی زیادتی کے ہیں یہاں مراد وہ زیادتی ہے جو بیاج کی شکل میں لی جاتی ہے۔

کھانے سے مراد تصرف ہے۔ منہ میں کھانا نہیں ہے۔ اردو میں بھی ہم سود خور۔ سود کھانے والا ہی کہتے ہیں۔

کھڑے ہونے سے مراد یا تو میدان حشر میں کھڑا ہونا ہے یا قبر سے اٹھنے کے وقت پاگلوں کی طرح وہ گرتے پڑتے ہوں گے۔ یا مجنونانہ وار میدان میں ادھر ادھر کھا گئے

پھر یں گے۔ اور اس کی وجہ اللہ پاک نے یہ بتائی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ جس طرح بیع حلال ہے اسی طرح سود بھی حلال ہے۔ تو اللہ پاک نے جواب دیا کہ ہم نے بیع کو حلال کر دیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ تو جس نے نصیحت سننے کے بعد سود جو واجب تھا وہ نہیں لیا اور معاف کر دیا اس کے لئے جو وہ پہلے لے چکے ہیں اس کی اس کو معافی ہے۔ اور اگر نصیحت کے بعد بھی اس نے لیا تو وہ اصحاب نار سے ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اب جو مفسرین نے سود کی حرمت کی وجہ بتائی ہے میں بیان کرتا ہوں۔ بڑی جماعت مفسرین کی یہ کہتی ہے کہ سود کی جو زیادہ رقم لی جاتی ہے وہ مومن کا مال ہے اور مومن کے مال کا احترام اور حفاظت ضروری ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا خون قابل حرمت ہے۔ اسی طرح مومن کا مال بھی قابل حرمت ہے زیادہ رقم لینا ایسا ہے گویا مومن کے مال کا احترام نہیں کیا۔ اس کی حفاظت نہیں کی بلکہ اس کو نقصان پہنچایا۔ اس کا جواب یہ دیا کہ اتنے عرصہ جو اس نے روپیہ رکھا اور اس سے فائدہ اٹھایا تو یہ زائد رقم اس نے اپنے فائدہ میں سے دی اس طرح اس کا نقصان نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ دیا کہ فائدہ یقینی نہیں ہے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ فائدہ موہوم ہے۔ لیکن بیاج قطعی دینا ہوگا۔ اور قطعی اور موہوم برابر کی چیزیں نہیں ہیں۔ اس لئے حرام کیا گیا۔ دوسری وجہ مفسرین نے یہ بتائی کہ بلا سود روپیہ دینا کسی کا کام نکال دینا۔ یہ احسان ہے۔ اور احسان اچھی چیز ہے۔ اگر سود کو حرام نہ کیا جاتا تو آدمی احسان کے نیک عمل سے محروم ہو جاتا۔ تو احسان کو جاری رکھنے کے لئے سود کا دروازہ بند کر دیا۔

تیسری وجہ یہ فرمائی ہے کہ اگر سودی کاروبار جاری رہے گا تو سود خوار سود ہی کی آمدنی سے گذارہ کرتا رہے گا اور کوئی کاروبار نہیں کرے گا۔ اس سے نظام عالم بگڑ جائے گا۔ اس لئے سود کو حرام کر دیا تاکہ وہ سود کھانے پر اکتفا نہ کرے۔

چوتھی بات یہ فرمائی ہے کہ سود دینے والا غریب اور لینے والا مالدار ہوگا اگر سود جاری رکھا جائے گا تو غریب کا نقصان ہوگا۔ اور امیر زیادہ سے زیادہ امیر ہوتا چلا جائے گا۔ اور اللہ پاک رحیم و کریم ہے اس وجہ سے اس نے اس کو حرام قرار دے دیا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ وجوہ صحیح ہیں یا غلط۔ بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کسی مصلحت کی بنا پر ہیں تب تو مصالح تلاش کئے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا کہ یہ حکم اس مصلحت سے دیا گیا۔ مگر اس کے احکام کسی شے کے تابع نہیں ہیں۔ وہ مالک ہے۔ جو چاہے حکم کر دے۔ بلا کسی مصلحت اور وجہ کے جس شے کو چاہے حلال کر دے اور جس شے کو چاہے حرام کر دے۔ بیع بھی زیادت ہے۔ کہ دس روپے کی چیز ۱۲ روپے میں بیچ دی اور سود میں بھی زیادت ہے کہ دس روپیہ دے کر ۱۲ روپیہ لے لیا دونوں ایک دوسرے کی بالکل مثل ہیں اور کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بہت بڑے امام ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ فرق ہے وہ یہ کہ بیع میں معاوضہ ہوتا ہے۔ اور دونوں کی رضامندی ہوتی ہے یعنی اگر دس گز کپڑا ہے۔ وہ اس طرح بیچا جائے کہ اگر نقد خرید و تو ۱۰ روپیہ کا اور اگر ایک ماہ بعد دو تو ۲۰ روپیہ کا یہ بیع ہے اور جائز ہے۔ کیونکہ روپیہ کے بدلے میں کپڑا ہے اور رضامندی فریقین ہے۔ سود میں زیادتی ہے۔ مگر بدلے میں کچھ نہیں ہے اس لئے حرام ہے۔ مگر بات بنتی نہیں ہے۔ کیونکہ رضامندی وہاں بھی موجود ہے۔ لینے اور دینے والا جب دونوں رضامند ہوتے ہیں تب ہی سود کا لین دین بھی ہوتا ہے۔ لینے والے کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کپڑا دس روپے کا ہے اور اگر اس وقت ادا کرے گا تو دس روپیہ میں مل جائے گا۔ اور ایک ماہ بعد قیمت بیس روپیہ ادا کرنا ہوگی اور پھر وہ رضامند بیس روپے پر ہوگا تو یہ بیع جائز ہوئی۔ اس کی رضامندی کی وجہ سے تو اس طرح وہ دس روپیہ لے کر اگر بیس روپیہ دینے پر رضامند ہوگیا تو دونوں میں کوئی فرق نہ رہا اس کو بھی اسی طرح جائز ہونا چاہیئے تھا اور سود کو جو لوگ جائز سمجھتے ہیں یہی بات کہتے ہیں کہ یہ مثل بیع کے ہے۔ جب

دونوں ایک دوسرے کی مثل ہیں تو ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دینا یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ فریقین کی رضامندی سے تمام دیگر معاہدہ معتبر سمجھے جاتے ہیں تو اس سودی معاہدہ کو غیر معتبر کیوں قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ عقد بھی آپس کی رضامندی سے جائز اور حلال ہوتا ہے۔ ان کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کے جائز اور حلال ہونے کی علت رضامندی نہیں ہے۔ بلکہ علت وہ خدا کی اجازت اور منظوری ہے۔ جو اس رضامندی کو جائز قرار دے رہی ہے یعنی شرع۔ خالی رضامندی فریقین ہو اور کوئی اختلاف نہ ہو اس کو تو شرع نے حرام قرار دیا ہے۔ اگر شاہد نہ ہو اور نکاح نہ ہو تو ایسی رضامندی خواہ کتنے ہی صدق دل سے ہو ساری عمر کے لئے رفیقۂ حیات بننے کے لئے تیار ہو شرع اس کی اجازت نہیں دیتا وہ حرام ہے۔ اسی طرح سود کی رضامندی کی اجازت شرع نے نہیں دی۔ اللہ پاک مالک الملک ہے جس کو چاہے حلال قرار دے دے جس کو چاہے حرام قرار دے دے۔ اگر وہ سود کو حلال اور بیع کو حرام قرار دے دیتا تو بیع حرام ہو جاتا۔ اصل بات یہ ہے کہ علت خدا کا حکم ہے نہ کہ کوئی بیرونی مصلحت۔ اصول یہ ہے کہ نص کے مقابلے میں قیاس معتبر نہیں ہے۔ اللہ پاک نے شیطان کو سجدہ کا حکم دیا۔ اس نے حکم کے مقابلہ میں قیاس کیا کہ بہتر کو مسجود اور کمتر کو ساجد ہونا چاہیئے تو مجرم ٹھہرا۔ اگر مالک پانی طلب کرے اور نوکر قیاس کرے کہ اس وقت پانی دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اور نہ دے تو وہ معتوب ہوگا۔ میں کہتا ہوں قیاس ہی نہیں اس کے مقابلے میں مشاہدہ بھی غیر معتبر ہے۔ اللہ پاک کے حکم کے خلاف اگر مشاہدہ بھی ہو وہ غیر معتبر ہے۔ شہید کو دیکھ رہا ہے کہ قتل ہو گیا۔ گردن دور جا گری۔ اپنے ہاتھ سے اس کو دفن بھی کر دیا۔ اس سے زیادہ کیا مشاہدہ ہوگا کہ وہ مر گیا مگر اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں وہ زندہ ہے۔ تم کو اس کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔ تو جب مشاہدہ غیر معتبر ہو گیا تو قیاس کس گنتی میں ہے۔

اب یہ بات کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہی حق ہے۔ یہ بات ہم اچھی طرح آپ کو سمجھا سکتے ہیں کہ یہی بات صحیح ہے۔ دیکھئے۔ حکیم ڈاکٹر نبض دیکھتا ہے۔ وہ کیا دیکھتا ہے۔ وہ قلب

کی حرکت دیکھتا ہے۔ اگر حرکت ہے وہ اس کو زندہ کہتا ہے اگر حرکت ساقط ہوگئی وہ حکم لگاتا ہے کہ مرگیا اس کو دفن کردو تو حرکت کی شہادت پر آپ حیات کا اقرار کر رہے ھیں حرکت مجتمع الاجزاء نہیں ہے۔ وہ بے قرار ہے اتنی گھٹیا چیز کی شہادت تو آپ تسلیم کر رہے ہیں اور کائنات کا خالق جس کی شہادت دے رہا ہے اسکے حی ہونے میں کیا اعتراض ہے جتنی اشیاء ہیں سب خدا سے گھٹیا ہیں۔ ان کے کہنے سے تو ہم وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ پھر خدا جو کہے اس میں ہم شک کریں کتنی بڑی غلطی ہے۔

سود کی حرمت کو عقلی طریقہ پر آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔ یہ کسی تفسیر میں آپ کو نہیں ملے گا۔ جتنے جانور ہیں اپنی ضرریات انفرادی طور پر پوری کر لیتے ہیں۔ ان کو کسی دوسرے جانور کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسان اپنی ضرورت کے کل اسباب تنہا مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو دوسرے انسانوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تعاون کا نام شہریت یا مدنیت ہے۔ اسی لئے انسان کو مدنی الطبع کہتے ہیں کہ انسان اجتماع کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان کی تین ضرورتیں ہیں۔ کھانا۔ کپڑا اور رہائش۔

ضرورت اس شے کو کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ ملے تو وہ ہلاک ہو جائے اور جس شے کے نہ ملنے سے ہلاک تو نہ ہو مگر دکھ پائے اس کو حاجت کہتے ہیں۔

اب انسان جتنے کام کرتا ہے۔ وہ سب براہ راست یا بالواسطہ یا واسطہ در واسطہ انسان کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ یعنی وہ آکر کھانے، کپڑے اور رہائشی مکان میں مل جاتے ہیں۔ اور جو آکر ان سے نہیں جڑتے وہ کام انسانی زندگی میں دخیل نہیں ہیں۔ سوئی براہ راست زندگی میں دخیل نہیں ہے۔ مگر اس سے آگے چل کر کپڑا سلے گا اس لئے زندگی میں دخیل ہے۔ سیمنٹ مکان کے لئے اینٹ بنائے گا اس لئے یہ ضروری ہے۔ چھری ترکاری کاٹے گی۔ لوہار کا کام ضروری ہے۔ اگر یہ تمام چیزیں کپڑا، مکان اور کھانا براہ راست مل جائیں تو پھر کسی پیشے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سارے کام ایک شخص نہیں کر سکتا تو جماعت کرے گی۔ اور ایک جماعت کپڑے کا کام کرے گی۔ اور اس سے متعلق جتنے کام ہیں وہ

اس میں آگئے۔ اسی طرح ایک جماعت تعمیر کا کام کرے گی۔ اور ایک کھانا مہیا کرنے کا کام کرے گی اور اس کے متعلق جتنے کام ہوں گے وہ سب ان میں شامل ہو کر ضروری ہوں گے اور ایک جماعت دوسری جماعت کے عمل سے اپنا عمل بدلے گی۔ کھانے والا اپنا عمل تعمیر اور کپڑے والے سے بدلے گا۔ کھانا دے کر مکان اور کپڑے خریدے گا۔ اسی طرح دوسری جماعتیں اپنا اپنا عمل دوسرے کے عمل سے بدلیں گی۔ لیکن عمل کے براہ راست تبادلہ میں دقت ہے۔ کپڑے والے کو کھانا چاہیئے لیکن کھانے والے کو کپڑے کی ضرورت نہیں تو دقت ہو گی۔ اس لئے ایک ایسی شے اللہ پاک نے بنائی کہ ہر عمل اس سے بدلا جا سکے وہ ہے سکہ۔ سکہ اس لئے مقرر کیا کہ تبادلہ میں دقت نہ ہو۔ تو یہ سکہ یا روپیہ جو ہے وہ ضرورت نہیں ہے بلکہ عمل کے تبادلے کا ذریعہ ہے یہ خود عمل نہیں ہے۔ تبادلہ عمل کا عمل سے ہو گا۔ چونکہ روپیہ عمل نہیں ہے اس لئے اس کے بدلے دوسرے کا عمل نہیں لے سکتے۔ یہ یاد رکھو کہ ہر وہ عمل جو زندگی میں دخیل نہیں ہے وہ سب حرام ہے۔ تو ایسا عمل جو سرے سے عمل ہی نہ ہو وہ بدرجہ اولیٰ حرام ہو گا۔ شراب، جوا، گانا، ناچنا۔ زندگی میں دخیل نہیں ہیں۔ سب حرام ہیں۔ تو اصول یہ نکلا کہ حلال وہ عمل ہے جو زندگی میں براہ راست دخیل ہو یا واسطے سے دخیل ہو۔ اور جو عمل انسان کی زندگی میں دخیل نہیں ہے۔ لغو ہے۔ مضر ہے یا خلاف ہے۔ سب حرام ہے۔ اور سود انسانی زندگی میں دخیل نہیں ہے۔ بلکہ مہلک ہے۔ مضر ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔ اب دیکھ جائیے جس عمل کو ذرا بھی زندگی میں دخل ہے وہ حلال ہے۔ اور جن کو دخل نہیں ہے وہ سب حرام ہیں۔ اب نظام میں ایک اور خرابی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ضرورت تو ہے کم۔ عمل ہو گیا زیادہ تو نظام بگڑ جائے گا۔ یہ کام خلیفہ امام اور حاکم کا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ عمل ضرورت سے زیادہ نہ ہو تو عمل تو وہ جائز ہی رہے گا۔ وہاں سوال صحیح اور غلط کا ہو گا۔ حرام و حلال کا نہیں ہو گا۔

چونکہ تبادلہ عمل کا عمل سے ہو گا۔ اور روپیہ عمل نہیں ہے۔ اس لئے حرام ہے شرعًا اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ تو اب آیت کے معنی سمجھ میں آجانے چاہئیں کہ قالوا

انما البیع مثل الربوا۔ یہ کافر کہنے لگے کہ بیع اور سود دونوں ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ تو اے مسلمانو تم ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام کیوں کہتے ہو تو اللہ پاک اس کا جواب دیتاہے۔

واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ کہ اللہ پاک نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

فمن جاءہٗ موعظة من ربہ فانتھیٰ۔ فلہ ما سلف۔ جب اللہ پاک کی طرف سے نصیحت آگئی اور اس کے بعد وہ باز آگیا۔ یعنی چڑھا ہوا سود اس نے نہیں لیا۔ تو اس نے جو پہلے لیا وہ اس کی ملکیت ہے۔ یعنی اس کو واپس کرنا نہیں ہے۔ امرہٗ الی اللہ اس کا معاملہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہے۔ جو سود کو حلال جانتے ہیں۔ وہ قطعی جہنمی ہیں۔ اور جو اس کو حرام جانتے ہیں اور پھر کسی سبب سے لیتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ وہ ان کو معاف کرے خواہ سزا دے۔ اور جو بالکل سود نہیں لیتے وہ خدا کے مومن اور مطیع ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جو وہ پہلے سود لے چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ یہ نکتہ کی بات ہے کیونکہ حرام ہونے سے پہلے تو وہ سب صحیح تھا وہ تو معاف ہے ہی۔ اب جو آئندہ لے گا۔ وہ اللہ کے سپرد ہے چاہے سزا دے یا معاف فرمادے اور جو اس کو دوبارہ کرے وہ اصحاب النار میں سے ہے۔ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جس نے حرام سمجھا اور کھایا تو اس نے قانون تو مان لیا۔ عمل نہیں کیا۔ اسکو سزا ملے یا معافی ملے دونوں باتیں ہیں۔ لیکن جس نے اس کو حلال سمجھا اس نے قانون کو تسلیم نہیں کیا وہ باغی اسکی سزا ابدی جہنم ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝

(بقرہ - ۲۷۶ - ۲۷۷)

ترجمہ - اللہ ربا کو مٹا دیتا ہے یا گھٹا دیتا ہے اور صدقات و زکوٰتوں کو بڑھا دیتا ہے اور اللہ پاک پسند نہیں کرتا کسی کافر گناہ گار کو - بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور نمازیں پڑھیں اور صدقات و زکوٰۃ ادا کی ان کا بدلہ اللہ پاک کے پاس موجود ہے - اور ان لوگوں کو خوف و غم کوئی نہیں ہے -

تفسیر یمحق اللہ الربٰوا - اللہ پاک محو کر دیتا ہے، کم کر دیتا ہے - گھٹا دیتا ہے سود کو - اب یا تو وہ دنیا میں گھٹا دیتا ہے یا آخرت میں گھٹا دیتا ہے - دنیا میں گھٹانے کی وجہ یہ ہے کہ سود خور بالآخر اکثر فقیر ہو جاتا ہے - یا اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے وہ سود لیتا ہے وہ اس کے حق میں بد دعا کرتے ہیں اور اس کی پھٹکار اس پر پڑتی ہے اور لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا مال برباد ہو جائے - اس کے مال کے دشمن ہو جاتے ہیں - یہ مطلب مفسرین نے بتایا ہے اور آخرت میں گھٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک سود خور کے حج کو زکوٰۃ کو اور دوسری عبادتوں کو قبول نہیں فرماتا - ایک بات یہ بھی ہے کہ جو لوگ حلال کی کمائی سے امیر بنے ہیں وہ دوسروں سے غریبوں سے ۵۰۰ سال پیچھے جنت میں داخل ہوں گے - تو جس نے حرام کی کمائی اکٹھی کی اسکا تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتے - لیکن میرے خیال میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ سود میں تو سالانہ منافع چار یا پانچ فیصد ہے لیکن

اگر اس رقم کو تجارت میں لگایا جائے تو اس سے کہیں زیادہ منافع ہوگا یہ معنی ہیں گھٹانے کے۔ سود کی کمائی چونکہ غیر فطری ہے اس لئے اس میں برکت نہیں ہے۔ بہت قلیل منافع ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ جتنے کاروبار ہوتے ہیں اس میں منافع بھی بہت ہوتا ہے اور برکت بھی ہوتی ہے۔ اور تمام نظام عالم اسی پر چلتا ہے۔ سود میں کچھ لیا تو اس میں جڑ گیا اور صدقات میں کچھ دیا تو گھٹ گیا دونوں مقابلے کی چیزیں ہیں اس لئے دونوں کو بیان کیا۔

یُربی الصدقات۔ یہاں بڑھانے کے یہ معنی ہیں کہ جن لوگوں کو صدقہ دیا جاتا ہے وہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ اس کے مال میں برکت عطا کرے اور آخرت میں بڑھانے کے معنیٰ وہ ہیں جو اوپر آیت میں گذر چکے ہیں کہ ایک دانے سے سات بال اور ہر بال میں ۱۰۰ دانے اور فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ ایک لقمہ جب صدقہ دیا جاتا ہے تو اللہ پاک اسکو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور اسکو بڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ کوہ اُحد کے برابر ہوجاتا ہے۔ عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اکثر ہوتا ہے کہ میرے پاس کوئی شخص آتا ہے کہ میرا کام کر دو اور میں اکیلا دوکان پر ہوتا ہوں تو عذر کرتا ہوں کہ دوکان سے نہیں جا سکتا تو وہ یہ کہتا ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں آپ یہ کام کر آئیں۔ وما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا۔ (ہود-۶) کوئی چوپایہ ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ تو غریبوں کی روزی اللہ پاک کے ذمہ ہے اور صدقہ دینے والے نے جو غریبوں کو روزی پہنچائی تو یہ اس نے اللہ کا کام کر دیا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تو نے میرا کام کر دیا میں تیرا کام کر دیتا ہوں۔ اس نے مٹھی بھر جو دیئے اس کے بدلے جو اللہ پاک مٹھی بھر کر دے گا تو اللہ کی مٹھی کتنی بڑی ہے اس کو کتنا زیادہ مل جائے گا۔ یہ معنی ہیں صدقہ کو بڑھانے کے۔ یہ بالکل عقل کے مطابق ہے۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت ۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ۔ واقاموا الصلوٰۃ اور نماز پڑھی واٰتوا الزکوٰۃ اور زکوٰۃ صدقہ خیرات دیا لھم اجرھم عند ربھم ان کا اجر ۔ ثواب ۔ بدلہ ۔ مزدوری ۔ انعام اللہ کے پاس ہے ۔ ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون ان کو کوئی خوف اور غم نہیں ۔

ایمان کیا چیز ہے اور ایمان لانے کے معنی کیا ہیں ۔ یہ سمجھ لیں یہ آسمانی اور غیر آسمانی تمام مذہبوں میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ اللہ پاک کے وجود اور اس کی وحدت کو مان لینے کا نام ایمان ہے ۔ کہتے ہیں نا کہ لا الہ الا اللہ تو جو یہ کہے اس کو اس کہنے اور اس کو مان لینے سے کیا فائدہ ۔ یعنی اللہ کے وجود کو مان لینے اور اس کو ایک جاننے سے اسے کیا فائدہ ۔ بہت نازک بات ہے ۔ سارے عالم سے مقابلہ ہے بات کو سمجھتے نہیں ۔ ڈر ہے کہ کوئی غلط اثر نہ لے لے ۔ کثرت کی نفی اور وحدت کا اقرار کرنے سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہے سلسلے وار چلے آئے آپ نے مان لیا کہ اللہ ہے ۔ کیا فائدہ ہوا آپ کو ۔ آپ نے مان لیا کہ وہ ایک ہے کیا فائدہ ہوا ۔ پھر آپ نے اسکی تمام سفات رحیم کریم خالق وغیرہ کو تسلیم کرلیا ۔ کیا فائدہ ہوا ۔ لا الہ الا اللہ کلمہ تو حق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں لیکن جو معنی وہ بیان کرتے چلے آرہے ہیں ۔ ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے وہ سمجھے نہیں بات کو ۔

یہاں دو قسم کی حرکتیں انسان سے ہو رہی ہیں ایک تو ہیں انسانی اور ایک ہیں غیر انسانی ۔ یعنی حیوانی نباتاتی جماداتی ۔ خون کو پورے جسم میں پھینکنا ۔ خوراک کو ہضم کرنا وغیرہ ۔ یہ غیر انسانی نباتاتی حرکتیں ہیں کیونکہ ان حرکتوں میں نباتات شامل ہیں اسی طرح بھوک کے وقت کھانا کھانا ۔ پیاس کے وقت پانی پینا ۔ یہ غیر انسانی

حیوانی فعل ہیں۔ کیونکہ حیوانات میں یہ افعال پائے جاتے ہیں۔ حیوان ان فعلوں میں شریک ہیں۔ بیٹھنا۔ لیٹنا۔ یہ جماداتی فعل ہیں۔ کیونکہ یہ خاصہ جمادات کا ہے کہ وہ ایک جگہ ایک مکان میں ایک حیز میں ساکن رہتے ہیں تو انسان میں تینوں فعل موجود ہیں اور یہ تینوں غیر انسانی ہیں۔ انسانی فعل وہ ہوگا جو صرف انسان میں ہو اور کسی میں نہ ہو۔ انسان کی جب بحث ہوگی تو انسانی خصوصیات کے اعتبار سے گفتگو ہوگی غیر انسانی خصوصیات سے گفتگو نہیں ہوگی۔ بھوک کے وقت کھالینا۔ پیاس کے وقت پی لینا۔ یا کسی مکان میں قائم ہوجانا یا نمو کا ہونا۔ ان میں سے کسی سے گفتگو نہیں ہوگی۔ اب بھوک لگی ہوئی ہے کھانا موجود ہے۔ اس کو نہ کھانا یہ فعل انسانی ہے۔ یہ کھانے کی ضد ہے۔ یہ فعل حیوانی نہیں ہے۔

انسان جو فعل کرتا ہے۔ اس کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ وہ اس فعل کا حکم کرتا ہے۔ بھوک کا حکم ہوتا ہے۔ کھانا کھا۔ پیاس حکم دیتی ہے پانی پی۔ انسان میں ایک قوتِ طلب ہوتی ہے۔ جو مناسب طبع چیزوں کو حاصل کرتی ہے۔ اس کا نام شہوت ہے۔

ایک قوت وہ ہوتی ہے جو ان چیزوں کے حصول میں رکاوٹیں ہوں۔ ان کو دفع کرتی ہے اس کا نام غضب ہے۔

اور شہوت اور غضب کے مجموعہ کا نام نفس ہے۔ یہ اصطلاح ہے۔ کسی لغت میں یہ معنی نہیں ملیں گے۔

تیسری قوت عقل کی ہے۔ جو ان میں تمیز کرتی ہے۔ شہوت غضب اور عقل کا حکم ماننے پر انسان مجبور ہے۔ شہوت اور غضب کے حکم کو ماننے کے لئے جس طرح جانور مجبور ہے۔ اسی طرح انسان بھی مجبور ہے کہ یہ بھی حیوان ہے اور عقل کا حکم بھی جبری ہے۔ اس کے خلاف بھی نہیں کرسکتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ یہ

عقل کا حکم ہے۔ اس کے خلاف کوئی بول نہیں سکتا۔

شہوت، غضب اور عقل کے احکام ماننے پر مجبور ہے۔ اور انسان بے مختار تو معلوم ہوا کہ اس کے عمل میں یہ تینوں چیزیں حائل نہیں ہو سکیں۔ شہوت غضب اور عقل کے احکام کے خلاف کر نہیں سکتا۔ اور خلاف کی قدرت موجود ہے تو معلوم ہوا کہ انسانی افعال کے حاکم یہ نہیں ہوں گے۔ انسانی افعال کا حاکم وہ ہوگا جس کا حکم چاہے مانے چاہے نہ مانے تو وہ لازماً ان کے علاوہ ہوگا یعنی انسان سے باہر ہوگا۔ اور انسان سے باہر کی ہر شئے اس سے گھٹیا ہے کیونکہ یہ مخلوقات میں سب سے فائق ہے تو کائنات میں سے کسی کا حکم اس پر نہیں چلے گا۔ تو ضرور اس کا حاکم کائنات سے باہر کوئی ہے اور وہ اس کا خالق ہے وہی اس کا حاکم ہوگا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جو پیدا کرے گا وہی حکم دے گا۔ کیونکہ پیدائش پہلے حکم سے ہوئی ہے اس کا نام حکم تکوینی ہے۔ حکم ہوتے ہی وہ ناپید تھا۔ پیدا ہوگیا۔ اب دوسرا حکم ہوا کہ باقی رہ۔ اسی کا نام بقا ہے۔ اب جو یہ بقا کا حکم ہے۔ یہ تکوینی ہو نہیں سکتا ورنہ خلاف پر قدرت نہ ہوتی۔ مگر خلاف پر قدرت ہے تو یہ حکم تکلیفی ہوگا کہ یہ کر یہ نہ کر تو معلوم ہوا کہ جو پیدا کرے گا وہی حکم بھی دے گا تو لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی آمر اور حاکم نہیں ہے سوائے خالق کائنات کے۔ تیرا رب حاکم ہے ہر فعل اس کے حکم سے کرنا ہوگا۔ اور جیسا کہ مولوی لوگ بتاتے ہیں کہ اللہ کو ایک مانو۔ چلو مان لیا کیا فائدہ ہوا۔ ایک نہیں ہے کیا جگڑا۔ بالکل کوئی ہے ہی نہیں کیا نقصان ہوا۔ نہیں بلکہ وہ حاکم ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میرا کہنا نہیں مانا تو مار ڈالوں گا تو لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ بس میں ہی ہوں اس لائق کہ میرا حکم مانو۔ مجھ ہی پر نثار ہو اور کوئی اس لائق سوائے میرے نہیں ہے کہ جس کا تم حکم مانو اور اس پہ نثار ہو۔ صرف اللہ ہی حاکم ہے۔ کوئی حاکم نہیں ہے۔ آپ کوئی حرکت کریں تو اس سے

پوچھتے وہ اس کو چاہتا ہے یا نہیں چاہتا۔ اگر چاہتا ہے تو واجب ہوگئی، نہیں چاہتا تو حرام ہوگئی۔ زیادہ چاہتا ہے تو مندوب ہوگئی۔ کم چاہتا ہے تو مکروہ تحریمی ہوگئی اگر یوں ہی چھوڑ دیا تو مباح ہوگئی بس اسی کا نام شریعت ہے۔

یہاں بھی سیٹھ بیٹھا ہے اور کام دیکھ رہا ہے۔ کچھ نہیں کہتا تو مزدور کتنا خوش ہوتا ہے کہ آج تو مزدوری کے علاوہ بھی سیٹھ سے کچھ اور لے لوں گا اور اگر وہ جھنجھلا رہا ہے تو ڈر رہے گا کہ پتہ نہیں غلطی ہوگئی۔ شام کو مزدوری ملتی بھی ہے یا نہیں

ایمان

ایمان کیا شے ہے۔ مقصد رسولؐ پر ایمان لانا ہے۔ اسکی تصدیق کرنا ہے وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ہم نے نبیؐ کو اپنے حکم سے مطاع بنایا ہے اور تمام قوم کو مطیع بنایا ہے (نساء - ۶۴)۔ ساری قوم اسکی فرمانبرداری کرے گی مقصد رسولؐ بھیجنے کا صرف یہ ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (نساء - ۸۰) اللہ کی اطاعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ رسولؐ کی اطاعت ہو۔ اس نے کہا کہ میں اپنا آدمی بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے پاس آرہا ہے اس کے پیچھے پیچھے چلے آؤ تم بھی میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔ اگر تم ہٹے تو میرے پاس نہیں پہنچ سکو گے۔ سارے عالم میں یہ شہرت ہوگئی ہے اور سب علماء یہی کہتے ہیں کہ اسلام توحید کا علمبردار ہے۔ یہ صحافیوں کے الفاظ ہیں اس کو وہی سمجھتے ہیں۔ بات ایسی ہونی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ عقل کا آدمی اور کم سے کم عقل کا آدمی سب سمجھ لیں۔ سب سے زیادہ عقل نبی میں ہوتی ہے۔ نبوت سے قبل وہ تمام عالم کے عقلاء سے زیادہ عاقل ہوتا ہے۔ پھر اس کو نبوت ملتی ہے۔ فلسفہ اور دلیل یہ سب فرضی چیزیں ہیں۔ اس کی مثال عینک کی ہے کہ اگر نظر کمزور ہوگی تو عینک لگائی جائے گی۔ قوی نظر تو خود صاف دیکھتی ہے۔ اس کو عینک کی ضرورت نہیں اسی طرح جب عقل کی نظر کمزور ہو جاتی

ہے تو دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قوی عقل تو خود ہی صحیح بات سمجھ لیتی ہے۔ نبیؐ کو دلیل کی ضرورت نہیں وہ تو سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ ایمان تصدیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہیں۔ تصدیق کے یہ معنی ہیں کہ اُن کو اللہ پاک نے تمام عالم کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ اس تصدیق کا نام ایمان ہے۔ تم یہی تو کہتے ہو کہ صاحب ایمان جنت میں لے جائے گا تو اس کے نیچے کی جتنی چیزیں ہیں کل کی کل ملکر بھی جنت میں نہیں لے جائیں گی۔ اگر اس تصدیق کو نکال دیا جائے تو تمام کمالات عقلی علمی اور اعتقادی جمع ہو جائیں تو سب مل کر بھی جنت میں نہیں لے جائیں گے بلکہ اس کا ٹھکانا ابدی جہنم ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ اصل الاصول تصدیق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ اسلام کے اصول جتنے ہیں یہ سب کو باندھے ہوئے ہے اگر یہ نہ ہو تو تیلی تیلی الگ ہو جائے گی۔ توحید کہاں رہی اور اگر توحید مفید ہوتی تو ہر جگہ مفید ہوتی۔ مگر آسمانی مذاہب میں اور براہمہ میں توحید اسی طرح موجود ہے جیسی اسلام میں مگر وہ مفید نہیں ہے وہ سب جہنمی ہیں۔ اس وقت عیسیٰؑ کی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی نبی کی اطاعت کرے گا تو یہ کفر ہوگا۔ ہر نبی نے یہی فرمایا ہے کہ خدا ایک ہے اور ان کا فرمانا حق ہے لیکن اس وقت کوئی اگر یہ کہے کہ میں محمدؐ کے علاوہ کسی اور نبی کے کہنے سے ایمان لایا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہوں تو یہ کفر ہی رہے گا۔ اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے کہنے سے مانے گا کہ خدا ایک ہے تو اب یہ ایمان ہوگا۔ تو ایمان رجوع توحید کی طرف نہ ہوا بلکہ فرمان نبیؐ کی طرف ہوا۔ تو اب ایمان کی کیا تعریف ہوئی۔ خاتم النبیینؐ کی تصدیق۔ اس ضمن میں اور جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ نظری ہوں یا عملی ہوں اور جو متواتر قطعی آپ تک پہنچ گئیں بالکل اسی طرح جس طرح نبی کا ہونا پہنچا ہے۔ اگر آپ اس کی تکذیب کریں گے۔ تو یہ تکذیب خود تو کفر نہیں ہوگی لیکن چونکہ آگے جا کر اس سے نبی کی تکذیب ہوتی ہے اس لئے یہ کفر ہے۔ یہ راز کی بات ہے۔ یہ نہ قیامت کا اقرار ایمان ہے نہ اس کا

انکار کفر ہے۔ لیکن چونکہ یہ بات قطعی طور پر ہم تک پہنچ گئی کہ نبیؐ نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت آئے گی۔ اس بنا پر اس کا انکار کفر ہوگا۔ کفر ضد ہے ایمان کی اور ایمان نام ہے تصدیق نبیؐ کا۔ تو کفر نام ہوا تکذیب نبی کا۔ یہ تکذیب براہ راست ہو یا بالواسطہ سب کفر ہی ہوگی۔ تو بالواسطہ تکذیب جو ہے وہ کفر نہیں ہے بلکہ موجب کفر ہے۔ انکار قیامت اگر کفر ہوگا تو اس کی ضد یعنی تصدیق قیامت ایمان ہونی چاہیئے اور یہ تمام عیسائی یہودی وغیرہ میں موجود ہے مگر وہ بالاتفاق کافر ہیں تو معلوم ہوگیا کہ تصدیق قیامت بنفسہٖ ایمان نہیں ہے۔ بلکہ چونکہ فرمان نبیؐ ہے۔ اس وجہ سے جزو ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہدے کہ میں نبیؐ کی تصدیق کرتا ہوں تو وہ قطعی مومن ہے اب اگر اس کی تحریر میں کلمات کفر کے ملیں تو ان کا اعتبار نہیں ہوگا۔ زبان کا اعتبار ہوگا۔ تقریر اصل ہے تحریر فرع ہے تو اصل معتبر ہوگی۔ فرع غیر معتبر ہوگی۔ عقلی اعتبار سے بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک شخص ہے اس کی گویائی۔ بینائی سماعت۔ ادراک سب ساقط ہوگئیں لیکن سانس جاری ہے تو اس کو زندہ کہا جائے گا۔ اسی طرح تمام خرابیاں موجود ہوں اگر تصدیق نبیؐ کرتا ہے تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ وہ مومن ہی ہے ان الذین اٰمنوا جو لوگ ایمان لائے اللہ پر۔ اللہ پاک پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی حکومت کو تسلیم کرلیا یعنی اللہ پاک کے آمر اور ناہی ہونے کو تسلیم کرلیا۔ ہمارا ہر کرنا اور نہ کرنا، ہر فعل اور ترک اس کے حکم اور ممانعت کے تابع ہے۔ زبان علامت ہے قلب کی۔ اس وجہ سے اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے ورنہ اصل چیز تو دل ہے۔

وعملوا الصٰلحٰت واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ۔ یہاں ایک دقیقہ ہے جس کو بڑا بڑا عالم نہیں سمجھتا۔ انہوں نے نیک کام کیے اور نماز پڑھی اور زکوٰۃ دی تو نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا بھی تو نیک کام ہے۔ پہلے عام لفظ استعمال کیا پھر خاص۔ تو یہ جائز تو ہے لیکن غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں کیا۔ بڑی باریک بات ہے یہ تمام کائنات ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہے۔ اللہ پاک خالص وجود ہے اور اس کی ضد عدم محال

ہے اور یہ کائنات وجود و عدم دونوں کی مساوات ہے ہونے نہ ہونے کے درمیان کی چیز ہے اسی کو امکان کہتے ہیں یہ مخلوق کی صفت ہے اب کیا کرنا ہے کرنا یہ ہے کہ یہ جتنی بھی کائنات ہے اور اس میں جتنے افعال ہیں وہ سب ممکن ہیں۔ ان میں ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے انڈے میں مرغ بننے کی صلاحیت ہے تو انڈا ضائع نہ ہونے پائے اس کا مرغ بننا چاہیئے یعنی صلاحیت کو فعلیت میں لے آنا چاہیئے۔ تو عمل صالح کا مطلب یہی ہے کہ جو صلاحیتیں ہیں ان کو فعلیت میں لانا۔ گوشت میں بھوک کے رفع کرنے کی صلاحیت ہے تو اس کی اس صلاحیت کو فعلیت میں لے آؤ۔ اس کو کھاؤ ۔ سڑاؤ مت ۔ ایسا کیوں کرو۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہیں کرو گے تو فنا ہو جاؤ گے تو کائنات میں جو صلاحیتیں ہیں ان کو فعلیت میں لاؤ۔ اس طرح ان کی فعلیت تمہاری فعلیت سے ملکر تم ایک سے بن جاؤ گے۔ اب جو تم بن کر تیار ہو گئے تو ہمارے اوپر نثار ہو جاؤ عملوا الصالحات کائنات کی صلاحیتوں کو فعلیت میں لاکر بن کر تیار ہو جاؤ اور اقاموالصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ ۔ اپنی تمام جسمانی عبادتیں اور مالی عبادتوں کو میرے لئے وقف کردو اور قربان ہو جاؤ۔ پھر کیا ہوگا۔ اجرھم عند ربھم یہ نہیں کہا کہ اس کا اجر میرے ذمہ ہے بلکہ کہا کہ یہ رکھا ہے۔ ذمہ ہونے میں تو وقت ہے کب ملے کتنی دیر لگے۔ دے نہ دے۔ نہیں بلکہ کہا یہ رکھا ہے آؤ لے لو اب جو لپیٹ کر دیکھا کر رکھا ہے۔ تو اب کوئی ڈر نہیں رہا۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔ اگر مزدوری سامنے رکھی ہو تو مزدور کو خوف وملال ہوگا؟ نہیں ہوگا۔ جب وہ یہ دیکھ لے گا کہ مزدوری سامنے رکھی ہے اور بہت ہے۔ مزدور کو ۴ روپیہ ملنا ہے۔ اگر اس کو ۴۰ روپیہ دکھا دیئے جائیں کہ یہ تمہاری مزدوری رکھی ہے تو اب اس کی کیا کیفیت ہوگی وہ کیفیت مقصود ہے۔ قرآن بڑی زبردست اور قیمتی کتاب ہے۔ مسلمان نے اس کو چھوڑ دیا یہ کبھی نہیں پنپے گا۔ جب تک کہ قرآن کو پھر سے نہ پکڑلیں گے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے آمین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ
مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ
فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ
تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

(بقرہ ۲۷۸ تا ۲۸۱)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور بقایا سود چھوڑ دو۔ اگر تم مومن ہو۔
اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم
نے توبہ کر لی تو تمہارا راس المال تمہارے لئے ہے تم کسی پر ظلم نہ کرو (کہ زیادہ رقم لے لو) اور نہ
تم پر ظلم ہو کہ تمہاری اصل رقم ہی ڈوب جائے اور اگر قرضدار تنگی میں ہو تو اس کو فراخی تک
مہلت دو اور اگر تم ان کو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو علم ہو۔ اور اس دن سے ڈرو
جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر تم ہر شخص کے لئے ہے اس کی کمائی (اس کو اس کی کمائی دی جائیگی)
اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اے ایمان لانیوالو اللہ سے ڈرو۔ یہاں ڈرنے کے یہ معنی ہیں کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف مت کرو۔ یعنی ایک حصہ سود تم نے لے لیا اور ایک حصہ باقی ہے۔ تو باقی سود کو چھوڑ دو۔ اور جو تم لے چکے ہو۔ وہ اوپر کی آیت میں آچکا ہے۔ کہ وہ تم کو معاف ہے۔ واپس نہیں کرنا ہے۔ اور اگر پورا کا پورا باقی ہے تو اب کچھ مت لو۔ اگر تم مومن ہو۔ یہاں خطاب شروع ہی میں مومن سے ہے۔ پھر کہا اگر تم مومن ہو تو اس کا کیا مطلب ہے۔ مفسرین نے یہ فرمایا ہے۔ کہ یہ ایسا فقرہ ہے کہ جیسے بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے کہے کہ اگر تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ تو میری تعظیم کر اس کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ اس طرح یہاں یہ مطلب ہے کہ مومنوں کو سود نہیں لینا چاہیئے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر تم اس واقعے سے پہلے مومن ہو تو تم سود چھوڑ دو۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ اگر تم مومن کہلانا چاہتے ہو تو سود چھوڑ دو۔ چوتھی تفسیر یہ ہے کہ اے ایمان والو جو مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ اگر تم دل سے واقعی مومن ہو تو تم سود چھوڑ دو۔ یہی چار تفسیریں میرے علم میں آئی تھیں جو بیان کر دیں۔ تیسری تفسیر تو غلط ہے کیونکہ اگر کوئی مومن ہو اور سود لیتا ہے تو وہ مومن ہی کہلائے گا۔ اس کو کافر نہیں کہیں گے۔ چوتھی تفسیر بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی سود لینا نہیں چھوڑے گا تو اس کے دل میں ایمان نہیں ہو گا۔ اگر کوئی شخص ساری عمر بھی سود کھاتا رہے اور مسلمان ہو تو وہ مومن ہی رہے گا۔ اسی طرح پہلی دونوں تفسیریں بھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ سوال تو یہ ہے۔ کہ خطاب مومنوں سے ہے۔ تو جب ان کو پہلے مومن تسلیم کر لیا پھر کہا کہ اگر تم مومن ہو تو گویا ان کے ایمان میں شک ہو گیا۔ سود لینے نہ لینے سے تو کوئی کافر یا مومن نہیں ہوتا مومن

تو وہ ہے جو لا الہ الا اللہ کو تسلیم کرتا ہے۔ مومن دو قسم کے ہیں۔ ایک مومن فاسق ہے اور ایک مومن مطیع ہے تو یہاں مطلب یہ ہے کہ ان کنتم مومنین مطیعین

یاایھا الذین آمنوا سے مطلق مومن مراد ہے۔ اور ان کنتم مومنین سے مراد مومنین مطیعین ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اے مومنو میرا حکم سننے کے بعد اس کی اطاعت کرو۔ حکم کو بجا لاؤ۔ یہ کسی مفسر نے نہیں کہی بالکل نئی بات ہے وان طائفتان من المومنین اقتتلوا الذین اگر دو گروہ مومنین کے آپس میں قتل و غارت کریں (حجرات-۹) تو فاصلحوا بینھما ان کے درمیان صلح کرا دو۔ تو ایک دوسرے کو قتل کرنے والے مومنوں کو بھی اللہ پاک نے مومن ہی قرار دیا ہے۔ اس زمانے میں صحابیوں سے چوری بھی کرتے تھے۔ زنا بھی کرتے تھے۔ ان کو سزا بھی ملتی تھی۔ ان کے ہاتھ بھی کاٹے جاتے تھے اور ان کو رجم بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس درجہ کے مومن تھے کہ آج کل کے اولیاء اللہ بھی ان کے کفش پا کے برابر نہیں ہو سکتے۔ وہ مومن تھے مگر غیر مطیع تھے۔ تو آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ اگر تم فرمانبردار مومن ہو تو سود چھوڑ دو۔

حنفی مذہب تو یہ ہے کہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا نام ایمان ہے۔ اور شافعی اور دیگر ائمہ۔ اعمال صالحہ کو بھی ایمان میں شامل کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں جگہ جگہ عمل صالح کو مثلاً نماز کے لئے ایمان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ما کان اللہ لیضیع ایمانکم (بقرہ ۱۴۳) یہاں ایمان سے مراد نماز ہے۔ تو لفظ ایمان تصدیق اور عمل صالح دونوں معنوں میں آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کفر کے مقابلے کی جو چیز ہے اس کا جز

عمل صالح ہے۔ عمل صالح اس ایمان کا جز نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے "مومنین کاملین" بھی ہو سکتا تھا۔ مگر مطیعین کا لفظ استعمال کیا تاکہ اس دقت سے بچ جائیں مومنین مطیعین کی شان سے یہ بعید ہے کہ اللہ پاک کے کسی حکم کے خلاف کریں۔ اصل ایمان تو تصدیق ہی ہے باقی عقائد اور شرائع جتنے بھی ہیں ان کی ضمنی تصدیق ہوگی وہ اصل کا جز نہیں ہیں۔ بکتہ کی بات بتادوں جو شئے دائمی جنت کا موجب ہے اور دائمی عذاب سے بچالے وہ ایمان ہے۔ اور جو دائمی دوزخ کا موجب ہے اس کا نام کفر ہے۔ اور عمل صالح وہ ہے جو عارضی عذاب سے بچالے۔ کیونکہ وزن اعمال ہوگا۔ اگر عمل بد سے عمل صالح زیادہ ہوں گے تو اس کو عارضی عذاب بھی نہیں ہوگا فمن ثقلت موازینہٗ فاولٰئک ھم المفلحون (مومنون) فلاح ان لوگوں کیلئے ہے (۱۰۲)
جن کا پلڑا بھاری ہوگیا۔

فان لم تفعلوا تم نے ایسا نہیں کیا۔ یعنی سود ترک نہیں کیا۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو سود کو حلال جانتے ہیں وہ تو کافر ہیں یا تو ان کی طرف اشارہ ہے کہ حلال کہنے سے باز نہ آئے۔ یا سود کو حرام تو تسلیم کر لیا مگر سود لیتے رہے اور سود لینے سے باز نہیں آئے ان کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں اس میں آگئے۔ تو اگر تم باز نہیں آئے تو کیا ہوا۔ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہٖ تم اللہ اور رسولؐ سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ آگاہ ہو جاؤ۔ اگر مراد ان لوگوں سے ہے جو سود کو حلال ہی سمجھتے رہے تو ان سے تو جہاد ثابت ہوگیا اگر مراد ان لوگوں سے ہے جو حرام سمجھ کر کھاتے رہے تو ان کے لئے یہ سخت وعید ہے۔ دھمکی ہے۔ یا اس سے مراد واقعی لڑائی ہے۔ کہ اس کو گرفتار کیا جائے سزا دی جائے گی اور اس سے توبہ کرائی جائیگی

اور اگر جماعت ایسا کرتی ہے تو اس سے لڑائی کی جائے گی۔ اور اس کو دبایا جائے گا دان تبتم فلکم رؤس اموالکم اگر تم باز آ گئے تو اصل رقم تمہاری تمہارے لئے ہے لا تظلمون ولا تظلمون نہ تم ظلم اور زیادتی اور سختی کر کے ان سے سود لو اور نہ یہ کہ تم اپنی اصل رقم سے بھی محروم ہو جاؤ۔ وان کان ذو عسرۃ اگر ہے تنگی والا یعنی مفلس ہے۔ اگر ذا عسرۃ ہوتا تو یہ ضمیر سود کے قرضدار کی طرف پھرتی اگر ذو عسرۃ ہے اس لئے اس کا مطلب عام ہے۔ کوئی بھی قرضدار ہو یہ علمی بات ہے۔ کسی بھی لین دین کا قرضدار ہو فنظرہ اس کو ڈھیل دو یہ اللہ پاک کا حکم ہے اور تمام ائمہ کا یہی مذہب ہے۔

ایک لغوی بات اور بھی ہے۔ یہاں اسے بھی سمجھ لیں، 'کان' کو عام طور پر سب اہل زبان کان ناقصہ کہتے ہیں جیسے کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (احزاب - ۴۰) اور جیسا کہ یہاں ہے۔ کان زید دوسرا لفظ نہیں آتا اس کو کان ناقصہ کہتے ہیں۔ ایک عجیب واقعہ ہے۔ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ میں خازن میں مقیم تھا اس وقت وہاں بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ کان کے معنی ہے زمانہ ماضی میں کان اللہ علیما کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک زمانہ ماضی میں عالم تھا اور فعل وہ ہے جو مستقل معنی رکھتا ہو۔ اور اس میں زمانہ بھی پایا جائے جو مستقل معنی رکھتا ہو وہ اسم ہے اور معنی غیر مستقل ہوں اور زمانہ بھی نہ پایا جائے وہ حرف ہے۔ تو جب کان فعل ماضی کی طرف دلالت کر رہا ہے تو فعل تام ہوا ناقصہ ہوا اگر کان فعل ہے تو تام ہے اور اگر ناقص ہے تو فعل نہیں ہے اور تم اس کو فعل ناقصہ کہتے ہو تو وہ حیران ہو گئے اور کوئی جواب شافی نہ دے سکے پھر مجھے خیال ہوا کہ کَانَ کے دونوں جگہ معنی "واقع ہونے" کے ہیں۔ ایک جگہ تو شے واقع ہوئی

اور دوسری جگہ واقعہ تو واقع نہیں ہوا بلکہ اتصاف ایک شے کا دوسری شے سے واقع ہوا۔ تو جہاں ذات واقع ہوئی اس کو تو تامہ کہتے ہیں اور جہاں صفت موصوف کا متصف ہونا واقع ہوا اس کو ناقصہ کہتے ہیں۔ بہت باریک بات ہے جو انہوں نے نکالی ہے۔ مگر غلط نکل آئی کیونکہ اگر کان کا فاعل اتصاف کو قرار دیا جائے گا۔ تو کان مسند ہو گا۔ اور اتصاف مسند الیہ ہو گا۔ اور اللہ اور علیم نہ مسند ہوں گے نہ مسند الیہ۔ یہاں تو اللہ اور علم دو چیزیں ان میں ہیں۔ اللہ مسند الیہ ہے اور علم مسند ہے۔ تو یہ تحقیق غلط ہو گئی۔ اب صحیح جواب اس کا کیا ہے کہ کان تنہا مسند نہیں ہے۔ بلکہ کان علیما سے مل کر مسند ہوا۔ چونکہ کان ایک اور لفظ کو لیکر مسند ہوا اس لئے ناقصہ کہلایا۔ زمانہ ماضی میں اللہ کے لئے علیم ہوتے ہوئے ثابت ہے۔ اب معنی ٹھیک ہو گئے۔ کان مع علیما کے مل کر اللہ کی خبر واقع ہو رہا ہے۔ اور اس آیت میں یہاں کان ذوعسرۃ کی طرف تنہا منسوب ہو گیا۔ اس لئے یہ کان تامہ کہلایا۔ ذوعسرۃ سے مطلق سود والا قرضدار مقروض ضروری نہیں بلکہ کسی قسم کا قرضہ ہو اور قرضدار ذوعسرۃ واقع ہو تو اس کو فنظرۃ الی میسرۃ نظر حتی تک اس کو مہلت دو وان تصدقوا خیرالکم اور اگر تم صدقہ کر دو چھوڑ دو معاف کر دو وہ رقم تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

ان کنتم تعلمون اگر تم کو یہ علم ہو جائے کہ معاف کر دینے کا عظیم الشان ثواب ہو گا۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جان لینے کے بعد کہ معاف کر دینا تمہارے حق میں بہتر ہے تو اس کے بعد تم اس پر عمل کر لو۔ یہاں علم بول کر عمل مراد لینا ثابت ہو گا اور اگر اس کا علم ہی مطلب ہو گا۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ کاش تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم کو معاف کرنے کا کتنا بڑا ثواب ہو گا۔

واتقو یوماً ترجعون فیہ الی اللہ اس دن سے ڈرو کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان ایک وقت ماں کے پیٹ میں تھا اس وقت اللہ پاک براہ راست اس کا کفیل تھا جب پیدا ہوگیا اور زندہ رہا تو ماں باپ اور دوسرے لوگ اس کے کفیل ہو گئے اب مرنے کے بعد پھر تنہا وہی کفیل ہوگا۔ تو کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جب میں ہی پھر تمہارا کفیل ہوں گا۔

ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون جب تم اس کی طرف لوٹو گے تو وہ کیا کرے گا۔ وہ جو کچھ تم نے کمایا ہے وہ پورا پورا تم کو دیدے گا۔ یعنی اس کی جزا یا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کو اس کی پوری پوری کمائی دیدی جائے گی۔ ایک تو ہے کمانا اور ایک ہے کمائی۔ تو کمائی پوری مل جائے گی۔ یا تو جزا اس میں محذوف نکالی جائے گی۔ یا پھر وہی لفظ رہیں گے۔

اب کسب کیا چیز ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن شریف سے کسب کا لفظ اختراع کیا ہے۔ قدر و جبر کی مشکل سے بچنے کے لئے قرآن سے یہ لفظ اہل سنت نے سیکھا کہ بندہ کا سب ہے۔

کسب کیا ہے؟ ابوالحسن اشعریؒ یہ فرماتے ہیں کہ بندہ کو فعل کرنے کا ایک وہم ہوجاتا ہے۔ باقی فعل خدا ہی پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام شافعی مذہب کے ائمہ کا قول ہے۔ اور حنفی مذہب کے ائمہ کے کئی قول ہیں۔ یہ بھی کسب کے ہی قائل ہیں۔

ابو علی جبائیؒ استاد ہے امام ابوالحسن اشعری کا اور ابو علی کا بیٹا ابوہاشم تھا۔ ابو علی جبائی معتزلہ تھا۔ امام اشعری کو ان سے اختلاف ہوا اور انہوں نے الگ مذہب اختیار کیا اور اس کے قوانین مدون کئے۔ ابوہاشم اپنے باپ کے مذہب معتزلہ پر ہی معتزلی رہا۔ یہ دونوں باپ بیٹے بہت بڑے رئیس ہیں۔ ابو علی کے

فرقہ کا نام جبائیہ اور ابوہاشم کے فرقہ کا نام بہشمیہ ہے۔ ایک لفظ ابوہاشم نے اختراع کیا ہے 'حال'۔ ایک تو ایسی شے ہے جس پر اثر مرتب ہو۔ اس کو 'وجود' کہتے ہیں۔ آگ موجود ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پر گرمی کا اثر مرتب ہے سورج موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر روشنی کا اثر مرتب ہے۔ تو مرتب اثر کا نام وجود ہے اور یہ اصلی وجود ہے۔ اور ایک وجود عارضی ہے۔ وہ ایسی شے ہے کہ اس پر اثر مرتب نہ ہو۔ اس کا نام 'حال' ہے۔ وہ کیا شے ہے۔ وہ نہ موجود ہے نہ معدوم ہے بیچ میں ہے۔ یہ اختراع تو کیا تھا۔ جبائی اور ابوہاشم نے اور سنیوں نے اس کو لے لیا کہ کسب 'حال' ہے۔ اور حال کو پیدا کر دینا خدا کی خالقیت کے خلاف نہیں ہے۔ وجود کے پیدا کرنے میں تو شرک ہے لیکن حال کا پیدا کرنا شرک نہیں ہے کوشش ان کی یہ ہے کہ بندہ کو مجبور محض ہونے سے بچالیں اور شرک بھی نہ ہو۔ یہ لفظ انہوں نے اس سے لے لیا۔ وہ تو بندے کی مجبوری کا قائل ہی نہیں ہے۔ وہ تو بندہ کو مختار مانتا ہے۔ کہ بندہ اپنے ارادے سے جو چاہے سو کرے۔ سوالٓ نے کہا ہے مگر سنیوں نے وہ لفظ وہاں سے لے لیا۔ اور کسب کو 'حال' بنایا۔ معتزلی اس پر اعتراض نہیں کر سکا کہ یہ بات سنیوں نے کتنی غلط کہی ہے۔ کہ اس کو "حال" کہا ہے۔ اس لئے کہ "حال" تو کوئی شے ہے ہی نہیں۔ کیونکہ وجود و عدم میں کوئی مسافت نہیں ہے۔ کہ ان دونوں کے درمیان کوئی شے ہو۔ 'حال' یا کوئی اور شے اس وقت حائل ہو سکتی ہے جب درمیان میں کوئی مسافت ہو۔ بالکل بے ہودہ بات ہے۔ حال کوئی شے نہیں ہے۔ اگر کوئی مسافت وجود و عدم کے درمیان ہوگی۔ تو اجتماع النقیضین باطل ہو جائے گا۔ اجتماع النقیضین ایسی حقیقت ہے کہ جاہل بھی اس کو فطری طور پر جانتا ہے۔ مردہ کے پلنگ کے نیچے پانی کے کٹورے رکھ دیئے جاتے

ہیں تاکہ چیونٹی جسم کو نہ لگ جائے۔ زندہ کے جسم کو چیونٹی نہیں لگتی مردے کے جسم کو لگ جاتی ہے دونوں میں فرق کرتی ہے۔ اگر حال درمیان میں کوئی شے ہوگی تو زندگی ختم ہونے کے بعد مردہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر "ہوگا" تو "نہ ہونا" غلط ہو جائے گا۔ اور اگر "نہیں ہوگا" تو "ہونا" غلط ہو جائے گا۔

دو چیزوں کا اس طرح ہونا کہ ان کا آن واحد میں مکان واحد میں حیثیت واحدہ سے ایک جگہ جمع ہونا ناممکن ہو تو ان دو چیزوں کو ایک دوسرے کا متقابل کہتے ہیں اور ان کے درمیان جو نسبت ہے۔ اس کو تقابل کہتے ہیں یہ فلسفیوں کی اصطلاح ہے۔

اب یہ دو متقابل چیزیں یا تو عدمی ہیں یا دونوں وجودی ہیں یا ایک وجودی اور ایک عدمی ہے۔

اگر دونوں چیزیں عدمی ہوں تو ان میں تقابل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو محض احتمال عقلی ہے۔

اگر دونوں وجودی ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو ایک کے تصور کو دوسرے کا تصور لازم ہوگا یا لازم نہیں ہوگا۔ اگر لازم نہیں ہوگا تو ان متغائرین کو متغائر تضاد کہتے ہیں جیسے کالا اور سفید کہ ایک کے تصور کو دوسرے کا تصور لازم نہیں ہے۔

اگر لازم ہوگا جیسے باپ اور بیٹا دونوں مقابلے کی چیزیں ہیں۔ اور جب بیٹے کی بات ہوگی۔ باپ کا تصور ضرور آئے گا۔ اس کو تقابلی تضاد کہتے ہیں

اگر ایک وجودی اور ایک عدمی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو محل عدم میں وجود کی قابلیت ہوگی یا نہیں ہوگی جیسے اندھا پن اور بینا پن: اندھا پن

عدمی ہے۔ بیناپن وجودی ہے۔ ان کا محل آنکھ ہے اس میں وجود کی قابلیت ہے، یعنی بینائی کی۔ تو اس تقابل کا نام تقابل عدم ہے۔ اور اگر محل وقوع میں وجود کی قابلیت نہ ہو تو اس کو تقابل تناقض کہتے ہیں۔ حیات موت امرِ دہ میں حیات کی قابلیت نہیں ہے۔ یہ جو تقابل ہے اس میں مسافت نہیں ہے۔ متغائرین میں باقی جو متقابلین ہیں ان میں مسافت ہو سکتی ہے۔ کالا اور سفید ان کے درمیان سلیٹی رنگ ہو سکتا ہے۔ پتھر ہے نہ وہ اندھا ہے نہ بینا ہے۔ درمیان کی چیز ہے تو وجود و عدم کے درمیان کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ ابو ہاشم کا مذہب بالکل غلط ہے انہوں نے یہ لفظ 'حال' اس سے لے لیا۔ تو میں نے اپنے استاد اسحاق صاحب سے کہا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بالکل غلط بات ہے۔ اول تو 'حال' کوئی شے ہی نہیں ہے اور اگر ثابت بھی ہو جائے تو حال اس شے کو کہتے ہیں۔ جس پر اثر مرتب ہو اور بندہ کا عمل تو وہ شے ہے کہ جس پر دائمی جنت اور دائمی دوزخ اس پر مرتب ہے۔ یہ اتنا بڑا عظیم الشان اثر ہے۔ کہ اتنا بڑا کوئی اور اثر نہیں ہے جو مرتب ہو۔ تو انہوں نے پیچھا چھڑانے کے لئے جو 'حال' کو استعمال کیا اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔

اب بحر العلوم وغیرہ جو اس عقیدہ کے ہیں انہوں نے کہا اور اس کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف بھی منسوب کر دیا معلوم نہیں انہوں نے کہا بھی یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھئی یوں نہ کہو بلکہ اس کو یوں کہو کہ بندہ کے افعال کو تو خدا پیدا کرتا ہے۔ اور بندہ قصد مصمم کرتا ہے۔ سزا و جزا اس کے قصد مصمم پر مرتب ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ کیونکہ یہ بتاؤ قصد مصمم کو فعل میں کچھ دخل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو بندہ اپنے فعل کا خالق ہو گیا۔ اور ایک شرک سے بچنے کیلئے لاکھوں

شرک کے قائل ہو گئے اور اگر دخل نہیں ہے تو قصد مصمم بے کار شے ہو گئی۔
یہ کسب کے معنی بیان کئے ہیں جو میں نے آپ کو سب بتا دیئے سب غلط ہیں
آخر میں سنیوں میں ایک عالم ہے۔ محب اللہ بہاری۔ اس نے منطق کی بڑی مستند دو
کتابیں لکھی ہیں۔ ان کو سب مانتے ہیں۔ اور درس نظامی میں یہ شامل ہیں۔
مسلم الثبوت اصول فقہ کی کتاب ہے اور ایک مسلم العلوم ہے۔ یہ منطق کی کتاب ہے
قاضی وغیرہ انہیں کی شرحیں ہیں۔ اس نے کہا کہ میری رائے میں انسان قصد دو
قسم کے کرتا ہے۔ ایک تو جزئی ہوتا ہے اور ایک کلی ہوتا ہے۔ دو قسم کے ادراکات
ہیں۔ ادراکات کلی تو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ اور ادراکات جزئی خود بندہ پیدا
کرتا ہے۔ یہ بات بھی بالکل غلط ہے اول تو یہ بات اس کی ہے نہیں۔ یہ ارسطو
نے کہی ہے۔ بہرحال کسی نے کہی ہو۔ جزئی اعمال کرنے کی اگر اس کو پوری قدرت ہے
تو یہ اپنے فعل کا خالق ہو گیا اور اگر فعل کی طاقت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ ہی پیدا
کر رہا ہے۔ تو امام غزالیؒ نے جو کسب کو کہا کہ ہم نے کتاب اللہ سے یہ لفظ لیا ہے۔
وہ اپنا دل بہلا لیا۔ وہ کسب وسب کوئی شے نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ بولو
کسب موجود ہے یا معدوم ہے۔ اگر معدوم ہے تو بندہ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اور
اگر موجود ہے تو بندہ ایک شے کا ضرور خالق ہو گیا۔ کسب کے معنی خواہ وہ بندہ
نے کیا ہو یا خدا نے پیدا کیا ہو۔ ہر صورت میں اس کے معنی عمل کے ہیں اور اس
کے عمل کا پورا پورا بدلہ بندہ کو ملے گا۔ پھر انہوں نے معتزلہ سے یہ کہا کہ بندہ کو قدرت
جو دی ہے وہ برابر دی ہے۔ یا کم وبیش دی ہے۔ اگر برابر دی ہے تو کیا
وجہ کہ ایک مومن ایک فاسق اور ایک کافر ہو گیا۔ اور اگر کم وبیش دی ہے تو جب
کافر سے پوچھا جائے گا۔ کہ تو نے کفر کیوں کیا تو وہ کہدے گا کہ تو نے مجھے قدرت

کم دی تھی۔ اس لئے میں ایمان نہیں لایا۔ تو خدا بند ہو جائے گا۔ یہ اعتراض معتزلہ پر سنیوں نے کیا۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں ناکہ بندہ اپنے فعل پر قادر ہے۔ میرے استاد نے جب مجھے یہ بتایا تو میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو بالکل ہی لغو ہے۔ سنی یہ کہتے ہیں کہ بندہ میں فعل خدا پیدا کرتا ہے تو جب خدا اس سے پوچھے گا کہ تو نے کفر کیوں کیا تو وہ یہ کہدے گا۔ تو نے مجھ میں کفر پیدا کر دیا۔ میں کیا کرتا میں تو مجبور تھا۔ اگر وہاں اللہ بند ہو جائے گا تو یہاں بدرجہ اولی بند ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ دونوں فریق غلطی پر ہیں اور غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ایک لائن کی چیز کو دوسری لائن میں شامل کر دیا۔ اللہ کا کلام حق ہے۔ بالکل عقل کے مطابق ہے جب موقع آئے گا میں سمجھا دوں گا۔ بالکل اس طرح آپ کے سمجھ میں آجائے گا۔ جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

وھم لا یظلمون سے مطلب یہاں یہ ہے پوری پوری جزا مل جائے گی۔ پورا پورا دنیا بھی معترض بحث رہا ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے کہا وانا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص خدا نے یہ کہا ہے کہ پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اور یہ (ہود - ۱۰۹)
بھی کہا ہے کہ لا انتہا بدلہ دیں گے۔ تو جب زندگی اور عمل محدود ہیں تو ان کی جزا بھی جب پوری پوری ملے گی تو ایک حد پر جا کر ختم ہو جائے گی تو لا انتہا کہاں رہی۔ اس کا جواب وہ قاعدہ میں نہیں دے سکے۔ حدود کلام سے جب آدمی ناواقف ہوتا ہے تو اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ دیکھئے پورا کرنا ایک تو ہوتا ہے مقدار کا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ مقدار پوری ہوئی اور وہ ختم ہو گیا۔ دس گز کپڑا لینا ہے گز گز ناپا دس تک پورا ہو گیا۔ اور ایک ہوتا ہے۔ وعدہ

کا پورا کرنا اس کے معنی یہ ہیں کہ وعدہ کے مطابق ہو. تو وعدہ ہے لاانتہا کا تو وعدہ کے مطابق لاانتہا ملے گا۔ یہی معنی ہیں۔ پورا پورا دینے کے کہ برابر ملتا رہے کہیں ختم نہ ہو۔ ظلم کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کی سزا اگر پانچ کوڑے ہیں تو سو کوڑے لگائے جائیں تو یہ ظلم کہلائیگا۔ تو اس نے کہا کہ ظلم نہیں ہوگا۔ پانچ ہی کوڑے لگیں گے۔ سوا پانچ نہیں لگیں گے۔ اور نیکی کا جو بدلہ ہے وہ بڑھا کر ملے گا۔ کمی نہیں ہوگی۔

ظلم بھی سمجھ لیں کیسا ہے۔ جو ہمارے خیال میں ظلم ہے وہ ظلم نہیں ہے بلکہ ظلم وہ ہے جس کو اللہ پاک ظلم کہے۔ عقل کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنا حکم لگائے عقل مخلوق ہے۔ خالق مخلوق کو حکم دے گا۔ مخلوق کا یہ کام نہیں ہے کہ خالق کو حکم دے۔ ایک غفلت ہوئی ہے۔ حکماء اور متکلمین دونوں سے۔ غور کریں مصلحتیں کہاں ہوتی ہیں۔ یہ وہاں ہوتی ہیں جہاں محض مشیت فعل میں کافی نہیں ہوتی اگر آپ کو یہ خیال آئے کہ آپ امیر و کبیر ہو جائیں تو آپ کو وہ ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔ دکانداری کرنی ہوگی۔ فیکٹری لگانی ہوگی۔ جدوجہد کرنا ہوگی۔ تب کہیں امارت نصیب ہوگی تو اسباب و علل جہاں ہوں گے۔ وہاں اچھا برا۔ مصالح وغیرہ ہوں گے اور جہاں محض مشیت کام کرے گی کہ آپ کو خیال آیا کہ امیر کبیر بن جائیں اور آپ بن گئے تو یہاں نہ نیکی بدی ہوگی۔ نہ ظلم ہوگا نہ مصلحتیں ہوں گی۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تو جہاں نفس مشیت کافی ہے اسی کا نام تو خدا ہے۔ وہاں نہ کوئی مصلحت ہے نہ نیکی ہے نہ بدی ہے نہ ظلم ہے بلکہ جس کا وہ جو نام رکھدے بس وہ وہی ہے۔ کسی کا نام ظلم رکھدیا کسی کا انصاف کسی کا نیکی اور کسی کا نام بدی رکھدیا وہ سولہ آنے مختار ہے جو چاہے سو کہدے جو چاہے سو کردے۔ جو کہہ دے وہ ٹھیک اور جو کردے وہ عدل ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی
فَاکْتُبُوْہُ ؕ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ
اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ فَلْیَکْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْہِ
الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْہُ شَیْئًا ؕ فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ
عَلَیْہِ الْحَقُّ سَفِیْہًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ ہُوَ
فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّہٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْہِدُوْا شَہِیْدَیْنِ مِنْ
رِّجَالِکُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّہَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىہُمَا فَتُذَکِّرَ
اِحْدٰىہُمَا الْاُخْرٰی ؕ وَلَا یَاْبَ الشُّہَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا
تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَکْتُبُوْہُ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا اِلٰٓی اَجَلِہٖ ؕ ذٰلِکُمْ
اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاَقْوَمُ لِلشَّہَادَۃِ وَاَدْنٰٓی اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ
اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً تُدِیْرُوْنَہَا بَیْنَکُمْ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ
جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْہَا ؕ وَاَشْہِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَلَا یُضَآرَّ
کَاتِبٌ وَّلَا شَہِیْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّہٗ فُسُوْقٌۢ بِکُمْ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (بقرہ - ۲۸۲ - [illegible])

(ترجمہ) اے ایمان والو جب تم قرضہ کا لین دین کرو۔ ایک معین مدت کے لئے تو لکھو ایسا کرو۔ اور ایک کاتب کو چاہیئے کہ تمہارے درمیان ٹھیک ٹھیک لکھے۔ اور انکار نہ کرے اور لکھے جیسا کہ اللہ پاک نے اس کو تعلیم کیا ہے۔ اور لکھوائے وہ شخص جس پر حق ہے یعنی قرضدار۔ اور چاہیئے اس کو کہ ڈرے اپنے رب سے اور اس میں کوتاہی ذرا بھی نہ کرے۔ اگر قرضدار کم عقل۔ کمزور یا وہ لکھوانے کے قابل نہ ہو (گونگا ہو زبان نہ جانتا ہوں) تو چاہیئے کہ اس کا ولی ٹھیک ٹھیک لکھوائے (ولی۔ کارکن، قاضی، حاکم وکیل، وصی) اور دو شاہد گواہ بنا لو اپنوں میں سے یا جن پر تم کو اعتماد ہو۔ اگر دو مرد نہ ملیں پھر ایک مرد اور دو عورتیں لے آؤ جن کو تم پسند کرو۔ تاکہ اگر ایک ان میں سے بھولے تو دوسری اس کو یاد دلادے۔ اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ اور سستی نہ کریں مضمون کے لکھوانے میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور تعین وقت بھی لکھا جائے یہ اللہ کے نزدیک اقسط ہے۔ بہت زیادہ انصاف کے قریب ہے صحیح ہے۔

اب یہاں ایک بات ہے سمجھنے کی کہ یاد دلانا تو شہادت میں اثر رکھتا ہے۔ مگر بھول جانا اثر نہیں رکھتا۔ تو یہاں بھول جانا جو ہے وہ شہادت کی علت نہیں ہے بلکہ عورت کی کمزوری کی علت ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرد کی یادداشت قوی ہے عورت کی یادداشت کمزور ہے۔ یاد دلانا شہادت کے لئے ہے۔ کہ یاد دلانے سے شہادۃ مکمل ہو جائے گی۔ عورت کا بھول جانا دلیل اس بات کی ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کمزور ہے اور مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اس کے علاوہ اور جگہ بھی اللہ پاک نے اس کا ذکر فرمایا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اس مضمون کے سمجھنے میں عوام و علماء کو دھوکا ہوا ہے

اور اسی وجہ سے انہوں نے عورت کی نبوت اور اس کی امامت سے انکار کر دیا
ایک حدیث میں آیا ہے کہ عورتیں ناقص العقل اور ناقص دین ہیں۔

کل ناقصاۃ عقلٍ وناقصاۃ دین کے الفاظ ہیں ناقص عقل کے تو یہ معنی
ہیں کہ ان کی عقل کمزور ہے۔ ان کی گواہی آدھی رکھی اور ناقص دین کے معنی
ہیں کہ وہ مہینہ میں بیس اکیس دن تو طاہر رہتی ہیں اور باقی دنوں میں
عبادت روزہ نماز کے قابل نہیں رہتیں۔ اس حدیث اور قرآن کی آیات سے
انہوں نے استدلال کیا ہے۔ لیکن یہ استدلال غلط ہے۔ ان کو دھوکا لگ گیا
کہتا ہوں کہ جو نقصان ہے وہ دراصل نقصان جسمانی ہے۔ جسمانی طور پر عورت
مرد کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ مرد اس کے مقابلہ میں قوی ہوتا ہے۔ اس لئے
دنیا کے معاملات میں وہ زیادہ مفید اور زیادہ صحیح رہتا ہے۔ اور عورت گھر کے
انتظام میں زیادہ صحیح اور مفید ہوتی ہے۔

الرّجال قوّامون علی النسآء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض۔ (النساء - ۳۴) مردوں کا
عورتوں پر بڑا کنٹرول ہے کیونکہ ہم نے عورتوں پر مردوں کی فضلیت رکھی ہے
کل ناقصاۃ عقلٍ وناقصاۃ دین ۔ عورتیں ناقص عقل اور ناقص دین
ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک مرد عورت سے زیادہ افضل ہے
اللہ کے نزدیک افضل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ زیادہ انعامات کا مستحق ہے۔ تو
علماء یہ سمجھ گئے ہیں کہ مردوں کو زیادہ انعامات اور بلند مدارج ملنے چاہئیں۔
اور عورت کو وہ مناسب نہیں ملنے چاہئیں۔ اس بنا پر انہوں نے عورت کی نبوت
کا انکار کیا ہے۔ اور دلیل میں یہ حدیث اور آیات قرآنی لائے ہیں۔ میں کہتا
ہوں کہ جزیمہ بن ثابت انصاری کا ایک واقعہ ہے۔ کہ ایک قرض خواہ حضور اکرم

کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے ادا کر دیئے۔ اس نے گواہ طلب کیا تو خزیمہ انصاری نے فوراً کہا کہ میں شاہد ہوں۔ آپؐ نے ادا کر دیئے۔ قرض خواہ چلا گیا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ خزیمہ تم تو اس موقع پر موجود نہیں تھے۔ تم نے گواہی کیسے دیدی۔ خزیمہ نے عرض کیا کہ آپؐ ہم کو روزانہ عجیب غریب باتیں آسمان سے پرے کی سناتے ہیں۔ ہم سب کی تصدیق کرتے ہیں۔ آج آپؐ نے فرمایا کہ آپؐ نے قرضہ ادا کر دیا۔ میں نے اسکی بھی تصدیق کر دی۔ تو آپؐ نے فرمایا تیری شہادت دوہری۔ یعنی اگر خزیمہ شہادت دیں تو وہ کافی ہے۔ اور اگر حضرت ابوبکرؓ عمرؓ یا علیؓ شہادت دیں تو ان کو ایک شاہد اور لانا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شہادت ناقص اور غیر معتبر رہے گی۔ اس سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ شہادت کے ناقص ہونے سے شاہد کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح اس کے برعکس شہادت کے کامل ہونے سے شاہد کا کامل ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ خزیمہؓ کی شہادت کے کامل ہونے سے خود خزیمہؓ کا کامل ہونا لازم نہیں آیا حضرت ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ و علیؓ اور دیگر بہت سے صحابہ سے خزیمہؓ انصاری کا درجہ کم ہے۔ اسی طرح عورتوں کی ناقص شہادت سے عورتوں کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا۔

ولیس الذکر کالانثیٰ (عمران - ۳۵) مونث مذکر کی برابری کہاں کر سکتا ہے یعنی مذکر کو فضیلت ہے۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں لیکن ان کو سمجھنے میں بڑی بھول ہوئی ہے۔ جب حضرت مریم کو ان کی ماں نے جنا تو انہوں نے کہا اے پاک پروردگار میں نے تو منت مانی تھی کہ لڑکا ہو گا۔ تو اس کو تیری نذر کر دونگی لیکن تو نے مجھے لڑکی عنایت کی اب میری منت کا کیا ہو گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ

نے جواب دیا کہ لڑکا لڑکی کے برابر کہاں ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس کے متعلق فرمایا یامریم ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علی نساء العالمین ہمارا اگر لڑکا ہوتا تو اس درجہ کا کہاں ہوتا۔ فرمایا تو کیوں گھبراتی ہے۔ اگر لڑکا ہوتا تو اس لڑکی جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ حضرت والدہ مریم کا قول نہیں ہے۔ خدا کا قول ہے۔ ہر بڑے عالم سے بھول ہو جاتی ہے۔ صرف نبی سے بھول نہیں ہوتی۔ باقی ہر شخص سے بھول ہوگی۔ چھوٹا عالم زیادہ غلطی کرے گا۔ بڑا عالم کم غلطی کرے گا۔ غلطی سب سے ہوگی۔

آپ غور کریں کہ امہات المومنین اور حضرت فاطمہؓ مومنین سے افضل ہیں۔ امہات المومنین تمام مومنین کی مائیں ہیں۔ ان کا درجہ ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ وعلیؓ سے بڑا ہے۔ یہ ان کی مائیں ہیں۔ حالانکہ یہ کبھی ناقص دین تھیں۔ یہ کبھی پورے ماہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے تو وہ ناقص دین ہیں ان کی عبادت آدھی ہے مگر ان کی ایک دن کی عبادت بھی پورے ماہ کی عبادت کے برابر ہے۔ جیسے آج ایک شخص مسلمان ہوا اور ایک وقت کی نماز پڑھی اور مر گیا۔ تو وہ نمازی شمار ہوگا۔ گویا ساری عمر نماز پڑھی ومن یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحا اے نبی کی بیویو۔ جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی اور نیک عمل کئے نؤتھا اجرھا مرتین اس کو ہم دوگنا اجر دیں گے کام کیا نصف، اجر ملا دوگنا تو حساب سے پورا ہوا۔ ایک نکتہ اور سمجھئے۔

ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمومنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات یہاں ایک عجیب نکتہ ہے کہ سب جگہ برابر کہتا چلا آیا۔

لیکن ذاکرین کے ساتھ کثیر کا لفظ لگایا اور ذاکرات کے ساتھ نہیں لگا۔ اس لئے کہ اس میں نقص کی وجہ سے کثرۃ ذکر نہیں کرسکتی لیکن اجر برابر ہوگیا۔ ذاکر کثیر اور مطلق ذاکر کا من عمل صالحا من ذکر او انثی (احزاب - ۳۵) ذکرا ور انثی جس نے بھی نیک عمل کیا خواہ وہ عورت ہو یا مرد وھو مؤمن بشرطیکہ وہ مومن ہو اتہ حیاۃ طیبۃ (نحل - ۹۷) ہم اس کو بڑی پاکیزہ زندگی دیں گے۔ اس میں مرد عورت کی کوئی قید نہیں ہے۔ جس کے اعمال بہتر ہوں گے۔ وہی افضل ہوگا۔ فرعون کی بیوی فرعون سے افضل تھیں۔ حضرت نوحؑ کی بیوی کافرہ تھی۔ امہات المومنین کا چونکہ ڈبل حصہ ہے۔ اس لئے ہم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امہات المومنین حضرت ابو بکرؓ عثمانؓ عمرؓ و علیؓ اور دیگر صحابہ سب سے افضل ہیں۔ مرد چونکہ عورت سے جسمانی اور دماغی قوت میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے امامت اور خلافت کے امور مرد کے سپرد کئے اور عورت کو اس سے محروم کردیا۔ عورت گھر کا انتظام کرے مرد معاشرہ کا انتظام کرے۔ جب حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ منتخب کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ لوگو تم نے مجھے خلیفہ چن لیا حالانکہ مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں۔ اور اللہ پاک نے ان حضرات کے لئے فرمایا کہ اولئک ھم الصادقون (حشر - ۸) تو ابو بکرؓ سچے ہیں۔ اور انہوں نے فرمایا کہ اس وقت ان سے بہتر لوگ موجود تھے۔ اور مردوں میں بالاتفاق ان سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ اور بہتر موجود تھا تو لازماً وہ عورتیں ہی تھیں اور وہ عورتیں امہات المومنین ہی ہیں۔ جو ان سے افضل ہیں یا نساء النبی لستن کاحد من النساء (احزاب - ۳۲) اے نبی کی بیویو تم بے مثال عورتیں ہو تمہاری مثل کوئی عورت نہیں تو یہ بیٹی یعنی حضرت فاطمہؓ سے بھی افضل ہوگئیں۔

ایک اور دلیل بھی میری سمجھ میں آئی اللہ پاک نے فرمایا النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم یہ اللہ پاک نے بڑی عجیب و غریب چیز فرمائی ہے کہ نبی (الاحزاب ۶)
مومنین سے بہت زیادہ محبت کرنیوالا ہے۔ ان کی جانوں کے مقابلے میں یعنی مومنین کو اپنی جانیں جتنی پیاری ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ نبی کو ان کی جانیں پیاری ہیں۔ تو نبی کو آپ سے کتنی شدید محبت ہو گئی۔ آپؐ نے ایک شخص سے دریافت کیا۔ تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے اس نے کہا کہ میں نے نماز روزہ تو زیادہ نہیں کیا البتہ میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا المرأ مع من احبہ آدمی اس شخص کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ اللہ اور نبیؐ آپکے ساتھ ہیں وازواجہ امہاتھم اور نبی کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ ماں کی تعظیم سب پر فرض ہے۔ تو نبی کی بیویوں کی تعظیم تمام مومنین رسائے صدیقین اور تمام صحابہ پر واجب ہو گئی تو نبیؐ کی بیویاں ان سب سے افضل ہو گئیں۔ اوپر کی آیات میں صدقات و خیرات کی تعریف اور سود کی برائی بیان کی پھر تقویٰ کا ذکر ہوا۔ صدقہ تو اس کے حکم کے مطابق مال کا گھٹانا تھا اور سود اس کے اعلان کے مطابق مال کا گھٹنا ہے دونوں میں گھاٹے کا ذکر تھا۔ ایک گھاٹا حلال تھا اور ایک گھاٹا حرام تھا اب حلال مال جو بچ گیا اس کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن شریف میں کسی مضمون کے متعلق اتنی تفصیل نہیں آئی۔ پورا رکوع مال حلال کی حفاظت کے لئے ہے۔ فرمایا۔
یاایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین اے ایمان والو جب تم قرض کا معاملہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قرض کی رقم نہ ڈوب جائے الیٰ اجل مسمّٰی معین مدت

کے لئے قرض دو تو فاکتبوہ فرمایا کہ لکھ لیا کرو۔ دوسری بات فرمائی کہ کاتب ہونا چاہیئے جو لکھے۔ کاتب کو چاہیئے کہ انکار نہ کرے۔ یہ تیسری بات ہوئی۔ فرمایا کہ دالیکتب تاکید فرمائی کہ تیرا فرض ہے کہ لکھے۔ پھر کہا لکھواؤ آگے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ پھر فرمایا لا یبخس منہ شیئًا اس میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ بچہ ہے، کمزور ہے، بوڑھا ہے اور نہیں لکھوا سکتا۔ یعنی گونگا ہے۔ غیر زبان جانتا ہے یا اور کوئی مجبوری ہے تو اس کا وکیل، منیجر، کارکن یا ولی یعنی باپ یا قاضی حاکم سب اس میں آگئے۔ وہ لکھیں۔ پھر کہا لکھنے پر اکتفا نہ کرو گواہ بنالو اپنوں میں سے اپنوں سے مراد یا مومنین ہیں یا ایسے متدین آدمی ہیں۔ جن پر تم کو اعتماد ہو۔ پھر فرمایا گواہ دو مرد ہوں۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ پھر گواہوں کو تاکید فرمائی کہ جب ان کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ شاہد کے لئے حکم ہے کہ وہ انکار نہ کرے اور غلام آ نہیں سکتا۔ جب تک اس کا آقا اجازت نہ دے۔ لہذا غلام خارج ہو گیا۔ شاہد کے لئے دس شرطیں ہیں۔ عاقل ہو۔ بالغ ہو۔ آزاد ہو۔ جھوٹا نہ ہو۔ لنگڑا نہ ہو۔ پھر تاکید فرمائی کہ اس میں تساہل نہ برتنا۔ چھوٹی بڑی تمام تفصیل لکھنا پھر فرمایا ذالکم اقسط عند اللہ واقوم للشہادۃ وادنیٰ الا ترتابوا اتنی مفصل تاکید بیان فرمائی (البقرۃ ۲۸۳) اس سے پتہ چلا کہ مال حلال کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ اور یہ حکم مستحب مندوب ہے فرض نہیں ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مقصود ہے۔ ایک تو جیسے نماز ہے وہ قطعی مقصود ہے۔ یہ قطعی تو مقصود نہیں ہے لیکن اس کا غلبہ مقصود ہے۔ جیسے مسواک کرنا۔ اور آگے اور تفصیل ہے۔ پورا رکوع اسی میں ہے۔ وہ آئندہ بیان کروں گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا
اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ
ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى
اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً
تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا
يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ
فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ
بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا
كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا
فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ
رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا
فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

(البقرۃ - ۲۸۲ - ۲۸۳)

اور انکار نہ کریں گواہ جب ان کو بلایا جائے اور نہ جی چرائیں لکھنے سے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا معین وقت تک یہ تمہارے لئے زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور گواہی کے بہت قریب ہے اور قریب ہے اس سے کہ دونوں کو شک نہ ہو یہ مستثنیٰ ہے کہ جب نقد معاملہ کرو جیسے تم آپس میں کرتے رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اس کو نہ لکھو اور تم گواہ بنا لو جب تم خرید و فروخت کرو کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچائیں اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہارے لئے نقصان کا سبب ہوگا اور اللہ پاک سے ڈرو اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر شے کو جانتا ہے اگر تم سفر میں ہو اور کاتب ہو رہن رکھ [illegible] اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو وہ امانت واپس کر دے جس کا امین بنایا گیا ہے۔ اللہ جو اس کا رب ہے اس سے ڈرے۔ تم شہادت کو مت چھپاؤ اگر تم نے چھپایا تو تمہارا دل گناہ گار ہے جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔

اور نہ انکار کریں گواہ۔ جب ان کو بلایا جائے۔ مجتہدین کے دو گروہ ہیں ایک گروہ تو یہ کہتے ہیں کہ جب شاہد بننے کے لئے بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ گواہ کو جب گواہی ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں ان دونوں میں صحیح یہی ہے کہ گواہ بننے کیلئے نہیں بلکہ گواہی دینے کے لئے بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ کیونکہ اگر آپ گواہ بننا نہ چاہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ گواہ ہیں۔ اور پھر آپ کو بلایا جائے اور نہ جائیں تو یہ بات منع ہے معصیت ہے اس لئے یہ حکم گواہی کے ادا کرنے سے متعلق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خطاب گواہوں سے ہے یعنی وہ لوگ جو گواہ بن چکے ہیں ان کیلئے حکم ہے کہ ادائے شہادت سے انکار نہ کریں۔ یہ معنی ہوتے بلایا اور نہ گئے یہ تو انکار ہے ہی۔ گئے اور غلط بیانی کی یہ بھی انکار میں شامل ہے۔ اس کی

بھی ممانعت ہے۔ ایک بات اور سمجھ لیں کہ شاہد اس کا پابند ہے کہ جب اس کو بلایا جائے تو وہ آئے اور غلام اپنے آقا کا پابند ہے کہ وہ اجازت دے تو آ سکتا ہے اور اگر وہ اجازت نہ دے تو وہ نہیں آ سکتا۔ اسی لئے حنفی مذہب میں غلام کی شہادت غیر معتبر ہے ولا تسئموا صغیراً او کبیراً الی اجلہ ایسی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ بھی صحیح نہیں کر سکتے۔ وہ نہ جی چرائیں۔ کس چیز سے ان تکتبوہ اس کے لکھنے سے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ ہزار دو ہزار کا معاملہ بڑا کہلائیگا۔ سو پچاس کا معاملہ چھوٹا کہلائے گا۔ پیسے دو پیسے کا معاملہ چھوٹے معاملے میں بھی شامل نہیں ہے۔ الی اجلہ چھوٹا سا معاملہ ہو تو اس کے لیئے بھی یہ لکھنا چاہیئے کہ کس وقت ادا ہوگا۔

اس قدر لکھنے کی تاکید ہے لیکن یہ سب مستحب ہے۔ مندوب ہے۔ فرض نہیں ہے۔ نظام عالم ٹھیک رکھنے کے لئے طریقہ احتیاط بتایا ہے ذالکم اقسط عند اللہ جو اوپر طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک تمہارے لئے نہایت عادلانہ بات ہے۔ اقوم للشہادۃ قوم کے بہت نزدیک ہے شہادت میں گواہی کے لئے یہ نہایت سیدھا طریقہ ہے۔ کہ اس کو لکھ لو۔ ادنیٰ الا ترتابوا۔ اور قریب ہے اس سے کہ دونوں کو شک نہ ہو تاکہ دونوں میں سے کسی کا نقصان بھول کی سبب نہ ہو جائے اقسط عند اللہ یہ عاقبت کی درستی کیلئے ہے۔ اقوم للشہادۃ یہ دنیوی نظام کے لئے ہے۔ الا ترتابوا فریقین کے فائدے کے لئے ہے۔ قرضہ کے لین دین کا معاملہ بیان کرنے کے بعد اب یہ اور بات کہی الا ان تکون تجارۃ حاضرۃ تدیرونہا بینکم مگر یہ کہ تجارت حاضرہ ہو حاضر تجارت دست بدست یعنی نقد معاملہ کو کہتے ہیں۔ آپ نے چیز خریدی اور پیسے دیئے ایسی صورت لکھنے سے مستثنیٰ ہے۔ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فلیس علیکم جناح ان لا تکتبوھا

تو تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اگر نہ لکھو جناح کے معنی گناہ کے ہیں۔ بلکہ گناہ
اصل میں جناح کو بگاڑ کر ہی بنایا ہے۔ اگر لکھنا فرض ہوتا تو نہ لکھنا گناہ ہوتا۔ لیکن لکھنا چونکہ
مندوب ہے اس لئے نہ لکھنا گناہ نہیں ہے۔ واشہدوا اذا تبایعتم اگر نہ لکھو تو
کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی لمبی چوڑی رقم ہے تو شاہد بنالو۔ جب تم خرید و فروخت کرو
ہر چھوٹی چھوٹی چیز پر نظر ہے۔ دنیا کی کوئی حرکت نہیں ہے جس کو جاری رکھنے
کے لئے ضابطہ نہ ہو۔ کسی چیز کو نہیں چھوڑا تاکہ عذر باقی نہ رہے ولا یضار کاتب ولا شہید
اہل معاملہ کو کاتب اور شہید نقصان نہ پہنچائیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اہل معاملہ
شہید اور کاتب کو نقصان نہ پہنچائیں۔ کیونکہ یضار گرامر کی رو سے یضارِرُ اور یضارَرُ دونوں
سے مشتق ہو سکتا ہے۔ وان تفعلوا فانہ فسوق بکم اگر تم نے ایسا کیا یعنی نقصان
پہنچادیا تو یہ فسق ہے۔ یعنی اللہ کی طاعت سے باہر ہو جاتا ہے۔ واتقوا اللہ
اللہ سے ڈرو ویعلمکم اللہ اور اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے۔ اور تعلیم وہ دے گا
جو جانے گا۔ اس لئے دلیل بیان کی۔ کہ اللہ پاک ہر شئے کو جانتا ہے ان اللہ بکل شیئ
علیم۔ وان کنتم علی سفر اگر تم سفر میں ہو ولم تجدوا کاتبا اور کاتب میسر
نہیں ہے تو فرھن مقبوضۃ تو چیز رہن رکھ دو۔ رہن کہتے ہیں۔ چیز
گروی رکھنے کو۔ قبضہ میں دیدو۔ جب تک قبضہ نہیں ہوگا۔ رہن نہیں ہوگا۔ رہن
سفر کے سلسلے میں بیان کیا لیکن سفر اور حضر دونوں میں جائز ہے۔

فان امن بعضکم بعضاً اگر تم میں سے کسی کو کسی سے خطرہ نہ ہو۔
آمن بے خوف ہونے کو کہتے ہیں۔ ترجمہ اس کا یہ ہوگا کہ اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتماد ہو۔
تو پھر جب زکورہن رکھنے کی ضرورت نہیں ہے فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ تو چاہیئے

کہ جس پر اطمینان کیا گیا ہے۔ وہ امانت کو ادا کرے ولیتق اللہ ربہ اور اپنے رب سے ڈرے ولا تکتموا الشہادۃ اور گواہی کو چھپائے نہیں ومن یکتمہا فانہ اثم قلبہ جس نے ایسا کیا اس کا دل گناہ گار ہے۔ واللہ بما تعملون علیم اور اللہ پاک تمہارے ہر کام سے خبردار ہے۔ جانتا ہے۔

میرے خیال میں ایک بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ڈرو اللہ سے اور اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے اور دلیل یہ دی کہ تعلیم وہی دے گا جو عالم ہے۔ جو ہر شے کا عالم نہیں وہ تعلیم نہیں دے سکتا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ تعلیم خدا ہی دے سکتا ہے عقل سے علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک برہان تہارا اللہ پاک نے میرے دل میں ڈالی ہے اس میں سارا عالم آگیا۔

کسی شے کا اس طرح ہونا کہ اس کے اس طرح ہونے سے کوئی دوسری شے سمجھی جائے تو پہلی شے کو دوسری شے کی دلیل کہتے ہیں۔ جس طرح روشنی سورج کی اور دھواں آگ کی دلیل ہے۔ لیکن اگر سورج اور آگ پہلے کسی نے نہ دیکھی ہو تو پھر اس کے لئے دلیل نہیں بن سکتی۔

اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ کوئی چیز جو تمہیں معلوم ہو اس کو چھپاؤ نہیں بتاؤ۔ کہتے ہیں کہ حکیم جالینوس کو کسی مرض کے متعلق راز معلوم ہو گیا۔ اس نے اس کو چھپا لیا۔ اور اپنی کتاب میں درج نہیں کیا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ کوئی فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے تجھے ایک راز بتایا اور تو نے ہمارے بندوں سے اس کو چھپا لیا۔ اس نے دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اس کو اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ قرآن میں تو اس کا تفصیلی حکم ہے۔ ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینٰت والھدیٰ ایسے لوگوں کے لئے حکم ہے

یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون (بقرہ - ۱۵۹) ایسے لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنیوالوں کی لعنت ہے۔ بنی ہوئی چیز سے بنانے والے کا خیال آتا ہے۔ مکان سے معمار کا یقین ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کو فلسفیوں اور عالموں نے اپنی کتابوں میں ایک طریقہ سے بیان کیا وہ بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے ورنہ چیز وہ یہی ہے اسی کو دلیل کہتے ہیں۔

اب دیکھئے یہ دھوپ سورج پر دلالت کر رہی ہے یہ ہر شخص جانتا ہے اور دھوپ کو دیکھتے ہی اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ سورج چمک رہا ہے۔ اب ایک ایسا شخص فرض کیجئے جس نے سورج کو نہ دیکھا ہو وہ دھوپ کو دیکھ کر کبھی سورج کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ دلیل سے وہ بات سمجھی جا سکتی ہے جس کو آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ اگر آپ پہلے سے نہیں جانتے تو نہیں سمجھ سکتے۔ تو معلوم ہوا کہ عقل کے ذریعہ آپ ایسی بات نہیں جان سکتے۔ جس کو آپ بغیر عقل کے پہلے سے نہ جانتے ہوں۔ سارا فلسفہ ختم ہو گیا۔ سارے عالم کو دعوت مقابلہ ہے۔ کوئی اس کے خلاف بول نہیں سکتا۔

اب جو آپ کو علم ہے کہ دھواں آگ کی دلیل ہے۔ تو عقل نے تو بتایا نہیں پھر کس نے بتایا عقل کے علاوہ کوئی اور شے ہے جس نے آپ کو علم دیا۔ اسی کا نام خدا ہے۔ یہ معنی ہیں یعلمکم اللہ کے اگر وہ پہلے سے علم نہ دیتا۔ تو کوئی شے عقلی دلیل بن ہی نہیں سکتی تھی۔

پہلے فرمایا واتقوا اللہ اللہ سے ڈرو۔ جب بچہ نہیں تیار ہوتا کام کرنے کو تو آپ کہتے ہیں کہ نہیں تو لکڑی مارتا ہوں۔ وہ ڈر جاتا ہے۔ بات اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے اور وہ کام کر گذرتا ہے۔ یہی صورت ہے پہلے فرمایا کہ ڈرو اللہ سے اب جو وہ بتائے گا تو دل میں بیٹھ جائیگا۔ ڈر بتایا کہ کیسے پیدا ہو۔

امانتوں کو ادا کرو۔ جب امانتوں کو ادا کرو گے اسی وقت اللہ کی ہیبت پیدا ہو جائیگی

ویتق اللہ جب اللہ کی ہیبت عظمت دلمیں بیٹھ گئی تو یعلمکم اللہ اب جو اللہ تعالیٰ تعلیم فرمائیگا وہ دل میں بیٹھ جائیگی۔ سب اللہ ہی کی تعلیم ہے

یہاں حاکم کے حکم کا جو خوف ہے آنا خوف بھی حاکم الحاکمین کا نہیں ہوتا۔ یہ نقصان وہ چیز ہے اس لئے مسلمان قوم تباہ ہوگئی۔ اور اس کتاب کے اندر صرف یہی ذکر ہے یہی بیان ہے اس جہان میں تم رہ رہے ہو اس دنیا میں۔ یہ زندگی درحقیقت دھوکا ہے اس کو اصل زندگی مت سمجھو۔ یہ سمجھانا ہے تو جب یہ دھوکا ہے تو یہ مفید ہو نہیں سکتی۔ تو پھر یہ لغو ہوگی۔ اور لغو اس کو کہتے ہیں جس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہاں ہونا ہوگیا معلوم ہوگیا کہ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر نہیں ہے تو لغو بھی نہیں رہی تو پھر کیا ہے۔ دراصل یہ مفید چیز کا ذریعہ ہے۔ مفید چیز کوئی اور ہے اور اس کا یہ ذریعہ ہے۔ جیسے کہ روپیہ کمانا تو ہے اصل تو وہ مقصد ہے۔ اور دوڑ دھوپ بازاروں میں چلنا پھرنا۔ بسوں سے اترنے میں گرپڑنا گاہکوں سے جھگڑا ہونا یہ سب محنت کرتا ہے تو وہ محنت جو ہے وہ لغو تو نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذریعہ ہے کسی فائدہ کا۔ اسی طرح یہ پوری زندگی کسی دوسری زندگی کا ذریعہ ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ ؕ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (بقرہ - ۲۸۴)

للّٰہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے۔

وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ ط

اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے دلوں میں ہے یا اسکو چھپالو اللہ اس کا حساب لے گا۔

فیغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء ط

پھر بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔

واللہ علی کل شئ قدیر ۝ البقر ۲۸۴

اور اللہ تمام اشیاء پر قادر ہے۔

عام طور پر مفسرین کا قاعدہ ہے کہ وہ آیات میں ربط دیتے ہیں تاکہ عبارت مربوط ہو جائے۔ یہ دل کو اچھا نہیں لگتا کہ اللہ پاک کا کلام بے ربط ہو۔ شیخ اکبر علاؒ

ی الدین عربی نے تو اتنی محنت کی ہے کہ الم سے والناس تک پورے قرآن کو ایک جملہ قرار دیا ہے. لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے انسانی شعور میں جو ربط ہے وہ ربط انسانی کلام میں تو ہوگا۔ اللہ کے کلام میں وہ ربط تلاش کرنا غلطی ہے. فی نفسہٖ اللہ کا کلام مربوط ہو اس سے ہمیں بحث نہیں جو ربط انسانی نثار اور شعراء میں پایا جاتا ہے اس ربط کو اللہ کے کلام میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس ربط کو معیار بنانا جو ہمارے خیال میں ربط ہے یہ غلط ہے۔ کیونکہ ایسے حرف یا الفاظ کلام کے شروع یا درمیان میں لانا جس کے اہل زبان کے یہاں کوئی معنی نہ ہوں ربط، فصاحت بلاغت سب کے خلاف ہے۔ اللہ کے کلام میں اکثر سورتوں کے شروع میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ الٓرٰ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ تو اس میں کیا ربط ہوگا۔ ہوئی سی بات ہے جس کے فعل میں ربط نہیں ہے اس کے کلام میں کیا ربط ہوگا۔ زمین کو دیکھو کہیں پہاڑ کہیں ریگستان کہیں دریا، کہیں وادی کہیں نظم نہیں نظر آتا۔ آسمان کو دیکھئے کہیں ترتیب نہیں ہے. گلاب کا پھول کس قدر نرم و نازک اس کے نیچے سخت کانٹے لگا دیئے کہ ذرا بداحتیاطی سے پھول توڑیں تو ہاتھ زخمی ہو جائے. تو اللہ کے فعل میں وہ ربط نہیں ہے جو ہمارے خیال میں ہے. جب اس کے فعل میں ربط نہیں ہے تو اگر کلام میں بھی ربط نہ ہو تو کیا حرج ہے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ قرآن میں ربط ہے فصاحت ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ ہے مگر یہ وہ ربط نہیں ہے جو ہمارے ذہنوں میں ہے وہ فصاحت ہے جو انسانی شعور میں نہیں ہے اور نہ آئی ہے۔ دلیل اسکی یہ ہے کہ اگر اس میں انسانی ربط اور فصاحت و بلاغت ہوتی تو کوشش کر کے انسان ایسا کلام بنا لیتے. آج چودہ سو سال ہو گئے باوجود دعوت کے ایک آیت کوئی نہیں بنا سکا۔ اور دیکھئے ابراہیم و اسحاقؑ و یعقوبؑ و ایوب و موسیٰؑ و ہارونؑ ناموں کا سلسلہ ہے چلا جا رہا ہے یہ ہماری مروجہ فصاحت کے بالکل خلاف ہے قرآن

یں جگہ جگہ کفار کے اور شیطان کے مقولے درج ہیں اور وہ سب معجزہ ہیں یا نہیں اگر کہو ہاں تو کفار اور شیاطین کا کلام معجزہ ہو گیا اگر کہو نہیں تو فصاحت بلاغت سب گئی۔ بس جو بات وہ کہدے معجزہ ہے اور اگر ہم وہی بات کہدیں تو وہ معجزہ نہیں وہ مالک الملک ہے جو چاہے سو کر دے۔ جو چاہے سو کہدے۔ یہ بات عقل یں آتی ہے کہ جو چاہے سو کر دے۔ لیکن سب مانتے ہیں کہ اللہ جو چاہے سو کر دے تو پھر اس یں کیا حرج ہے کہ یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جو چاہے سو کہدے۔ اس یں کیا ربط ہے کہ پہلے آنے والی سورتیں بعد یں اور بعد والی پہلے رکھدیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مکی سورتیں پہلے لکھی جاتیں لیکن وہ زیادہ تر آخر یں ہیں۔

ایک بہت بڑا مفسر ہے وہ کہتا ہے کہ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (بقرہ ۲۶۵) دلیل ہے للہ ملک السمٰوٰت والارض کی۔ وہ کہتا ہے کہ اس قدر محکم اور عجیب افعال کا کرنے والا جاہل نہیں ہو سکتا وہ عالم ہی ہونا چاہیئے۔ ابو مسلم اصفہانی بہت بڑا معتزلی عالم اور حکیم ہے اس نے ربط دینے کے لئے یہ بات کہی ہے لیکن اس نے بات صحیح نہیں کہی یہ غلط ہے متکلم۔ محکم اور عجیب فعل قطعی علم پر دلالت نہیں کرتا تمام دیگر حکماء بھی اسکے خیال سے متفق ہیں۔ لیکن مکڑی جالا تنتی ہے، شہد کی مکھی ششش پہل خانے بناتی ہے۔ دونوں کس قدر محکم فعل ہیں بڑا بڑا مہندس بھی حیران ہے مگر نہ مکڑی کو کوئی عالم کہتا ہے نہ شہد کی مکھی کو۔ ان کو کوئی ایک شخص بھی عالم نہیں کہتا۔

دلیل کی تقریر یوں کرتے ہیں۔ زمین و آسمان مستحکم فعل ہیں اور یہ فعل اللہ کے ہیں محکم فعل کا فاعل عالم ہے تو زمین و آسمان جسکا فعل ہے یعنی اللہ پاک عالم ہے۔ مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اللہ پاک نے جو دلیل فرمائی ہے وہ ہے

صحیح دلیل اس نے فرمایا الا یعلم من خلق کھلا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا۔ جو اپنے ارادہ اور قدرت سے بنائے گا وہ بغیر علم کے نہیں بنائے گا۔ (ملک-۱۴) محکمیت دلیل نہیں بلکہ دلیل اختیار ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سورۃ میں تمام احکامات بیان کئے ہیں۔ صدقہ، لین دین۔ زکوٰۃ۔ سود۔ طلاق۔ عدت۔ شہادت۔ جہاد۔ تجارت وغیرہ جب سب بیان کرچکا تو اب آخر میں فرمایا کہ جان لو سب ملکیت اللہ ہی کی ہے۔ اور اللہ پاک سب کچھ جانتا ہے۔ تحدید ہے ڈانٹ ہے خبردار اگر خلاف کیا ہمیں جانتے ہو ہم کون ہیں ہم سے بچ نہیں سکتے۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے اس کا وہ حساب لے گا اور حساب وہی لے گا جو جانتا ہوگا۔ یہ آیتیں قدرت اور علم دونوں پر دلالت کر رہی ہیں۔ اور یہی دو کمال ہیں بس عقلمند آدمی کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دونوں کمال اس میں ہیں لہذا اسکے حکم کی تعمیل کرنا چاہیئے۔

بعض مفسرین نے اس کو شہادت کی آیت سے ربط دیا ہے کہ شہادت کو نہ چھپانا ورنہ میں سب کچھ جانتا ہوں سب حساب تم سے لے لوں گا۔ ایک اتنے بڑے عالم ہیں کہ مجھے یہاں ان کا نام لینے میں تکلف ہوتا ہے میرا علم ان کے جہل سے بھی کم ہے ان کی رائے یہ ہے کہ لین دین میں ہم نے تم کو بتایا ہے کہ لکھوا ور شہادت کرالو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ہمارا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے ہم تو زمین و آسمان کے مالک ہیں۔ جتنی رائیں اوپر بیان کی ہیں سب بہت بڑے بڑے علماء کی ہیں اور سب ہزار سال پہلے کے ہیں۔ لیکن میں نے بتادیا کہ ربط کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام کائنات آسمانی اور کائنات ارضی سب اللہ کی ملک ہے لیکن یہ معلوم کیسے ہوا۔ تین صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو اس کا کوئی مالک نہیں ہے یا اللہ کے علاوہ کائنات میں سے کوئی مالک ہے یا پھر خدائے تعالےٰ خود مالک ہے۔

ایسی چیزیں جن کا کوئی مالک نہیں ہوتا جن کی نگہداشت نہیں ہوتی وہ خراب اور برباد ہو جاتی ہیں مگر جتنی تاثیرات ہیں سب جوں کی توں باقی ہیں بالکل نہیں بدلیں تو معلوم ہوا یہ خراب نہیں ہوتیں۔ ان کی نگہداشت کرنے والا کوئی ہے جو ان کی ہر وقت دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔ لہذا اس کا کوئی مالک ضرور ہے۔

اب اگر اس کائنات میں سے کوئی مالک ہے تو اسے ہونا چاہیئے۔ مگر یہاں جو کچھ ہے سب مال ہی مال ہے مالک خود مال نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بھی کوئی مالک نہیں ہے اور مالک ہے ضرور تو وہ مالک خدا ہی ہو سکتا ہے۔

فلسفیانہ طریقہ پر یوں کہا جا سکتا ہے جتنی اشیاء ہیں سب مال ہیں۔ ان میں مال ہی بننے کی خاصیت ہے مالک بننے کی خاصیت نہیں ہے۔ مال کی تعریف یہ ہے کہ قابل تصرف ہو۔ کل اشیاء قابل تصرف ہیں کسی میں تصرف کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ تصرف کے معنی یہ ہیں کہ حالات میں تبدیلی کر دینی۔ جو خصلتیں اشیاء کی مقرر کر دی ہیں وہ ناقابل تبدیل ہیں ہر شئے کا خاصہ الگ ہے اور خاصے کا جو محل ہے جسم وہ ہر شئے میں مشترک ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی خاصہ جسم کی طبیعت کا تقاضہ نہیں ہے۔ تو پھر کوئی ایسی طاقت ہے جس نے یہ خاصے اس میں پیدا کر دیئے ہیں اور وہ جسم سے باہر کی شئے ہے اور جو شئے جسم سے باہر ہو گی وہ جسم نہیں ہو گی اور جو شئے جسم نہیں ہو گی وہ ایسی نہیں ہو گی جیسے یہ جسم ہے اور جسم ایسا ہے کہ پہلے نہیں تھا پھر ہوا تو وہ ایسا نہیں ہو گا کہ پہلے نہ ہو پھر ہو تو پھر وہ ایسا ہو گا کہ ہو ہی ہو۔ وہی ہے قادر مطلق جو ان تمام اشیاء میں خاصیتیں پیدا کر رہا ہے لہذا مالک کل وہی ہے۔

وان تبدو ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ۔ جو چیزیں تمہارے دل میں ہیں ان کو ظاہر کر دیا چھپاؤ اللہ سب کا حساب تم سے لے گا۔ جب یہ آیت اتری تو بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض

کی کہ دل میں تو ہمارے بہت سی بری باتیں آتی ہیں جن پر ہمارا کوئی بس نہیں ہے ہم تو بڑی مشکل میں پڑ گئے تو آپ نے فرمایا تم نے یہودیوں والی بات کی کہ سمعنا وعصینا (النساء-۴۶) جبکہ تمہیں تو کہنا چاہیئے تھا سمعنا واطعنا (البقرہ-۲۸۵) ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایک سال تک پریشان رہے تب اگلی آیت اتری لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا (البقرہ-۲۸۶) تب جاکر اطمینان ہوا کہ اللہ کسی کو اسکی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

بعض مفسرین نے یہ بیان کیا کہ تمہارے جی میں آیا شراب پیو اب تم کھلم کھلا پیو یا چپکے سے گھر میں بیٹھ کر پیو۔ دونوں برابر ہیں۔ باز پرس ہوگی ہر صورت میں لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اگلی آیت میں ہے یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ۔ جس کو چاہے گا بخش دے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو خیالات غیر اختیاری طور پر آتے ہیں وہ معاف ہیں۔ جوا کھیلنے کا خیال آیا کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا اور کھیلا کبھی نہیں یہ معافی کا مستحق ہے۔

جو لوگ سزا کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں سزا تو ضرور ملے گی مگر اس دنیا میں ملے گی کہ وہ پریشان رہے گا اور وہاں اس کو معافی مل جائے گی۔ اس اصول کو یاد رکھیں کہ سزا و جزا، ثواب و عذاب اس پر ہے جس کا آپ کو اختیار ہوگا۔ جو آپ کے اختیار میں نہیں ہے اس پر عذاب نہیں ہوگا۔ خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی۔ ایک عورت جارہی ہے غیر اختیاری طور پر اس پر نظر پڑ گئی معاف اب جو دوبارہ دیکھے گا اختیار اور ارادہ سے دیکھے گا اس پر مواخذہ ہوگا۔

یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء جس کو چاہے گا بخش دے گا جسکو چاہے گا عذاب دے گا۔ یہاں ایک بات نکل آئی کہ کافر اپنی کفر کی وجہ سے دائمی عذاب کا مستحق ہے وہ تو معاف ہوگا ہی نہیں ۔ اور مومن مطیع اپنی فرماں برداری کے سبب جنت میں جائے گا اور دائم وہیں رہے گا تو یہ آیت ان دونوں کے علاوہ

جو گروہ ہے اس کے لئے ہے وہ گروہ مومن فاسق ہے تو مومن فاسق کو اللہ جسکو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ یہ آیت رد ہے معتزلہ اور دیگر لوگوں کا جو فاسق کی بخشش کے قائل نہیں ہیں۔

واللہ علی کل شئ قدیر۔ اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

جہم ابن صفوان اس کا قائل ہے کہ انسان مجبور محض ہے اس کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کی حرکات مثل جمادات کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شئے نہیں ہے اسکی دلیل یہ آیت ہے جب اللہ ہر شئے پر قادر ہے تو اگر اللہ پاک شئے ہوگا تو وہ خود اپنے اوپر قادر ہو جائے گا۔ دلیل کی تقریر یوں ہے کہ اللہ تعالےٰ مقدور نہیں ہے اور ہر شئے مقدور ہے لہٰذا اللہ تبارک و تعالےٰ شئے نہیں ہے۔ مقدور ہونا ہر شئے کے لئے ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے منفی ہے قاعدہ یہ ہے کہ جو شئے کسی شئے کے لئے ثابت ہو اور دوسری شئے سے وہ منفی ہو تو وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے منفی ہو جائیں گے لہٰذا اللہ تعالےٰ شئے نہیں ہے۔ بات اس نے بالکل قاعدہ میں کہی ہے اور نتیجہ نکالنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ شئے نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں یہ غلط ہے۔ اور غلط یہ جب ہوگی کہ جب یا دونوں مقدمے غلط ہوں یا کم از کم ایک غلط ہو۔ مقدمے دونوں اگر صحیح ہوں تو نتیجہ صحیح نکلنا چاہیئے مقدمے یہاں دونوں صحیح ہیں اللہ تعالیٰ مقدور نہیں ہے یہ مقدمہ صحیح ہے دوسرا مقدمہ اللہ ہر شئے پر قادر ہے یہ بھی صحیح ہے پھر کیا وجہ ہے غلطی کی۔ غلطی اس میں یہ ہے غور کریں یہ مقدمہ اللہ ہر شئے پر قادر ہے اس میں جو" ہر شئے" ہے اس میں اللہ تعالیٰ شامل ہے یا نہیں شامل ہے۔ اگر ہر شئے میں شامل ہے تو پھر وہ شئے ہو گیا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ شامل نہیں ہے تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ اللہ کے علاوہ ہر شئے مقدور ہے۔ نتیجہ اب یہ نکلے گا کہ اللہ ایسی شئے ہے جو ہر شئے میں شامل نہیں ہے۔

دوسری دلیل اس نے یہ دی لیس کمثلہ شیٔ اسکے معنی یہ ہوئے لیس مثل مثلہ شیٔ اسکی مثال کی مثال کوئی شے نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اس کو (سورۃ ۱۱) مغالطہ عامتہ الورود کہتے ہیں منطق میں یہ بہت آتا ہے۔

اس کی مثل کی مثل شے نہیں ہے۔ اگر ا کی مثل ب ہے تو ب کی مثل ا ہوگا لہذا اللہ کی مثل کی مثل جو ہوگا وہ اللہ ہوگا۔ جب مثل کی مثل شے نہیں ہے تو اسکا مفہوم یہ نکلا کہ اللہ شے نہیں ہے۔ مگر یہ دلیل بھی غلط ہے وہ بات سمجھا نہیں۔ یہ نکرہ منفیہ ہے نفی کے بعد جو نکرہ آتا ہے وہ عام ہوتا ہے اسکا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ایسی شے ہے کہ اسکی مثل کی مثل کوئی شے نہیں ہے یعنی اللہ کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ دھوکا یہ ہوا کہ اس نے خالی شے کہا یہ نہیں کہا کہ لیس کے بعد شے ہے۔

اللہ تعالےٰ قادر ہے ہر شے پر۔ بہت سخت مسئلہ ہے اس پر شدید بحثیں ہوئی ہیں اور بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جو لوگ قدرت کے قائل تھے انہوں نے نقائص اور محالات پر بھی اس کو قادر کر دیا۔ اور جو لوگ اس کے منکر تھے انہوں نے بہت سی چیزوں پر قدرت سے انکار کر دیا۔

بحث =

یہاں دو چیزیں ہیں ایک ممکن اور ایک محال۔

محال وہ شے ہے جس کے ساتھ قدرت متعلق نہ ہو سکے اور جو خیال میں نہ آسکے۔ مثال اسکی اجتماع النقیضین ہے۔ یہ بات خیال میں نہیں آتی کہ ایک شے ایک ہی وقت میں ہلکی بھی ہو اور بھاری بھی ٹھنڈی بھی ہو گرم بھی سفید بھی ہو اور سیاہ بھی۔

ممکن وہ شے ہے جس کے ساتھ قدرت متعلق ہو یا ہو سکتی ہو اور اگر اس کو واقع فرض کر لیا جائے تو کوئی خرابی لازم نہ آئے۔

قدرت کے قائل یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے لیکن بولے گا نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ جھوٹ بولدے تو خرابی لازم آئے گی یا نہیں جو وعدے اسنے جنت دوزخ کے لئے کئے ہیں اگر ان کو جھوٹ فرض کر لیا جائے تو سارا نظام بگڑ جائے گا۔ معلوم ہوا خرابی لازم آئے گی لہذا قدرت جھوٹ کے ساتھ متعلق نہیں ہوسکتی۔ کذب باری تعالیٰ ممکن نہیں ہے۔ تو پھر محال ہی ہے محال کی تعریف آپ کو بتائی کہ اس شے کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہوسکتی۔ اب اگر ہم کہیں کہ اللہ پاک جھوٹ بولنے پر قادر ہے تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ محال پر قادر ہے یعنی ایسی شے جس کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہوسکتی اس کے ساتھ قدرت متعلق ہوسکتی ہے۔ یہ بالکل مہمل بات ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا اس نے فرمایا ان الساعۃ لاٰتیۃ لاریب فیھا۔ اگر یہ بات جھوٹی ہوجائے تو نظام دنیا اور عقبےٰ سب بگڑ جائے گا۔ (مؤمن۔ ۵۹)

ان اللہ علی کل شیٔ قدیر کے معنی کوئی نہ سمجھ سکا اگر کہیں خدا جھوٹ پر قادر ہے تو محال لازم آیا اور اگر کہیں کہ قادر نہیں ہے تو عجز لازم آیا جس کے لئے طبیعت انسانی تیار نہیں ہے۔ یہ قطعی حق ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہر شے کے ساتھ قدرت متعلق ہوسکتی ہے یا ہے اور یہ واقع ہے۔ معدوم کو موجود اور موجود کو معدوم، کم کو زیادہ اور زیادہ کو کم کر دیا ہے۔

یہاں تین چیزیں ہوئیں اللہ کی ذات، دوسری اس کی قدرت اور تیسری وہ شے جس کے ساتھ قدرت متعلق ہوگی تو جس شے کے ساتھ قدرت متعلق ہوگی اس کا نام مقدور تو قادر قدرت اور مقدور تین چیزیں ہوئیں۔ قادر کے ساتھ قدرت متعلق نہیں ہے اگر قدرت متعلق ہوگی تو وہ قادر نہیں رہے گا مقدور ہوجائے گا۔ اسی طرح قدرت کے ساتھ اگر قدرت متعلق ہوگی تو مقدور ہوجائے گی۔ قدرت نہیں رہے گی۔ اس سے

پتہ چلا قادر اور قدرت میں قدرت کے متعلق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ صرف مقدور میں پیدا ہوگا۔

تو اب یہ کہنا کہ وہ اپنی مثل پر قادر ہے۔ اپنی صفت پر قادر ہے یہ سوال ہی صحیح نہیں ہیں غلط ہیں اور جہاں مقدور کا سوال ہوگا وہاں وہ ہر شے پر قادر ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (آل عمران ۱۵۷-۱۵۸)

اگر تم قتل کر دیئے گئے یا راہ خدا میں مر گئے۔ مر جانے کے یہ معنی ہیں کہ ابھی میدانِ جنگ میں نہیں پہنچے اور راستہ ہی میں مر گئے۔ بہر حال ارادہ کے بعد۔ دونوں صورتوں میں یہ اچھی چیز ہے تو ان لوگوں کے لئے مغفرت ہے اور اللہ کی رحمت مغفرت سے مراد یہ کہ عذاب سے نجات پا گئے۔ اور رحمت میں جنت اور انعام کے مستحق ہو گئے۔

اگر تم راہ خدا میں قتل کر دیئے گئے تو تاکید کے ساتھ کہا کہ تمہیں اللہ کے پاس اٹھنا ہے۔ تینوں چیزیں بیان کر دیں۔ عذاب سے بچنا۔ جنت کا مستحق ہونا اور اللہ سے تعلق رکھنا۔ اللہ کی حضوری میں پہنچ جاؤ گے۔ یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ مغفرت اور رحمت خیر مما یجمعون تمام کائنات سے بہتر ہے مما یجمعون ان تمام چیزوں سے جو تم جمع کرتے ہو۔ دنیا کی جتنی نعمتیں ہیں وہ کائنات ہے۔ اور مال ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقصد بیان کرنیکا یہ ہے کہ تم جو نعمتوں کی محبت کی وجہ سے جہاد سے رکو گے تو یہ نعمتیں کل کی کل جو تم کو حاصل ہیں اور ہو سکتی ہیں سب گھٹیا ہیں اس شے سے جو تم کو جہاد میں ملے گی وہ بڑھیا شے ہے۔ مغفرت اور اللہ کی حضوری اور رحمت تو جس خیال سے تم رکنا چاہتے ہو مت رکو۔

اب اس کا حاصل سمجھ لیں کیا ہے اوّل تو مال کے حاصل کرنے میں اتنا تعب اور تکلیف ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ پھر اتنی تکلیف اٹھانے کے بعد مال بھی حاصل

ہوجائے تواس سے تمتع اور منفعت اٹھا سکنا ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج مال حاصل ہوا اور رات ہی کو ضائع ہو گیا۔ اور اگر مال کل تک باقی بھی رہ گیا تو ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے کہ مال سے نفع اٹھا سکنے سے روکدے۔ اور اگر نفع حاصل بھی ہو گیا اور کوئی بات روکنے والی پیدا نہ ہوئی تو آخر کبتک بالآخر مرنا ہے۔ چار ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مال اور مال والا دونوں باقی رہیں گے۔ یا دونوں فنا ہو جائیں گے۔ یا مال باقی رہیگا مال والا فنا ہو جائیگا۔ یا مال والا باقی رہے گا مال فنا ہو جائیگا۔ اگر مال باقی رہا اور مال والا فنا ہو گیا تو بے کار۔ اگر مال والا باقی رہا اور مال فنا ہو گیا تب بے کار۔ اور اگر دونوں فنا ہو گئے تب بے کار۔ اگر دونوں باقی رہے تو انتفاع لازمی نہیں ہے۔ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا کہ صحت نہیں ہوئی اور صحت بھی قائم رہی۔ اور فائدہ اٹھانا بھی رہا تو ہر وقت اس کے انقطاع کا خوف اتنا شدید ہوگا کہ اس کی حد نہیں۔ کیوں کہ جس شے میں لذت زیادہ ہوتی ہے اس کی جدائی میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اور بالآخر جدا ہونا ہی ہے۔ تو ہر صورت میں ناقابل التفات ہے۔ یعنی مال کی محبت کی بنا پر جہاد کو ترک کرتا ہے درحقیقت ایسا نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ یہ جتنی نعمتیں ہیں۔ ان میں خدا کی رحمت سب سے بہتر ہے اور ان سب کی جامع ہے۔ اس اصول کو سمجھ لیں ذرا باریک بات ہے۔ اوپر کی ترتیب ذہن میں رکھیں اور غور کریں۔ دراصل مال جو ہے وہ ذریعہ ہے تمام نعمتوں کے حاصل کرنے کا۔ کھانا، کپڑا، مکان ان کے حاصل کرنیکا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اگر ایک شخص کو کوٹھڑی میں بند کردیں اور کھانا پینا نہ دیں اور اس کا لاکھوں روپیہ بینک میں ہو تو سب بیکار ہیں لیکن چونکہ ہر شے جو مقصود ہوتی ہے مال کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے تو بار بار کے فعل سے ایک ملکہ راسخ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

کوئیں کی مینڈھ پر اور پکے فرش پر بار بار تقاطر سے گڑھا پڑجایا کرتا ہے۔ یا رسی جیسی نرم چیز کے بار بار گذرنے سے کنویں کی گھری جو لوہے جیسی سخت دھات سے بنتی ہے اس میں بھی غار پڑجاتے ہیں۔ سیلاب کس قدر عظیم الشان ہوتا ہے مگر یونہی گذر جاتا ہے پتھر پر کوئی اثر نہیں چھوڑتا لیکن بوند بوند مستقل تقاطر سے اس میں گڑھا پڑجاتا ہے۔ تو کثرت افعال سے ایک راسخ اور مضبوط ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ تو ہم نے دیکھا کہ روٹی روپے سے حاصل ہوتی ہے۔ کپڑا روپیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ٹوپی، جوتا غرض ہر ضرورت کی شے روپیہ سے حاصل ہوتی ہے تو ہماری توجہ ان چیزوں سے ہٹ کر روپیہ کی طرف آگئی کہ اصل مقصد روپیہ ہے اور مال کی محبت دل میں جم گئی۔ بازار میں دوکان میں ہم کھانا کھا رہے ہیں اور گاہک آگیا جس سے منافع ہوسکتا ہے تو فوراً کھانا چھوڑ کر اس گاہک کی طرف متوجہ ہوجائیں گے کہ کہیں چلا نہ جائے۔ حالانکہ وہ منافع جو اس سے حاصل ہوگا وہ اسی کھانے کے لئے تو ہے۔ اس کا تجربہ روز ہوتا ہے۔ نفس کو دھوکہ لگ گیا۔ کیونکہ تمام ضرورت کی چیزیں موقوف ہیں روپیہ پر تو وہ مال کو مقصود سمجھ گیا۔ اور مال سے اس کو محبت ہوگئی۔ یہ شبہ ہوگیا ہے۔ جتنے غلط مذاہب ہیں سب کی بنیاد شبہ یہی ہے جیسے آم بڑی اچھی شے ہے لیکن آم کا رس اگر پیالے میں نکال لیں تو وہ مشابہ ہوگا بچے کی نجاست سے جو رقیق القلب لوگ ہیں یا جو ضعیف الاعصاب لوگ ہیں وہ اس کو مشتبہ سمجھ کر نہیں کھاتے۔ تو حق و باطل میں یہی شبہ ہوتا ہے ملتی جلتی چیزیں ہیں اس کا علاج یہ ہے کہ قرینہ سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے تو قرینہ میں فرق دکھا دیا جاتا ہے۔ اگر آپ دریافت کریں کہ بھئی تبا خدا میں رسولؐ میں تجھے کیا شبہ ہے اور وہ بیان نہیں کرسکتا۔ یہ تو ضعف عقل کی وجہ سے ہے تو اس کا علاج تو یہ ہے کہ اس کو قوت پہنچائی جائے

لیکن قرینہ سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں دلائل کی جو کمزوری ہے وہ بتائی جائے
بار بار کے تجربہ سے جو اس نے گندی چیز کو دیکھا تو اس کو شبہ پیدا ہوا تو اس کا فرق بتایا جائے
کہ اس میں خوشبو ہے بدبو نہیں ہے۔ اسی طرح بار بار یہ دیکھنے سے کہ نفع کی جتنی چیزیں ہیں
مال سے حاصل ہوتی ہیں تو اس کی طبیعت نفع کی چیزوں سے ہٹ کر مال کی طرف آ گئی
اس لئے ایک تھالی میں ایک روٹی رکھیئے اور ایک روانی۔ اب کسی فقیر ضرورت مند سے
کہیئے کہ ایک چیز ملے گی چاہے روٹی لے لیجئے چاہے روپی تو کوئی فقیر روٹی نہیں لے گا
سب روانی اٹھا لیں گے۔ شاید ہزاروں میں سے ایک ایسا نکلے جو روٹی اٹھا لے تو روپیہ
ہے ذریعہ تمام مادی اور جسمانی آسائشوں کا اور علم جو ہے وہ ذریعہ ہے روح کی آسائشوں
کا۔ اور روحانی لذت بہت قوی ہوتی ہے۔ جانور بھی اس کو جانتا ہے دیکھئے شکاری کتا
شکار کرتا ہے۔ وہ اس کی غذا ہے جسمانی لذت کا سبب ہے مگر وہ اس کو نہیں کھاتا
مالک کو لا کر دے دیتا ہے اس کی وجہ کیا ہے کہ جب وہ لے کر آتا ہے تو مالک خوش ہو کر
اس کو چمکارتا ہے اور ہاتھ پھیرتا ہے۔ شاباش۔ اس سے جو اس کو روحانی خوشی ہوتی ہے
اس پر جسمانی خوشی کو قربان کر دیتا ہے۔ اسے خود کھا لینا چاہیئے تھا مگر وہ چمکار اس کو نہ ملتی
اور روح کو اس کے خوشی حاصل نہ ہوتی۔ اس سے پتہ چل گیا کہ روحانی لذت زیادہ قوی ہے
اس بات کو کتا بھی جانتا ہے اور انسان نہ جانے یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ جب مال
جسمانی لذت کا ذریعہ ہے اور علم روحانی لذت کا تو جو نسبت بدن کو روح سے ہے وہی
نسبت بدن کی لذت کو روح کی لذت سے ہے۔ اور جو نسبت بدن کی لذت کو روح کی
لذت سے ہے وہی نسبت بدن کی لذت کے ذریعہ کو روح کی لذت کے ذریعہ سے
ہے۔ بدن کی لذت کا ذریعہ مال ہے اور روح کی لذت کا ذریعہ علم ہے تو جو نسبت بدن

کو روح سے ہے وہی نسبت مال کو علم سے ہے اور بدن بغیر روح کے جلانے اور دفن کرنے کے قابل ہے۔ اسی طرح مال بغیر علم کے جلانے اور دفن کرنے کے قابل ہے اچھی چیز نہیں ہے سانپ ہے اسی لئے سانپ کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اب بات واضح ہو گئی کہ مال کی محبت میں جہاد سے نہیں رکنا چاہیئے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے بلکہ فوراً شریک ہونا چاہیئے۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (بقرہ ۲۱۶) تم چھوٹے ہو یا بڑے۔ کمزور ہو یا طاقتور غریب ہو یا مالدار۔ جہاد سب پر فرض ہے۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (توبہ-۴۱) ہلکے ہو یا بھاری ہر صورت میں جہاد واجب ہے جہاد۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (توبہ-۴۱) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنی جان سے اور اپنے مال سے۔ اگر تمہیں شعور ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہر شخص پر جہاد واجب ہے جہاد کے جتنے اجزاء ہیں ذرائع ہیں جتنے اقدام ہیں سب کو ہر شخص پورا کرے۔ میں اور بیان کرتا مگر اندھیرے سے پہلے پہنچنا ہے اس لئے آج کا سبق یہی ہے۔

ہدیہ بہ بارگاہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ (مسلم شریف)

تفسیر ایوبی

جلد سوم

سورۂ بقرہ کے چند رکوعات کی جامع تفسیر

از

حضرت امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب

دہلوی قدس اللہ سرہٗ

مکتبہ رازی ۱۵۔ شہاب مینشن
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی ۱
(آئیڈیل پیکیجز کراچی لمیٹڈ)